

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا نامہ

خواتین کی دنیا

اکتوبر 2013

لیڈنگ



www.pakstudies.com



226 نگہت سیما زمکین کے آنسو
104 میری آنکھوں کے خواب نغمہ ساز



182 آمنہ ریاض مہمان عام
72 آسیہ راتی کس کے گھر پر
166 ام ایمان مہر



156 سمیرا حمید اوسر
58 ربیعہ علی سید احمد رضا کی گرگیا
68 قاتلہ ربیعہ چھوٹی سی خواہش
94 نازیہ جمال عیدنا کہتے



257 غوث مقررادی غزل
257 غنبرین حبیب غنبر نظم

14 مسر

15 ادار

264 نادرہ خاتون



20 انشائیہ



263 امت الصبور میری ڈائری سے



270 شاہین رشید ناول شہنی



30 امت الصبور عید کے رنگ

21 شاہین رشید شاہ زیب خان زارہ



200 عنیزہ سید کوہ گراں تھے ہم

36 عفت سحر طاہر بن مانگی دعا

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی جیٹل یا ڈراما ڈرامائی تفصیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اکتوبر 2013
جلد 41 شمارہ 6
قیمت 50 روپے



285 صبا سحر مومحم کے کیوان



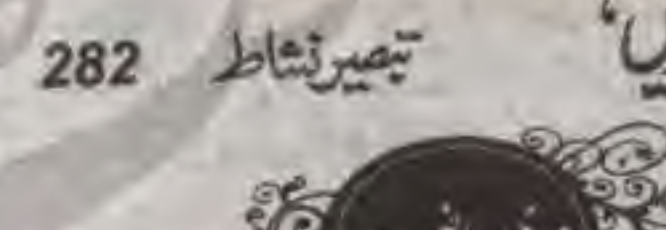
288 نفسیاتی اردو ویاچی الجھنیں عدستان



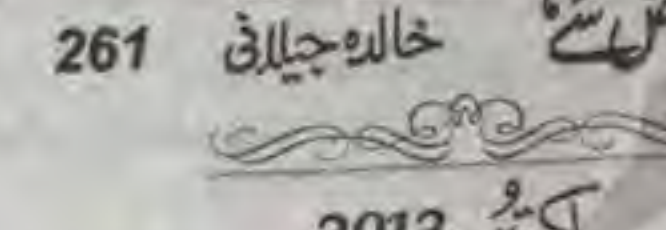
290 بیوی بکس کے مشورے امت الصبور



258 شگفتہ جہا رنگارنگ سلسلہ



282 تصویر نشاط خبریں ویریں



261 خالدہ جیلانی آپ کی بیاض سے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمار عیدِ غریبہ مہینے میں ہے۔
یہ شمارہ ملے گا تو آپ عیدِ الاضحیٰ کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔
قارئین کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے عیدِ مبارک۔

فطرت سے ہم آہنگی ہی زندگی کو خوبصورت اور دنیا کو رہنے کے قابل بناتی ہے۔ ہمارے مذہب کا ہر دکن، ہر
محکم فطرت کے مین مطابق ہے۔ اسلام انسان کو اس اور کمال تک پہنچانے کے لیے آیا ہے جو اس کی تخلیق کا مقصد
ہے۔ قربانی کا طوق اور عیدِ الاضحیٰ کے تہوار پر خود کریں تو ان کا اندازہ ہوگا کہ اگر اس کے پیچھے کتنا عظیم اور گہرا فلسفہ پوشیدہ ہے۔
اپنے نفس، اپنے دل کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنی عزیز ترین شے کی قربانی۔
اس اعلیٰ اور درجہ جذبہ کی روح کو عیسوی کہیے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق قربانی کا جذبہ بیدار کیجیے۔ تب ہی
اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل ہو سکتا ہے۔

جنگِ عراق اور افغانستان میں لڑی گئی لیکن ایک عرصے سے ہمارا ملک مسلمان جنگ بنا ہوا ہے۔ عالمی
دہشت گردی کے ہاتھوں نہ جانے کتنے گھر آجڑے اور کتنے بے گناہ لوگ زندگی کی بازی ہار گئے۔ پشاور کا واقعہ بھی
تازہ ہی تھا کہ زلزلہ وطن عزیز کے ایک حصہ میں تھا ہی اور بربادی کے نشان چھوڑ گیا۔
ابستلا اور مصیبت کی اس گھڑی میں ان پریشان اور بے سہارا لوگوں کا ساتھ دینا عین عبادت اور فرض ہے۔
یہ ہمارے اپنے ہیں عید کی خوشیوں میں انہیں یاد رکھیے گا۔

دنیا ناول - بن صافنگی دے

اس ماہ سے بہن محنت سحر طائر کا ناول بن مانگی دے شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ نام ہماری کوئی بھی قاری بہن
نہ بوجھ سکی۔

محنت سحر طائر کے مکمل ناول، ناولٹ اور افسانے آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان کی مزاحیہ سیریز قارئین کا پسندیدہ
سلسلہ ہے۔ ہمیں امید ہے ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔ اس ناول میں آپ
کو دلچسپ کہانی کے ساتھ ساتھ زندگی سے قریب اور منفرد کردار بھی نظر آئیں گے۔ ہنسی قسط پڑھ کر آپ اپنے غم کو
دبیجے گا۔

محمود بابر فیصل کی برسی

خوش طبع، خوش المذاق اور خوش شکل محمود بابر فیصل کو دنیائے رحمت ہونے میں سال گزر گئے۔ ایک
طویل مدت لیکن وہ آج بھی دلوں میں رہتے ہیں۔ ان کی سحر انگیز شخصیت، خوبصورت یادیں، ذہن میں تازہ ہیں۔
25 اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر دے ملے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

عید کے رنگ - آپ کی پسندیدہ مصنفین سے سروے،
ذہن کے آنسو - نگہت سیمہ کا مکمل ناول،
سیمہ احمد، ریماعلیٰ سید، فائزہ دابچہ اور نازیہ جمال کے افسانے،
عزیز سید اور محنت سحر طائر کے ناول،
کرن کرن روشنی - اجادیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی اور طبی انجینس اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔
عیدِ غریبہ کے بدلے میں آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چٹکبوتے
اور سینگوں والے مینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور
(ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گردن پر قدم
مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے
دیکھا۔“

نوآمدو مسائل :

- 1- عیدِ الاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم
از کم ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی
قربانی کرنا ضروری ہے۔
- 2- ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ
افضل ہے۔
- 3- گھر کے فرد کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا
چاہیے، تاہم کوئی دوسرا شخص بھی ذبح کر سکتا ہے۔
- 4- قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا
چاہیے۔

- 5- قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت درج ذیل
حدیث میں مذکور دعا پڑھنا مستنون ہے۔
- 6- ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا
مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی
کوشش نہ کرے۔

امت سے محبت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے
بڑے، موٹے تازے، سینگوں والے چٹکبوتے اور
حصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف
سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف
سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ
وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا
ہو۔ اور دوسرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے
اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح
کرتے۔

نوآمدو مسائل :

- 1- قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہئیں۔
- 2- جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا
چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔
- 3- حصی جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب
شمار نہیں کیا جاتا۔
- 4- گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی
قربانی کافی ہے۔
- 5- کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ
قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عید گاہ کے
قریب بھی نہ آئے۔“

نوآمدو مسائل :

- 1- اس حدیث سے بظاہر قربانی کا واجب ثابت ہوتا
ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و
استثنائ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے محدثین نے ان

سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے فرض نہیں۔ تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2- قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3- قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے ماکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

قربانی واجب ہے

حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے "انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا قربانی واجب ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قربانی دیتے رہے اور یہی طریقہ جاری ہے۔"

حضرت جبیلہ بن سحیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے "انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا اور انہوں نے یہی جواب دیا۔"

قربانی کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور نیکی کے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ قربانی (کے جانور) کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کر لیتا ہے اس لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔"

ہریال کے بدلے نیکی

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قربانیاں کیا ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "اس میں ہمارے لیے کیا (ثواب) ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہریال کے بدلے نیکی ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اور اون؟"

فرمایا "اون کے بھی ہریال کے بدلے نیکی ہے۔"

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگوں والے نرمینڈھے کی قربانی دی۔ وہ سیاہی میں کھاتا سیاہی میں چلتا اور سیاہی میں دیکھتا تھا۔"

فوائد و مسائل :

1- قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا چاہیے۔

2- "نر" (خیل) سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔

3- نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں ناجائز ہے۔

4- سیاہی میں کھانے، چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا اس کے پاؤں بھی کالے تھے اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد کی جگہ بھی سیاہ تھی۔ اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے۔

نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

بہترین قربانی

حضرت ابوالامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بہترین کفن وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور بہترین قربانی سینگوں والا مینڈھا ہے۔"

اونٹ اور گائے (کی قربانی) کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے فرمایا۔ "ہم لوگ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ عید الاضحیٰ آگئی۔ چنانچہ ہم نے دس دس آدمیوں کی طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر فسخ کی۔"

دو دانت کا جانور

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو دانت کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) کفن نہ کرو، سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دو دانت کا جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو۔"

فوائد و مسائل :

1- علامہ البانی رحمۃ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے بکری کا جذعہ نہیں۔

2- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ گوشت کی بکری ہے۔ (قربانی کی نہیں۔)"

انہوں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی دے دوں؟)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قربان کرو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔"

علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے اور یہ جواز اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کہ دو دانت (مسند) دستیاب نہ ہو بلکہ مطلق جائز ہے۔ واللہ اعلم

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان چرا ہوا ہو یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "انہوں نے فرمایا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔"

فوائد و مسائل :

1- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔

2- آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو اس کی قربانی درست نہیں۔

3- قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھانا ایک اضافی فائدہ ہے اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

عیب والے جانور کی قربانی جائز نہیں

حضرت عبید بن فیروز رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا: ”مجھے بتائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے کس جانور کو ناپسند کیا ہے یا اس سے منع فرمایا ہے؟“

انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا۔ اور میرا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے کوتاہ ہے۔ (اور فرمایا)

”قربانی میں چار جانور جائز نہیں وہ کانٹا جانور جس کا کان بن واضح ہو، بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو، لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو اور دھلا جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔“

عبید بن فیروز نے کہا ”میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس کے کان میں نقص ہو۔“ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جو چیز تمہیں پسند نہیں اسے چھوڑ دو لیکن اسے کسی پر حرام نہ کرو۔“

فوائد و مسائل :

- 1- معمولی عیب جو گہری نظر سے دیکھے بغیر محسوس نہ ہو قربانی میں رکاوٹ نہیں۔
- 2- محمد فواد عبدالباقی نے یوں اس کی تشریح کی ہے ”جس کی ٹانگ ٹوٹی ہو اور وہ چلنے سے عاجز ہو۔“ (حاشیہ سنن ابن ماجہ) لیکن یہ صورت لنگڑا ہونے میں شامل ہے۔ نواب وحید الزمان خان نے اس کا ترجمہ ”دلی“ کیا ہے۔ وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔
- 3- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی رائے میں کان کٹایا پھٹا ہوا ہونا ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کی قربانی دینے سے منع فرمایا جس کا سینک ٹوٹا ہو یا کان کٹا ہو اور

اگر قربانی کا جانور صحیح سلامت خریدنے کے بعد اس میں عیب پیدا ہو جائے تو؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم نے قربانی کے لیے ایک مینڈھا خریدا۔ بھیریا اس کے سرینوں (کولہوں) اور کان سے کچھ حصہ کاٹ کر لے گیا۔ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (مسئلہ) دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ اس کی قربانی کر دیں۔

گھروالوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرنا

حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تم لوگوں میں قربانیاں کس طرح ہوتی تھیں؟

انہوں نے فرمایا: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آدمی اپنی طرف سے اور اپنے گھروالوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کر دیا کرتا تھا۔ (اس میں سے) وہ خود بھی کھاتے اور دو سروں کو بھی کھلاتے۔ بعد میں لوگ فخر (کے طور پر زیادہ جانور ذبح) کرنے لگے تو وہ جال ہو گیا جو آپ (آج کل) دیکھ رہے ہیں۔“

فوائد و مسائل :

- 1- جن لوگوں کا کھانا پینا اور خرچ وغیرہ مشترک ہو وہ ایک گھر کے افراد ہیں۔ ان کی طرف سے ایک بکری کی قربانی دینا یا لگائے یا اونٹ کا ایک حصہ قربانی دینا کافی ہے۔
- 2- ایک سے زیادہ قربانیاں کرنا جائز ہیں لیکن تقاخر اور مقابلہ بازی کے انداز سے زیادہ جانور یا قیمتی جانور قربان کرنا قربانی کے اصل مقصد کو ختم کر دیتا ہے اس

صورت میں کوئی ثواب نہیں ہوتا۔
3- کسی بھی نیکی میں نیت کا صحیح ہونا اور دل کا خلوص لازمی شرط ہے۔

سنت طریقہ پر عمل

حضرت ابو سرحہ (حذیفہ بن اسید غفاری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”میرے گھروالوں نے مجھے غلط کام پر مجبور کر دیا جبکہ مجھے سنت طریقہ معلوم ہے۔ ایک گھروالے ایک بکری یا دو بکریاں ذبح کیا کرتے تھے۔ اب تو (اگر ہم ایک بکری کی قربانی دیں تو) ہمارے ہمسائے ہمیں بخیل کہتے ہیں۔“

جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اسے (ذوالحجہ کے پہلے) دس دنوں میں بال اور ناخن نہیں امانے چاہئیں۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب ذوالحجہ کا (پہلا) عشرہ شروع ہو جائے اور تم میں سے کوئی قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے بالوں یا اپنی جلد سے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔“

فوائد و مسائل :

- 1- ہاتھ نہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ بال نہ کاٹے اور جلد سے بال صاف نہ کرے۔ یہ پابندی ذوالحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے عید کے دن قربانی کرنے تک ہے۔
- ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص ذوالحجہ کا چاند دیکھ لے اور اس کا ارادہ قربانی کرنے کا ہو تو وہ اپنے بالوں اور ناخنوں (کو کاٹنے) کے قریب بھی نہ جائے۔“

نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کرنے کی تمنا نعت کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے قربانی کے دن نماز سے پہلے (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ وہ دوبارہ (قربانی) کرے۔
فوائد و مسائل :

1- نماز سے مراد عید کی نماز ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا عید الاضحیٰ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر (عید گاہ میں) تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز عید ادا فرمائی پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

”اس دن ہماری پہلی عبادت یہ ہے کہ پہلے نماز پڑھیں پھر (عید گاہ سے) واپس جا کر جانور ذبح کریں۔“ صحیح بخاری۔

2- عید کی نماز سے پہلے کی گئی قربانی کی حیثیت عام گوشت کی ہے۔ ایسے شخص کو قربانی کا ثواب نہیں ملے گا۔

3- ثواب کا دار و مدار عمل کے سنت کے مطابق ہونے پر ہے۔

4- کوئی شخص غلطی سے نماز سے پہلے قربانی کر لے تو وہ سراجانور میسر ہونے کی صورت میں اسے نماز عید کے بعد دو سراجانور قربان کرنا چاہیے۔

قربانی کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بولی لے کر منڈیا میں ڈالی گئی (اور بکائی گئی) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربہ پیا۔





ایکسپریس نیوز چینجر و فی اینٹر ویکلی

شاہ زیب خان زادہ سے ملاقات

شاہین رشید

شاہ زیب خان زادہ نے این ای ڈی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ مزید پڑھنے کے لیے ملک سے باہر جانا تھا۔ ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا۔ مگر شاہ زیب کی قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟ کیسے آگے بڑھے۔ آپ بھی پڑھیے۔

”کیسے ہیں شاہ زیب۔ آپ کا نام بڑا بھاری بھر کم ہے۔ یہ خان زادہ سے کیا مراد ہے؟“

”جی الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ خان زادہ میرا سر نیم ہے۔ ”راجپوت“ کاسٹ ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے طالب علم ڈگری تو کسی اور فیلڈ میں لیتے ہیں مگر روزی رونی کسی اور فیلڈ سے کھاتے ہیں۔ اس میں ان کی اپنی مرضی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ سب کچھ قسمت کا لکھا ہوتا ہے کہ وہ کس کو کہاں لے جائے۔ کہتے ہیں کہ صحافت میں آنے کے لیے صحافت پڑھنا بہت ضروری ہے۔ مگر اس فیلڈ میں کئی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے صحافت نہیں پڑھی، مگر ایک کامیاب صحافی اور اینکر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

کیت

انشائی

جلے تو جلاؤ گوری
ابھی نہ بجھاؤ گوری
ہیت میں بجوگ بھی ہے
ہیت براروگ بھی ہے
گیسوؤں کی ناگنوں سے
جو گنوں، براگنوں سے
عاشقوں کا حال پوچھو
ایک دو سوال پوچھو
رات کو اداس دیکھیں
تہیں نہ جو پاس دیکھیں
روپ رنگ مان دے دیں
کہو تہیں جان دے دیں؟
اور بھی ہزار ہوں گے
آپ پہ نثار ہوں گے
شعر میں نظیر ٹھہرے
کوی تے نفیس ٹھہرے

ہیت کا لاؤ گوری
ابھی سے بجھاؤ نا
کامنا کا سوگ بھی ہے
لگے تو لگاؤ نا
بیسر نوں ابھانوں سے
کھیلتی ہی جاؤ نا
کرو تو خیاں پوچھو
بات جو بڑھاؤ نا
چاند کو نراں دیکھیں
آؤ پاس آؤ نا
جی کا یہ مکان دے دیں
مانگ لو، لجاؤ نا
جو کہ دعویٰ ہوں گے
کبھی آزماؤ نا
جوگ میں کبیر ٹھہرے
اود جی لگاؤ نا





مانگتے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ انہوں نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے پیسے دے دیے جو کہ میں نے اشاک مارکیٹ میں شیئرز کے کاروبار میں لگائے جب نفع آیا تو مجھے اس کام میں مزہ آنے لگا پھر میں اشاک مارکیٹ اور اکاؤنٹی کے بارے میں پڑھنے لگا۔ اس دوران پڑھائی بھی جاری تھی۔ مجھے اصل میں انجینئرنگ کے فائنل کالاسٹ دانیوادرے کر ملک سے باہر ماسٹرز کرنے جانا تھا۔ ستمبر 2006ء میں میں انجینئرنگ سے فارغ ہوا تھا اور چھ ماہ بعد مجھے باہر تھا۔ تو میں نے اپنے والدین سے کہا کہ چونکہ ابھی چھ ماہ باقی ہیں باہر جانے میں تو میں اپنی پسند کی نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں ایک چینل کھلا تھا sun tv نام سے۔ یہاں میں نے اپنی سی دی بھیج دی تو مجھے کال آئی۔ چونکہ مجھے اشاک مارکیٹ کے بارے میں بھی خاصی معلومات تھیں اور میری اردو بھی کافی صاف تھی تو جب انٹرویو ہوا تو میں کامیاب ہو گیا۔ پھر جب میں نے کام شروع کیا تو مجھے مزہ آنے لگا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ میں اب ماسٹرز کرنے نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ یوں میڈیا کا سفر شروع ہو گیا۔ سن بزنس پھر بزنس پلس یہ آیا۔ پھر کچھ پویشیکل شو بزم کیے۔ انٹرویوز کیے۔ کوشش کرتا تھا کہ دن ٹو دن انٹرویوز کروں اور اچھے لوگوں کے انٹرویوز کروں۔ بزنس پلس یہ کام کر رہا تھا تو دن سے آفر آئی۔ وہاں آٹھ نو ماہ کام کیا۔ پھر ایکسپریس نیوز سے آفر آئی تو ایکسپریس نیوز جوائن کر لیا اور ابھی تک یہیں ہوں۔ بڑی خواہش تھی کہ ایک بڑے پلیٹ فارم پر آؤں اللہ کا شکر ہے کہ خواہش پوری ہوئی اب دو سال سے انجوائے کر رہا ہوں۔

”تھوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں“ آپ کارو گرام بہت شوق سے دیکھتے ہیں اور فوڈ بیک بھی آپ کو بہت اچھا ملتا ہو گا۔ تو یہ سب کچھ کیسا لگتا ہے؟

”بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ کبھی میں سفر میں ہوں یا کسی ریستورانٹ میں کھانا کھا رہا ہوں تو لوگ ملتے ہیں

اور بہت اچھا فوڈ بیک دے رہے ہوتے ہیں کہ آپ بچ بولتے ہیں ہمارے سامنے بچ لاتے ہیں اور کھری بات کرتے ہیں۔ یہ وہ جملے ہوتے ہیں جو آپ کا کانفیڈنس بڑھاتے ہیں۔ اگر کوئی آپ کو بہادر کہے کوئی یہ کہے کہ آپ غیر جانب دار انسان ہیں تو یوں مجھے کہ آپ کو آپ کی محنت کا صلہ مل جاتا ہے اور محنت کا صلہ یوں بھی ملتا ہے کہ آپ کو اس پروفیشن میں عزت، شہرت اور پیسہ بھی ملتا ہے اور اندر سے قوت ملتی ہے تو پھر مزید محنت کرنے کو دل چاہتا ہے۔

”ہمارے یہاں دو طرح کے سلیبرٹی ہوتے ہیں۔ ایک شو بزم کے اور ایک آپ جیسے۔ دونوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تو جب آپ سے لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں۔ صرف تعریف ہوتی ہے یا پراہلےز بھی بتاتے ہیں؟“

”تعریف تو کرتے ہی ہیں، لیکن میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی ہے کہ مجھے جتنے بھی لوگ ملتے ہیں ان میں شاید پانچ فیصد لوگ صرف اپنی بات کرتے ہیں۔ 95 فیصد لوگ صرف اور صرف ملک کی بات کرتے ہیں کہ بتائیے یہ ملک کیسے ٹھیک ہو گا۔ ہو

کیڈٹ کلج پٹارو کا ٹیسٹ دلو اتے تھے جب وہاں کامیاب ہو جانا تو کیڈٹ کلج حسن ابدال کا ٹیسٹ دلو اتے تھے اور کامیاب ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ اپنی میتھ امپروو کرو، اپنی انگریزی امپروو کرو، اردو کو ٹھیک کرو، ابھی تم میں بہت گنجائش ہے امپروو منٹ کی۔ تو مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ بے شک میں اچھا طالب علم ہوں، لیکن ابھی ایک دنیا میرے آگے ہے۔ جس کا مجھے مقابلہ کرنا ہے اور اس وجہ سے مجھے بہت زیادہ پڑھنے، آگے بڑھنے اور محنت کرنے کی عادت پیدا ہوئی۔ جب میں میٹرک اور پھر انٹر تک پہنچا تو مجھے اتنی زیادہ پڑھنے کی عادت ہو چکی تھی کہ انٹرویوز میں نے سیکنڈ پوزیشن لی اور اب تک یہ عادت برقرار ہے اور میں روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے پڑھتا ضرور ہوں اور شو بزم کے لیے ریسرچ بھی کرتا ہوں۔“

”بچپن میں بچوں کے کانوں میں اپنے والدین کی یہ آوازیں ضرور گونجتی رہتی ہیں کہ ڈاکٹر بننا ہے، انجینئر بننا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ آوازیں آپ کے کانوں میں بھی گونجیں؟“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میرے والد کہتے تھے کہ یا تو تم میری طرح ڈاکٹر بن جاؤ یا پھر انجینئر میری بڑی بہن ڈاکٹر بنیں تو والد چاہتے تھے کہ سب ہی ڈاکٹر بن جائیں۔ ویسے میری چار بہنیں ہیں اور وہ سب ڈاکٹر ہیں۔ ایک بھائی ہے جو مجھ سے چھوٹا ہے اس نے اپنی پڑھائی ابھی مکمل کی ہے۔“

”تو آپ یہ بھی چاہیں کہ صحافت میں کیسے آئے؟“

”میں اسے اپنی گڈ لک ہی کہوں گا اور اس فیلڈ میں اگر میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ یہ وہ کام ہے جو میں بہت شوق سے کرتا ہوں اور بہت انجوائے کرتا ہوں۔ میں جب انجینئرنگ کے فائنل ایر میں تھا تو میرا ایک بہت ہی اچھا دوست تھا اسد قائم خانی، وہ اشاک مارکیٹ میں انویسٹمنٹ کرنے لگا اور اس نے مجھے بھی کہا کہ انویسٹمنٹ کرو تو میں نے اپنے لبا سے پیسے

میرے دادا انڈیا سے مائیکریٹ کر کے آئے تھے تو وہاں کی کاسٹ ہے۔ خاندان راجپوت۔ ہاں میرے پاس یہ چوائس ضرور تھی کہ میں اپنے والد کا نام ”جبار“ لگاؤں ”شاہ زیب جبار“ لیکن مجھے خان زادہ بھاری بھر کم اور اچھا لگا تو میں نے اسے نام کے ساتھ لگا لیا اور مزے کی بات یہ کہ اب لوگ مجھے شاہ زیب نہیں بلکہ خان زادہ کہہ کر بلاتے ہیں۔ میرے دادا جب پاکستان آئے تو اندرون سندھ کا ایک علاقہ ہے نوشہرو فیروز اس کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہاں قیام پذیر ہوئے۔ غریب انسان تھے۔ بڑی محنت کی میرے والد کی تعلیم میرے والد صاحب چونکہ پڑھائی میں بہت اچھے تھے تو انہیں اسکا رشب مل گئی اور وہ ڈاکٹر بنے۔ پھر میری والدہ سے شادی ہوئی۔ والدہ نے بھی اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ ہم اسی گاؤں میں ملے بڑھے اور بڑی محنت کی۔ انٹر میڈیٹ تک وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ کراچی آنا میرا مشن ہوا کرتا تھا۔ انٹر میڈیٹ میں میری بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے این ای ڈی میں داخلہ مل گیا اور یہ بات ہے 2001ء کی تو چار سال بغیر فیملی کے میں کراچی میں باسٹل میں رہا اور انجینئرنگ کر کے میڈیا میں آگیا بائے لک۔“

”فیملی سے دور رہے۔ انجینئر بنے تو پھر میڈیا میں کیسے آگئے؟ اس سفر کی کہانی میں کیا کیا موڑ آئے؟“

”اس سفر میں مجھے جدوجہد تو بہت کرنی پڑی۔ لیکن چونکہ والدین کی دعائیں بھی ساتھ تھیں تو کام آسان ہوتے گئے۔ میری شخصیت کو بنانے میں میرے والد ڈاکٹر عبد الجبار خان زادہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ بچپن میں میں کچھ زیادہ ہی براعت و طالب علم تھا۔ چونکہ پوری کلاس میں اچھا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا ہوں اس لیے میرے والد صاحب کو شش کرتے تھے کہ مجھ سے کسی ایسی جگہ کا انٹری ٹیسٹ دلو امیں جو بہت ہی مشکل ہو، تاکہ مجھے پتا چلے کہ میں کلاس میں تو اچھا ہوں ہی اصل میں بھی اچھا ہوں یا نہیں تو کبھی

بھی سکے گایا نہیں۔ کراچی کے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ وہ اپنے ذاتی حالات کو بھی ملک کے حالات کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ان کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

”لوگ مایوس ہیں یا پر امید؟ آپ تو بہت قریب سے سب کو دیکھتے ہیں۔ آپ کیا کہیں گے؟ یہ سیاست دان مخلص ہیں اپنے ملک کے ساتھ؟“

”مایوسی کے ساتھ ساتھ امید بھی رکھتے ہیں۔ نئے الیکشن ہوتے ہیں۔ نئی حکومت آتی ہے۔ نئی امیدیں پھر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مایوسی اور امیدوں کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے۔ لیکن میں خود پر امید ہوں اور کون مخلص ہے اور کون نہیں اس کو جج کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن لوگوں کے کام سے یہ باتیں نظر آتی ہیں کہ کون مخلص ہے کون نہیں۔ اگر ہم سابقہ حکومت کے کام کو دیکھیں تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ان میں ملک کے لیے جتنا خلوص ہونا چاہیے تھا وہ نہیں تھا اور موجودہ حکومت پر بھروسہ کر کے لوگوں نے ووٹ دیا ہے تو ان کو بھی آزمائیں اور over all لیڈر ہم نے ہی چنا ہے اس ملک کے نوجوانوں میں سیاست کا جتنا شعور پیدا ہو چکا ہے اس کو دیکھ کر تو میں بہت پر امید ہوں۔“

”لنکو بن کر لیڈروں کو اور ان کے ساتھیوں کو فیس کرنا آسان ہوتا ہے؟“

”لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو ڈر نہیں لگتا تو میں ان کو ایک بات کہتا ہوں کہ انسان کو کسی بھی ڈر سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ اگر ڈر آپ سے زیادہ مضبوط ہو تو آپ کی زندگی ڈر کے تحت گزرے گی۔ لیکن اگر آپ ڈر سے زیادہ اسٹرونک ہوں گے تو آپ کی زندگی کسی ہی گزرے گی جیسی آپ گزارنا چاہتے ہیں۔ تو میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ساری چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور الحمد للہ میں ڈر کے اوپر حاوی رہتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ اللہ نے انشا کرم کیا ہے تو اسی کیے کیا ہے کہ میں اس خوف سے اور اس ڈر سے زیادہ مضبوط ہوں جو لوگ مجھ پر حاوی کرنا چاہتے ہیں۔“

”آپ نے تو پرویز مشرف والی بات کر دی کہ ڈر تا نہیں ہوں میں کسی سے۔؟“

”میں ایسا نہیں کہوں گا۔ کیونکہ میں ڈر تا ہوں۔ اپنے اللہ سے۔ میں ڈر تا ہوں اپنے والدین کی ناراضی سے۔ میں اس بات سے بہت ڈر تا ہوں کہ میرے پروگرام میں خامیاں ہوں اور لوگ مجھے پسند کرنا چھوڑ دیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب اللہ آپ کو کسی چیز سے نوازنا چاہتا ہے تو آپ کو عقل دے دیتا ہے اور عقل کے ذریعے آپ وہ چیز حاصل کر لیتے ہیں۔ اور جب اللہ آپ سے کسی چیز کو لینا چاہتا ہے تو اللہ آپ سے عقل لے لیتا ہے۔ تو میں ڈر تا ہوں اس وقت سے کہ اللہ مجھ سے عقل نہ لے لے۔“

”بہت سخت سوالات ہوتے ہیں آپ کے اور سامنے والا جھنجھلا بھی رہا ہوتا ہے۔ مگر آپ پروا کیے بغیر بڑے مزے سے سوال کر رہے ہوتے ہیں تو یہ سب ٹیم ورک ہوتا ہے یا آپ کی اپنی کاوش ہوتی ہے؟“

”ٹیم ورک تو ہوتا ہی ہے میرے پاس بڑی اچھی ٹیم ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ روزانہ آٹھ دس گھنٹے میں پڑھتا ہوں، ریسرچ کرتا ہوں۔ کیونکہ جب تک خود دلچسپی لے کر کام نہیں کریں گے کام اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی میری ٹیم میں پروڈیوسر کامل میرا ایسوسی ایٹ پروڈیوسر عدنان حسین اور شاعر داؤد کو آرڈینیشنر بہت اچھے ہیں۔ بہت محنت کرتے ہیں اور میں بڑی ایمان داری سے جتا رہا ہوں کہ سوالات میں 20 سے 25 فیصد سوالات وہ ہوتے ہیں جو آپ سوچ کر جاتے ہیں اور باقی ستر سے پچھتر فیصد سوالات وہ ہوتے ہیں جو ان کے جوابات کو سن کر ہم کرتے ہیں اور اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے کتنی ریسرچ کی ہے۔ کتنی پڑھائی کی ہے۔ اس وقت ساری چیزیں آپ کے کام آرہی ہوتی ہیں۔“

”مہمانوں کو سوالات پہلے سے بتا دیتے ہیں؟ یا پھر اسی وقت کرتے ہیں؟“

”میں ٹاپک ضرور بتا دیتا ہوں۔ مگر سوالات نہیں بتاتا اور جو سیاست دان سوالات مانگتے ہیں، اور میں

نہیں دیتا تو وہ پھر انٹرویو بھی نہیں دیتے۔ تو آپ خود اندازہ لگالیں کہ وہ کون سے سیاست دان ہیں جن کا چار سال میں میں نے ایک بار بھی انٹرویو نہیں کیا تو جو آپ کو میرے پروگرام میں کبھی نظر نہ آئے، سمجھیے کہ وہ مجھ سے سوالات مانگتے ہیں۔“

”یہ سوال میں نے کاشف عباسی سے بھی کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی بہت کھرے انسان ہیں اب آپ سے بھی کہہ رہی ہوں کہ آپ کے بارے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ سب کے پروگرام میں جائیں گے مگر شاہ زیب کے پروگرام میں نہیں جائیں گے کیونکہ بہت ٹیر خا آدمی ہے اور سخت سوالات کرتا ہے۔“

”بہت سارے لوگ ہیں ایسے مجھے یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگتی کہ لوگ اس وجہ سے نہ آئیں کہ میں سخت سوالات کرتا ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے آپ سب کے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو عوام کے سامنے لانا چاہتے ہیں تو میں بڑا مایوس ہوتا ہوں ایسے لوگوں سے جو ایک آدھ بار آکر پھر نہیں آتے کہ یار ہم تمہیں فیس نہیں کراتے۔“

”آن دی کیمرو آپ بال کی کھال بھی نکالتے ہیں۔ سامنے والے کو کنفیوز بھی کرتے ہیں۔ غصہ بھی دلاتے ہیں۔ لیکن آف دی کیمرو آپ نے کبھی سوری کی کہ یار میں بہت تلخ ہو گیا تھا؟“

”نہیں جی۔ سوری نام کی کوئی چیز نہیں ہے میرے پاس۔ جب کوئی میرے شو میں آتا ہے تو اپنی چوائس سے آتا ہے۔ کیونکہ انہیں میرا اسٹائل اور میرے سوالوں کے بارے میں پتا ہوتا ہے کہ میں کس قسم کا اینکو ہوں۔ سب سے میرے تعلقات اچھے ہیں اور وہ اس لیے اچھے ہیں کہ ایک صحافی کے ایک اور سیاست دان کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ اس لیے نہیں ہیں کہ میں اپنے کام پر کھپڑ و مانز کر جاؤں۔ تعلقات بنے ہی اس لیے ہیں کہ میں کام اچھا کرتا ہوں اگر کام پر کھپڑ و مانز کروں گا تو پھر تعلقات بھی اچھے نہیں رہیں گے۔ میرے خیال میں یہ ایسا پروفیشن ہے جس میں اگر آپ کسی سے دوستی نبھا رہے ہوں گے تو

اپنے آپ سے دشمنی کر رہے ہوں گے۔ اسی لیے میں دوستیاں نبھانے پر یقین نہیں رکھتا۔ ہاں یہ بات میں ضرور مانتا ہوں کہ جو لوگ میرے شو میں آتے ہیں وہ ٹائم نکال کر آتے ہیں اور اپنا موقف دینے آتے ہیں تو وہ میرے مہمان ہوتے ہیں اور میں انہیں پورا احترام دیتا ہوں۔“

”یہ جو ہماری سیاسی پارٹیاں ہیں۔ کیا ان میں دہشت گرد ہیں؟ یا سب اچھے ہیں اور یوں ہی بدنام ہیں؟“

”یہ چیز میں نے نہیں جج کرنی۔ اچھے برے لوگ ہر پارٹی میں ہوتے ہیں۔ اب کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں یہ جاننا نہ آپ کا کام ہے نہ میرا یہ ایجنڈا کا کام ہے اور عدلیہ کا کام ہے۔ میرا کام یا صحافی کا کام رپورٹ کرنا ہوتا ہے۔ فیصلے صادر کرنا نہیں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں جس کا بھی انٹرویو کروں اس انداز میں کروں کہ عوام کے سامنے سچ آجائے۔ میں کسی کو دہشت گرد نہیں کہہ سکتا۔ ریاست جس کو دہشت گرد کہہ دے گی میں بھی کہہ دوں گا۔ کیونکہ میں ریاست کے قوانین کا اور آئین کے قوانین کا پابند ہوں۔“

”کیا کبھی کراچی کے حالات اچھے ہوں گے؟ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو سڑکوں پر آنا چاہیے۔ کیا واقعی آنا چاہیے؟“

”میں بہت پوزیٹو ہوں۔ ان شاء اللہ کچھ ہی عرصے میں حالات بہت اچھے ہو جائیں گے۔ جب 2013ء ختم ہو رہا ہوگا اور 2014ء شروع ہو رہا ہوگا آپ بہت اچھا کراچی دیکھیں گی اور لوگوں کو سڑکوں پر نہیں بلکہ ”بولنگ بوتھ“ پہ آنا چاہیے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ لوگ آئے بھی ہیں۔ کراچی کے حالات کو بہتر کرنا یہاں کی سب جماعتوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ اگر فیصلہ کر لیں تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”تجزیے، تبصروں کے لیے آپ کو سولے جیو کے تقریباً سب بڑے چینلز پر دیکھا تو کیا ان سے لڑائی

ہے آپ کی؟

”نہیں بالکل نہیں۔ وہ بلائیں گے تو میں ضرور جاؤں گا اور کاشف بھائی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اسلام آباد میں تین دوست بہت اچھے ہیں۔ ان میں کاشف عباسی صاحب، فریحہ اور بس اور سلیم صافی صاحب۔ میں اگر کسی کو بہترین اینکوار مانتا ہوں تو وہ کاشف عباسی ہیں۔ مگر اب آپ مجھے کاشف صاحب کے شو میں بہت کم دیکھیں گی۔ کیونکہ میرا شو پہلے ہفتے میں تین دن ہوتا تھا مگر اب چار دن ہوا کرے گا۔“

”آپ کے خیال میں اس وقت سب سے بولڈ چینل کون سا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ چینل کوئی بولڈ نہیں ہے۔ بلکہ کام کرنے والے لوگ آپ کو بولڈ مل جائیں گے اور یہ اینکوار پر منحصر ہے کہ وہ کتنا بولڈ ہو سکتا ہے۔ مگر چینل کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔“

”جب سے آپ اس فیلڈ میں ہیں تب سے لے کر اب تک آپ اپنے کس پروگرام کو اچھا یا بہترین کہیں گے اور مایوس کن کون سا تھا؟“

”مگر آپ میرے اطمینان کی بات پوچھیں کہ جس کو سوچ کر مجھے لگتا ہے کہ میں نے کچھ اچھا کام کیا ہے تو وہ ”شاہ زیب مرڈر“ کیس ہے۔ (یہ انٹرویو ڈیل ہونے سے پہلے لیا گیا تھا) اس کے لیے جو میں نے کام کیا پوری انوسٹی گیشن کی۔ چیف جسٹس صاحب نے بھی سراہا اور میرے پروگرام اور میری انوسٹی گیشن کی وجہ سے اس کیس کو آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ تو مجھے اندر سے اطمینان حاصل ہوا کہ میں نے کچھ اچھا کام کیا۔ اس کے علاوہ جس شو نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی وہ ذوالفقار مرزا کا شو تھا۔ ان دنوں پروگراموں نے مجھے اطمینان دیا ہے اور انتہائی مایوس کن پروگرام تو اللہ کا شکر ہے کوئی نہیں ہوا۔ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ پروگرام سے جو توقع ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی۔ میرے دن ٹوون انٹرویوز جو ہوتے ہیں ان کے لیے میں دو دو ماہ یا تین تین ماہ تیاری کرتا ہوں اور وہ انٹرویوز بہت اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہاں گزشتہ نو مہینوں میں نے

”منور حسن“ کے ساتھ ایک انٹرویو کیا تھا اور بڑی تیاری کے ساتھ کیا تھا۔ مگر پندرہ سولہ منٹ کے بعد انہوں نے انٹرویو دینے سے انکار کر دیا اور مائیک پھینک دیا کہ میں انٹرویو نہیں دے رہا۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ میں بہت تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ انہیں میرے سوالات بہت سخت لگے اور انہوں نے انکار کر دیا۔“

”آپ ہوں یا دوسرے اینکوارز دھمکیاں ملتی رہتی ہیں تو آپ کی سیکورٹی کا کون خیال رکھتا ہے؟ حکومت یا آپ کا ادارہ یا کوئی بھی نہیں؟“

”میں اللہ کا بڑا شکر گزار ہوں کہ ان اینکوارز میں سے ہوں جو بہترین سیلری لیتے ہیں۔ تو میرا نہیں خیال کہ ہمیں حکومت کی یا کسی کی طرف سے سیکورٹی کی ضرورت ہے۔ اگر گارڈ رکھتے ہیں تو خود رکھتے ہیں اور گزشتہ دنوں کراچی کے حالات و واقعات کے پیش نظر مجھے آئی جی سندھ نے کال کی، شرجیل میمن نے بھی کال کی اور کہا کہ آپ کو پوری سیکورٹی دی جائے گی“

جب آپ کراچی آئیں گے، لیکن میں نے سیکورٹی اس لیے نہیں لی کہ خود میں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کراچی میں شہریوں کی حفاظت کے لیے کوئی سیکورٹی نہیں ہے اور پولیس کی آدمی نفری دی آئی ہڈی کی حفاظت کے لیے لگائی ہوئی ہے۔ یہ سوال اٹھانے کے بعد اگر میں سیکورٹی لیتا ہوں تو خود اپنے سوال کی نفی کرتا ہوں۔ تو جب ہم کسی کی فیور لیتے ہیں تو پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ بات کر سکتے ہیں نہ سوال کر سکتے ہیں۔“

”شاہ زیب صاحب! کچھ شخصیات کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ مثلاً ”نواز شریف“؟“

”میاں صاحب کو موقع ملا ہے اور میاں صاحب کو زندگی میں جتنے بھی مواقع ملے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میں ان سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوں۔ ان کے انداز حکمرانی نے مجھے متاثر نہیں کیا اور اب ان کی پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے یہی کہوں گا کہ انہیں چھ مہینے اور دینے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوڈ شیڈنگ کے

مسئلے کو حل کر دیں گے البتہ دہشت گردی کے مسئلہ پر انہیں جو کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کیا ہے اس معاملے میں ان کی پرفارمنس مایوس کن ہے۔ ہائے نیچر میں ان کو جانتا نہیں، کیونکہ انہوں نے مجھے بھی انٹرویو دیا نہیں۔“

”عمران خان کو کیا پایا؟“

”خان صاحب کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ایمان دار آدمی ہیں۔ وہ ملک کے ساتھ یا ملک کے لیے بہت سنجیدہ سوچ رکھتے ہیں۔ مگر خیر پختونخوا کی حکومت کو دیکھ کے مجھے لگتا ہے کہ ایمان داری اور سنجیدگی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ مگر سمت کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔“ کے پی کے ”میں کام کی کوئی سمت نظر نہیں آ رہی۔“

”آصف علی زرداری کے بارے میں کیا کہیں گے؟“

”آصف زرداری صاحب نے پانچ سال پورے کیے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ پی پی پی کو جس طرح سے سنبھال کر رکھنا چاہیے تھا وہ نہیں سنبھال سکے۔ اپنی ذات کے گرد انہوں نے پارٹی کو زیادہ گھمایا ہے۔ اگر سو محمد التوں کے خط کا معاملہ تھا تو ان کی ذات کے گرد تھا۔ پرائم مشرف فارغ ہوا تو ان کی ذات کی وجہ سے تو انہوں نے اپنی ذات کے اندر پارٹی کو بہت محدود کر دیا ہے۔ پہلے بھٹو خاندان میں پارٹی محدود تھی۔ لیکن زرداری صاحب نے پارٹی کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔“

”آصف علی زرداری اور پرویز مشرف کے لیے کہا جاتا ہے کہ بڑے شاطر اور چالاک سیاست دان ہیں جو

ان کے پاس بیٹھ جائے اسے یہ اپنا بتاتے ہیں۔ ایسا ہے کیا؟“

”دیکھیں جی لفظ شاطر اور چالاک کو ایک طرف رکھ کر کسی سیاست دان کے لیے یہ کہیں کہ یہ بڑا سیدھا اور معصوم ہے تو پھر تو وہ سیاست دان ہی نہ ہوا۔ شاطر ہونا، چالاک ہونا، تیز ہونا اور اچھی سیاست کرنا یہ تو سیاست میں تعریفی الفاظ ہیں۔ سیاست میں برائی یہ ہے کہ آپ کہیں کہ یار یہ تو بڑا شریف، سیدھا سادہ اور معصوم ہے۔“

”پرویز مشرف کے لیے کہا جاتا ہے کہ بڑی مہارت سے جھوٹ بولتے ہیں، کیا واقعی؟“

”پہلے میں پروگرام کرتا نہیں تھا۔ البتہ ان کے مستعفی ہونے کے بعد میں نے ان کے ساتھ پروگرام کیے اور میں نے انہیں ایسا کوئی جھوٹا نہیں پایا۔“

”یہ بتائیے کہ پورے ملک میں جو دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے، تو یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے یا کوئی تیسری قوت حالات خراب کر رہی ہے؟“

”جی بالکل تیسری قوت ہمیں خراب کر رہی ہے اور اس لیے کر رہی ہے کہ ہمارے اندرونی معاملات خراب ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں خرابی ہے تو پڑوسیوں میں بات کرنے اور مداخلت کرنے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور اگر آپ اپنے گھر کے معاملات بہتر کر لیں تو پڑوسیوں کا منہ بھی بند کر سکتے ہیں۔ مگر آپ میں معاملات کو بہتر کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے گھر کے معاملات کو اپنی سیاست، اپنی پالیسی کو اپنے اعمال کی وجہ سے اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ تیسری قوت کو اور دیگر ممالک کو اس سے فائدہ ملتا ہے۔ ہمیں خود کو بہتر کرنا ہے۔ کچھ

دعائے صحت

ہماری بہت پیاری مصنفہ رضیہ مہدی شکاری ہیں۔ اللہ سے دعا گو ہیں انہیں شفا کے کاملہ عطا فرمائے آمین۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ کی کامل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔



مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ تھرلر موزیز اور سائنٹفک فلمیں بھی بہت پسند ہیں۔ ڈرامے بالکل نہیں دیکھتا۔ مجھ سے دیکھے ہی نہیں جاتے احمد حسینز میں صرف اور صرف نیوز چینلز ہی دیکھتا ہوں جو چارپانچ ٹاپ کے چینلز ہیں۔

”میوزک اور کھیل؟“

”گائے بہت ہی شوق سے سنتا ہوں بہت زیادہ۔ انگریزی میوزک کا بھی بہت شوق ہے۔ انڈین اور پاکستانی گائے بھی بہت شوق سے سنتا ہوں۔ لٹا محمد رفیع اور کشور کا بہت براہین ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو گانا لٹا نے گا دیا اس کو دوبارہ کوئی بھی نہیں گا سکتا خواہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لے رفیع صاحب تک بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا۔“

”آپ بھی باتھ روم سنگر ہیں؟“

”باتھ روم سنگر نہیں میں تو باقاعدہ سنگر رہ چکا ہوں۔ یونیورسٹی کے زمانے میں ہمارا ہیڈ تھا اور میں لیڈ سنگر تھا ہم نے بڑے گائے گائے ہیں بس یونیورسٹی کے بعد سب چیزیں ختم ہو گئیں۔ میں تو یونیورسٹی کا بڑا سربراہ سنگر مشہور تھا۔ کھیل میں کرکٹ بہت شوق سے دیکھتا ہوں اور کالج لائف میں کرکٹ کھیلتا بھی تھا۔ ٹینس اور فٹ بال سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔“

”چلتے چلتے کوئی بات جو آپ اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہتے ہوں جو میں نہ پوچھ سکی ہوں؟“

”میرے خیال میں آپ نے سب کچھ ہی پوچھ لیا ہے، لیکن پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں اس بات کو ماننا ہوں کہ مجھ میں کچھ بھی نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کے لڑکے کو جو ایک پبلے اسکول میں پڑھا ہے جس نے سترہ سال گاؤں میں گزارے ہیں اور تخت کر کے گزارے ہیں اس کو جو عزت ملی ہے اس میں میرے نصیب سے زیادہ میرے ماں باپ کا ہاتھ ہے جنہوں نے بڑی محنت کر کے میری شخصیت کو بنایا ہے۔ میری والدہ نے میرے لیے بڑی دعا مانگی کیں اور

”کھانا گھر میں کھانا اچھا لگتا ہے یا باہر؟“

”مجھے سب سے مشکل کام گھر سے باہر کھانا کھانا لگتا ہے۔ مجھ سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً میں آپ کو بتاؤں کہ رمضان میں میں نے بہت سے لوگوں کو ناراض کیا ہے مشکل سے کوئی ایک افطاری ہوگی جو میں نے باہر کی ہوگی سحری اور افطاری مجھ سے باہر نہیں ہوتی۔ مجھ سے ہوٹلنگ نہیں ہوتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ پرائیویٹ رہوں اور گھر پر زیادہ ٹائم دوں گھر سے زیادہ باہر نہ نکلوں میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنا سارا کام گھر پر ہی کروں۔“

”گھر میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کون کرتا ہے۔ اور بہن بھائی میں کون آپ کے قریب ہے؟“

”گھر میں تو سب ہی میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں میری چھوٹی بہن مجھ سے بہت قریب ہے مگر والدین اور دیگر بہنیں اور بھائی ہم سب بہت کلوز ہیں ایک دوسرے سے۔ آپ کو بتاؤں کہ جو ہماری سالانہ چھٹیاں ہوتی ہیں تو ہم سب مل کر ساتھ ہی جاتے ہیں گھومنے پھرنے ان میں بہنیں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔ بہنوئی بھی ساتھ ہوتے ہیں تو ایک بڑی ہی اچھی اور پیاری فیملی ہے ہماری اور سب کا آپس میں ریلیشن بہت اچھا ہے۔“

”قمر جا“ کیسے رہے ابتدا سے لے کر اب تک؟“

”میں تو جی بڑا ہنس کھ انسان ہوں۔ حس مزاح کافی ہے مجھ میں۔ کوشش کرتا ہوں کہ لائٹ موڈ میں رہوں۔ مجھے غصہ دو مہینے میں شاید ایک ہی بار آتا ہے اور پھر بہت آتا ہے سر پر جڑھا ہوتا ہے۔“

”رد عمل کیا ہوتا ہے؟“

”کبھی دوستوں یا بہن بھائی پر آئے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ویسے کسی پہ آجائے تو بول کر اچھا خاصا غصہ نکال لیتا ہوں۔“

”فلمیں اور ڈرامے دیکھتے ہیں؟ اور کون سے چینلز زیادہ پسند ہیں آپ کو؟“

”فلمیں بہت دیکھتا ہوں۔ ہالی ووڈ کی ایکشن فلمیں

سیاسی قوتیں ایسی ضرور ہیں کہ جو ہم کو تباہ کرنا چاہتی ہیں۔ مگر ہمیں پہلے خود اپنے آپ کو بہتر کرنا ہے۔“

”اور اب تھوڑے سے نجی سوال۔ شادی ہوئی آپ کی؟“

”نہیں جی ابھی نہیں ہوئی اور ابھی کوئی ارادہ بھی نہیں ہے یعنی دو چار سال تو کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔“

”آپ دیکھنے میں بھی چھوٹے ہی لگتے ہیں۔ تو جب بھی کریں گے اپنی پسند سے کریں گے؟“

”جی میرا خیال ہے کہ اپنی پسند سے ہی کروں گا۔“

”آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟“

”میری صبح بڑی لیٹ ہوتی ہے اور میں آج کل اس پہ بڑی محنت کر رہا ہوں کہ میں جلدی اٹھ جایا کروں پہلے میں سوتا ہی صبح کے پانچ بجے تھا تو میری صبح دوپہر ایک بجے ہوتی تھی مگر اپنی قوت ارادی سے میں بارہ بجے اٹھنے لگا اور اب گیارہ بجے اٹھتا ہوں اب میری پوری کوشش ہوگی کہ میں رات کو دو بجے سو جایا کروں اور صبح ساڑھے آٹھ بجے تک اٹھ جایا کروں۔“

”دن کی روٹین کیا ہوتی ہے اور ناشتا کھانا وقت پر کھاتے ہیں یا جب مل گیا کھالیا؟“

”کھانا میں زیادہ نہیں کھانا کیونکہ موٹا ہونے سے گھبراتا ہوں اور جب غنیمت سے جانتا ہوں تو اخبار پڑھتا ہوں۔ چارپانچ گھنٹے بغیر کسی سے بات کیے میں اخبارات اور دیگر چیزوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ساتھ ساتھ ٹی وی بھی آن ہوتا ہے تو نیوز چینلز بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ ناشتا بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے سچ عموماً نہیں کرتا البتہ رات کو کھانا کھاتا ہوں مگر وہ بھی کم اس کے علاوہ ”جم“ جاتا ہوں سونے تک کرتا ہوں جو گنگ کرتا ہوں تاکہ اپنے آپ کو فٹ رکھ سکوں۔ رات کو ہم صحافی دوست کوشش کرتے ہیں کہ کہیں بیٹھ کر حالات و واقعات پر کچھ باتیں کر لیں۔ اسلام آباد میں یہ بڑا کلچر ہے کہ صحافی مل کر بیٹھتے ہیں۔ اچھی گید رنگ ہو جاتی ہے۔“

کائنات کے سارے خوب صورت رنگ زندگی کی ساری خوب صورتی خوش نمائی صنف نازک کی ہی مرہون منت ہے۔ ہر میدان میں اس کی غیر معمولی صلاحیتیں سامنے آرہی ہیں۔ تخلیق کے حوالہ سے تو قدرت نے ہی اسے ایک بلند درجہ پر فائز کیا ہے، لیکن ادب کے میدان میں بھی اس نے خود کو منوالیا ہے۔ ایک جرمن مصنف کا کہنا ہے۔

”مگر رہنا لکھنا پہلے کی طرح صرف مردوں کو سکھایا جانے لگے تو دنیا سے ادب کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔“ لیکن آج بھی صنف نازک کا سب سے معتبر حوالہ گھر اور کچن ہے۔ اسی کے دم سے دنیا کے کروڑوں گھر ایک خوب صورت زندگی سے جگمگاتے ہیں۔ کچن آباد ہو تو گھر کے افراد بہت شاد نظر آتے ہیں۔ خاتون خانہ پکانے کے ہنر سے آشنا ہو تو مہمان بھی کھینچے چلے آتے ہیں۔

ہماری مصنفین بہت ذہین باصلاحیت ہیں۔ نئے نئے موضوعات پر ناول، افسانے تخلیق کر رہی ہیں۔ یہ مصنفین کھانا پکانے اور گھرداری کے فن سے کتنی آشنا ہیں، یہ جاننے کے لیے ہم نے عید الاضحیٰ کے موقع پر اسی حوالہ سے سروے کیا ہے۔

سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1- عید الاضحیٰ کے موقع پر خواتین کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں جیسے گوشت صاف کرنا، سنبھالنا اور پکوان تیار کرنا۔ آپ کو ان میں سے کون سی ذمہ داری سونپی جاتی ہے اور آپ اس سے کس طرح عمدہ برآہوتی ہیں۔

2- عید الاضحیٰ پر آپ گوشت کی کون سی ڈش خاص طور پر تیار کرتی ہیں۔ جسے گھر کے سب لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی ترکیب۔؟

آئیے دیکھتے ہیں قارئین کے دلوں میں بسنے والی مصنفات بحیثیت خاتون خانہ اپنی ذمہ داری کس طرح سر انجام دیتی ہیں۔

عید کے رنگ

(امت الصبور)

سائرہ رضا۔۔۔ کراچی

ہائے۔۔۔ مار ڈالو۔۔۔ اللہ۔۔۔ آ آ آ۔

1- جناب سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ گوشت صاف بھی کرتی ہوں۔ اسے سنبھال کر بھی رکھتی ہوں اور پکوان تو تیار کرنے ہی ہوتے ہیں۔

گوشت کے ڈھیر کے پاس پھسکر مار کے بیٹھ جاتی ہوں۔ ہڈی، چھریاں، ٹوکا سب میرے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ گوشت کے پکٹ بناتی ہوں۔ مونے کالے مار کر

سے چھوٹی چھوٹی پرچوں پر لکھتی ہوں۔ نہاری، حلیم، برانی، فیے کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

ایک بڑے تھیلے میں بڑے بڑے ہڈے جمع کرتی ہوں کہ بعد میں پائے کے ساتھ ساری رات پکائے جائیں گے پھر ان تھیلوں کو فریژر میں اس حساب سے رکھتی ہوں کہ پہلے کن کی ضرورت پڑے گی اور سب سے آخر میں کن کی۔

ایسے بڑے گوشت کے پارچے جو چربی اور ہڈی کے ساتھ اس طرح مدغم ہوں کہ مجھ سے الگ نہ ہوں۔

انہیں نمک کے ساتھ لبال لبتی ہوں اپنے ہی پانی میں، چربی پکھل جاتی ہے تو اسے نکھار لیتی ہوں اور جم جانے پر پھینک دیتی ہوں۔ ہڈی الگ ہو کر بے کار۔ بکلی آج پر پکھنے کے باعث یہ گوشت بے حد لذیذ ہوتا ہے اور کھالیا جاتا ہے۔

اس گوشت کو اگر صبح سویرے اور رات گئے ہلکی آنچ پر ہر روز گرم کرتے رہیں تو یہ ہفتہ دس دن تک بالکل درست رہتا ہے۔ آپ اس میں سے نکال لیں اور استعمال کریں۔ میری رائے (میرے گھر والوں کی بھی) ہے کہ بہت سارے مسالوں (گرم مسالے، پیاز اور ک، لہسن) کے ساتھ خوب بخون بخون کر پکائے جانے والے گوشت کی نسبت نمک والا گوشت زیادہ لذیذ ہوتا ہے اور اگر آپ خوب کھانا چاہتے ہیں تو کھالیا بھی جاتا ہے۔

ایک ضروری بات جو میں کہنا چاہتی ہوں ہمیشہ سے کہ میں نے کبھی گوشت کو دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی نہ ہی اسمبل آنے کی شکایت کی یا کمرے ہی سے بھاگ گئی یا کراہت آمیز انداز میں پیچھے ہٹی۔ کیونکہ ایک تو یہ رزق کی توہین کے زمرے میں آئے گا۔ دوسرے قربانی سے لے کر گوشت کی تقسیم اور سنبھالنے سے لے کر کھانے تک ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور خوب صورت یادگار معاشرتی روایت بھی۔ آپ ثواب کی نیت رکھیے۔ بس۔ (سو اگر کوئی ناک بھوں چڑھاتا ہے تو اسے اپنی صفحہ کی فوری ضرورت ہے)

2- میں سب کچھ تیار کر لیتا چاہتی ہوں۔ مگر کوئی کھائے تو۔۔۔ بیٹیاں دانتوں میں گوشت پھنسنے کی شکایت کرتی ہیں۔

کلیجی میں سارا سال صرف عید ہی کے دن کھاتی ہوں۔ بازار سے کبھی نہیں خریدی۔ کلیجی صرف امی کے ہاتھ کی پسند ہے۔ میری امی بہت لذیذ کھانے بناتی ہیں اور بہت تیزی سے۔ (کھانا بنانے میں یہ پھرتی میرے اندر بھی ہے۔ کون گھنٹوں چولے کے آگے کھڑا ہو کر اپنے حسن کو کمن لگائے۔ جھٹ سیٹ۔)

عید کا دن چڑھتے ہی میں سوچتی ہوں، مجھے فوری طور پر آدھ کلو / تین پلو گوشت مل جائے (کلیجی کا قطعی انتظار نہیں ہوتا) تاکہ میں فوری طور پر شامی کباب چولے پر چڑھا دوں۔ مگر میں دال اور مسالے ڈال کر میں گوشت کی منظر ہوتی ہوں۔ کوئی تو دے دے۔ یا دے رہے دو تین بجے سے پہلے نہ اپنا گوشت آتا ہے نہ پڑوسی بھیجتے ہیں۔

جیسے ہی گوشت ملتا ہے تو میں اسے فوراً ”بھون کر روٹی ڈال لیتی ہوں کہ صبح سے بیٹھا کھا کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہو چکا ہے۔ اپنا گوشت آجائے تو تقسیم اور محفوظ کرنے کے عمل میں اتنی بری طرح جت جاتی ہوں کہ گوشت کے انتظار میں بھیگی دال پھول کر کپا ہو جاتی ہے۔

اب بھنا گوشت اور کلیجی کھا کر طبیعت سیر ہو چکی ہے۔

میں تکیے بنانے کے لیے چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنا رہی ہوں۔ چائے کا کپ پاس دھرا ہے۔ اور ک لہسن کا

پیسٹ نمک مرچ اور پسا گرم مسالا ہمراہ پسا کچا پیتا بوٹیوں کو لگا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دو تین گھنٹے بعد اسے گڑا ہی میں ڈال کر گھالوں گی۔ جب بوٹیاں گل جائیں گی اور پانی خشک ہو جائے گا تو کوئلے کو دھکا کر باہر کی خوشبو دوں گی۔ لہسن مرچ، پودنا اور نمک پیس کر وہی میں پھینٹ کر چٹنی تیار ہے۔ ساتھ کولڈ ڈرنک۔ مشتاق صاحب (شوہر) نے یہی گوشت کھانا ہے اب۔ (اگر امی کے گھر ہوں تب بھی یہی ترتیب ہے۔)

صاحبزادیاں اس دوران انداز پر اٹھا، چائے پراٹھا اور گوشت کے مسالے کے ساتھ پراٹھا کھا کر پیسٹ بھر چکی ہیں۔ ان کی بلا سے ماں جو کچھ مرضی کرتی رہے ہاں کباب کھاتی ہیں۔

سارا دن گزار کے مجھے رات بستر جاتے وقت اپنی قسمت کو روتی اس بھیگی دال کا خیال آتا ہے تو میں دکھتی کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھتی ہوں۔ گوشت شامل کر کے لکر جلا دیتی ہوں۔

اس دوران میں فریج سے کوئی نہ کوئی پھل لے کر کھاتی ہوں یا سلاڈ وغیرہ میرے گھر میں عید کے دن گوشت اور مسالوں کی خریداری سے زیادہ اہم ترین خریداری ہوتی ہے۔ سلاڈ کی۔ ٹماٹر، پیاز، کھیرا، بند گوشت، شملہ مرچ، چھتر وغیرہ ذرا سا بھی گوشت کھا کر مجھے تیزابیت ہونے لگتی ہے۔

دوسرے پھل جس کا بھی موسم ہو۔ اب اس بار سیب ہوں گے۔ آڑو بھی ہو سکتے ہیں اور وہ مل جائیں تو کیا ہی بات ہے کولا ڈرنک کے بجائے میں سکجین بنانا کرتی ہوں۔

دراصل میں معدے کے کچھ گھبر مسائل کا شکار ہوں اور گوشت کھانے سے میری زبان و انت ہونٹ اور منہ کا اندرونی حصہ بہت جلد پک جاتا ہے۔ سو میں گوشت کو تنہا کھا ہی نہیں سکتی (بچپن سے)۔

اب پھر آتے ہی کباب کی جانب۔ آدھے گھنٹے میں کباب کا آمیزہ گل جاتا ہے۔ چولہا بند اور میں غزالپ بستر کے اندر۔

اب عید کا دوسرا دن شروع ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ سے سحر خیز ہوں۔ سب سو رہے ہیں اور میں اٹھ کر ایک کپ چائے ہاتھ میں لے کر گھر گھولتی ہوں۔

کباب۔ آہ میرے پیارے کباب! دراصل پیاری بہنو! میں بے حد لذیذ۔ فلفلف۔ کباب بنانے میں ماہر ہوں اور یہ میں نہیں۔ لوگ بھی کہتے ہیں۔

اب میرے ہاتھوں میں ایک کوئٹی ہے اور لکڑی کا ایک بڑا ڈنڈا۔ ایک بار پھر میں زمین پر چوڑی مار کے پیٹھ گئی ہوں اور دے دنا دن کباب پیسے جارہے ہیں۔ آدھے سے پونے گھنٹے میں اس کام سے فراغت پا کر نکلیں بناتی ہوں اور ٹرے میں لگا کر انہیں فریزر کر دیتی ہوں۔

عید کے دوسرے دن ہم سب کا ناشتا کباب پر اٹھا چٹنی (دہی پودینے والی) اور چائے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سالوں کا دستور ہے۔

اب ان ہی کبابوں کی ترکیب لکھ رہی ہوں اور ہاں مہمانوں کو بھی وہی سرو کرتی ہوں اور جیسے ہی شک ہو کہ ختم ہونے والے ہیں۔ دوبارہ چڑھا دیتی ہوں۔

شامی کباب

اشیا :

گوشت سرخ چکنائی کے بغیر ڈیڑھ پاؤ (لوٹیاں)

مناسب

خنکے کی دال

ٹمک مرچ پیسی

ہابت گرم مسالا

لونگ

کالی مرچ

دار چینی

بڑی الائچی

زیرہ

ہابت و حنیا

گول سرخ مرچ

پیاز

لہسن

ہری مرچ

(گوشت پینے کے بعد باریک کاٹ کر ڈالیں)

(مقدار اس لیے کم رکھی کہ اگر آپ لوگ بتائیں تو زیادہ مشکل نہ ہو)

ترکیب :

نکھر (پتیلی) میں ماسوا ہری مرچ کے سب اکٹھا ڈال دیں اور پانی اتنا اوپر ہو جس میں دال اور گوشت چھپ جائے اور گل جائے (کم از کم تین اچ اوپر)

نکھر میں آدھا گھنٹہ اور پتیلی میں تقریباً گھنٹے میں سب گل جائے گا۔ پانی بالکل خشک ہو جائے (جلالت دیکھیں گا) تو اتار کر کوئٹی (سل بنا۔ مشین نہیں۔ ہرگز نہیں) میں پینا شروع کریں ساری محنت اور خوبی

میں ہے۔

دال گوشت ثابت مسالے آٹا کر دیں۔ اتنا پیسیں کہ لگے آپ نے سخت ترین میدہ گوندھ رکھا ہے۔ دال کا ذرہ اور گوشت کا باریک ریزہ بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے۔ اب ٹمک مرچ چکھ لیں گئی ہوئی مرچیں ملا کر دو ڈنڈے اور برسائیں پھر نکلیں بنائیں۔

فرانی پین گرم کریں۔ ٹکیوں کو اینڈے میں لپیٹ لپیٹ کر ہلکی آنچ پر تیل میں تھپتھپ جائیں۔ تیل بہت زیادہ نہیں ڈالیں۔

بے حد لذیذ کباب تیار ہیں کہ ام م۔ (یہ بقر عید میں کتنے دن ہیں ابھی۔ کباب جو بناتے ہیں)

تیسرے دن کچے قیمے کے کباب بنتے ہیں۔ یہ سب کے فیورٹ ہیں۔

ان کی ترکیب اگلی بار ان شاء اللہ۔

سمیر احمد

سوالات پڑھ کر کچھ بالوسی ہوئی۔ دونوں ہی سوالات پر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے لیکن۔ لیکن چونکہ مجھے سروے میں شرکت کرنا ہی ہے تو میں ضرور ہی کچھ نہ کچھ لکھوں گی بے شک وہ ہماری پڑوسن آنٹی کی عید کا احوال ہی کیوں نہ ہو۔

(1) گوشت کے حوالے سے میرے پاس تو کوئی خاص ذمہ داری نہیں ہے (بالکل نہیں) اگر دے ہی دی گئی تو یقین جانئے! آئندہ آنے والی باقی تمام عیدوں کے لیے چھین لی جائے گی۔ (خفیہ مہارت) عید کے دن سے متعلق اگر کوئی ہے تو وہ برتن دھونا ہے۔ کیونکہ برتن دھونا میرے نزدیک دنیا کا آسان ترین کام ہے (بج میں) تو یہ آسان ترین کام میں آسانی سے کرتی ہوں کئی کئی بار کرتی ہوں اور یقین جانئے! مکمل تیار ہو کر بھی کرتی ہوں۔

(2) ویسے میں بریانی اچھی بناتی ہوں لیکن عید کی یہ خاص ڈش نہیں ہے عید کے لیے (پہلے دن نہیں) بابرانی کیونکہ اسے ذرا اہتمام کیا جاتا ہے (انتظار بھی) اور

یہ میرے بھائی لوگ بناتے ہیں اپنے تمام تر (سال) بھر کے (فلسفوں اور مہارتوں کے ساتھ۔ ہم لوگ تو صرف انتظار کرتے ہیں۔ میرے بس کی ابھی فی الحال بات نہیں ہے بابرانی کیونکہ اور ویسے بھی جب مرد حضرات کر رہے ہوتے ہیں تو ہم انہیں ہی کرنے دیتے ہیں۔ پھر وہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہم ان کے "کاموں" میں دخل دیتے ہیں تو ہم ان کے "کاموں" میں دخل نہیں دیتے۔ اس لیے ترکیب کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں۔

جی جی۔ بس وہی وہی بالکل وہی ترکیب جو آپ سب اپنے اپنے گھروں میں بنا کر کھاتے ہیں اگر زیادہ مزے کے کھانے کھانے ہیں تو بس ایک ہی ترکیب کا استعمال کریں کہ اسے صرف اور صرف گھر کے مرد حضرات سے بنوائیں۔

مرچ مسالا تیز ہو گیا تو بھی مزہ آئے گا۔ کچھ کم زیادہ ہو گیا تو بھی۔

اس عید پر یہ ترکیب ضرور آزمائیے۔ کیسے۔ یہ آپ کو سوچنا ہے ہم نے تو پچھلے سال ہی سوچ کر اس پر عمل کروا لیا (ہاہا)

صدف آصف

سب سے پہلے تو میری جانب سے آپ کو سارے اشاف اور قارئین کو عید کی ہزاروں خوشیاں مبارک۔

(1) پہلی بات تو یہ ہے کہ جوائنٹ فیملی میں رہنے کے باوجود کیونکہ ہم سب کا قربانی میں الگ الگ حصہ ہوتا ہے اس لیے تینوں کام ہی کرنے پڑتے ہیں میں تو اپنی سہولت کی وجہ سے گوشت کے آتے ہی اس میں سے بانٹنے کا علیحدہ کر دیتی ہوں ہمارے سسرال کی یہ اچھی روایت ہے کہ چاہے خاندان ہو یا محلہ ہم صرف وہیں گوشت بھیجتے ہیں جہاں قربانی نہیں ہوئی ہو۔

گھر کے حصے والے گوشت میں سے قیمے کا الگ بریانی کباب کا رو کھا گوشت اور پلاؤ کے لیے ہڈی والا

گوشت دھو کر کافی دیر کے لیے پھلنیوں میں ڈال کر چھوڑ دیتی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح خون اور بساندہ بھر اسار اپنی نکل جاتا ہے۔ ایک ٹوکوشٹ میں بو نہیں رہتی پھر فریج بھی صاف رہتا ہے۔ جب گوشت کا سار اپنی نکل جاتا ہے تو چھپھرے، چربی وغیرہ کٹ کر گوشت کو مختلف تھیلیوں میں بیک کر دیتی ہوں ساتھ ساتھ کالے مار کر سے ہر تھیلے پر لکھتی جاتی ہوں کہ یہ بریانی کا ہے یا یہ کباب کا گوشت ہے۔ اس وقت کی تھوڑی زیادہ محنت بعد کے آرام کا باعث ہوتی ہے۔ دھلا دھلایا صاف ستھرا گوشت فریج میں موجود ہوتا ہے مہمانوں کی آمد پر نکال کر وقت ضائع کیے بغیر کھانا پکایا جاسکتا ہے۔

ہمارے سسرال میں پہلے دن کھانے پر کافی لوگ موجود ہوتے ہیں تو میں اور میری دونوں جھانیاں صلاح مشورے سے گوشت کی ایک ایک ڈش اور بجنی پلاؤ پکا لیتے ہیں اس طرح تینوں کو سہولت ہو جاتی ہے اور دسترخوان پر بھی بورائی ہو جاتی ہے کیونکہ ہم سب ہر تہوار پر کھانا ساتھ ہی کھاتے ہیں۔

(2) بقر عید میں کیونکہ سب گوشت دیکھ دیکھ کر تھک جاتے ہیں تو ہلکا پھلکا کھانا چاہتے ہیں۔

بیف پارچے

ایک کلو گائے کے گوشت کی روکھی بڑی بڑی بوتیاں لے کر اس میں دو چائے کے چمچ لہسن اور ک اور حسب ذائقہ نمک شامل کر کے تھوڑے سے پانی میں چولہے پر چڑھا دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اب گوشت کو ٹھنڈا کر کے گوشت فریج میں رکھ دیں۔ اچانک مہمان آجائیں تو اس میں سے پہلے پہلے پارچے کٹ کر تیل میں فرائی کر لیں۔ اب اوپر سے پیسی کالی مرچ یا چاٹ مسالا چھڑک کر لیموں کے ساتھ پیش کریں۔

بیف پارچے بنانے میں بہت آسان اور مزیدار ڈش

ہے جو تینوں وقت پیش کی جاسکتی ہے۔ لیچ میں ڈال چاول کے ساتھ یا مہمانوں کو شام کی چائے کے ساتھ فرائی کر کے گرم گرم پیش کریں رات کے کھانے میں ان لوگوں کو کولڈ بیف کے طور پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو چکنائی اور تیز مرچ مسالے سے پرہیز کرتے ہیں۔

بیف کے پہلے پارچے کٹ کر ایک چائے کا چمچہ تیل ڈال کر فرائنگ پین میں گرم کر لیں۔ اب ایکسین کو دو ٹکڑے کر کے اس کے بیچ میں پارچے رکھ لیں اور اوپر سے پاز کے لچھے، کھیرا نمٹاڑ اور کچپ لگا کر لنڈ بیف برگر پیش کریں۔

عظمیٰ افتخار

(1) یہ بالکل بجا فرمایا امتل آپ نے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر خواتین کی ذمہ داریاں واقعی ہی بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے دو کام یعنی گوشت صاف کرنا اور سنبھالنا لازمی میرے حصے میں آتے ہیں جبکہ تیسرا کام یعنی پکوان تیار کرنے کا کام آہنشل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ڈش تیار کرنی ہو تو وہ بھنی ہوئی کھجی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

قریبانی کے گوشت کی تقسیم کے بعد جو حصہ گھر کے استعمال کے لیے مختص ہوتا ہے۔ اسے کٹ کر چھوٹی چھوٹی بوتیوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے پھر انہیں دھو کر ان کا پانی نتھار لیا جاتا ہے اور پھر مختلف ڈشز کے مطابق ان بوتیوں کے پیکٹ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ گوشت کے کچھ حصے کا باریک قیمہ کروالیا جاتا ہے تاکہ وہ مختلف طرح کے کباب اور کوٹے بنانے کے کام آسکیں۔

(2) عید الاضحیٰ پر ہر طرف باری کی کاج چارہ رہتا ہے۔ عید کے دو سرے دن ہمارے گھر بھی باری کی کاج کا اہتمام ہوتا ہے۔ تمام عزیز و قارب جمع ہوتے ہیں۔ جہاں بڑے سے صحن میں گپ شب، میوزک، ہلا گلا اور سیخوں پر گوشت کی مسالا لگی بوتیوں کو پروانے کا کام ہو

برسات کی دنگا

اعتیاز احمد ڈانگ ٹیبل پر بیٹھے تو سفینہ ناشتے کے لیے موجود تھیں۔
 ”واہ! بڑی خوشبو نہیں لگا رہے ہو آج کل۔“ سفینہ نے فضا میں سونگھتے ہوئے لطیف سا طعز کیا تو وہ کرسی
 کھینٹ کر بیٹھتے ہوئے ٹھنک سے گئے۔
 ”تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں تو چھوڑ دیتا ہوں۔“ چشمہ اور موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا انداز
 ہمیشہ کی طرح دوستانہ ہی رکھا۔
 ”خیر! ایسی بھی کوئی خوش فہمی نہیں مجھے کہ میری خاطر تم کچھ چھوڑتے پھوگے۔“
 ان کے آگے آلیٹ کی پلیٹ کھڑکاتے ہوئے وہ دوسری پلیٹ میں توس رکھنے لگیں۔ اعتیاز احمد کو معلوم تھا یہ
 دھواں سا ”کہاں“ سے اٹھ رہا ہے۔
 ”کمال کرتی ہو سفینہ بیگم! میں کون سا ”چار“ کر کے بیٹھا ہوں۔ جنہیں چھوڑ کے تمہیں خوش کرنے کی کوشش
 کر سکوں۔“ انہوں نے ناشتا شروع کرتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔
 ”ہو نہ! یہاں تو ایک ہی دل پہ بہت بھاری ہے۔“ سفینہ نے جل کر کہا۔ تو وہ توجہ دیے بغیر اپنے لیے کپ میں
 چائے نکالنے لگے۔
 سفینہ کا دل اور جلا۔



اور ایسا ہمیشہ اسی وقت ہوتا تھا جب وہ امتیاز احمد سے الجھتا چلتی اور وہ یوں ان سے دامن بچاتے جیسے وہ کانٹے دار جھاڑی ہوں۔ ان کی تلملاہٹ بھری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے امتیاز احمد نے خود ہی بات بدل ڈالی۔

”معین چلا گیا یونیورسٹی؟“

”جگا کے آئی ہوں۔ فریش ہو کے آرہا ہے۔ ایریز اور زارا چلے گئے ہیں کالج۔“

”مجبوراً ہی سہی مگر سفینہ کو بھی اپنا موڈ بحال کرنا پڑا۔ اسی وقت نکھر نکھر سامعین چلا آیا۔“ السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔ آج اتنی دیر؟“ امتیاز احمد نے نظر بھر کے خور و بیئے کو دیکھا۔

”جی ابو! پہلے دو پیریز زفری تھے۔ سرچا آ، ام ہی کیا جائے۔“

وہ مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر امتیاز احمد کو احساس ہوا، معین ان کا سب سے چلبلا اور حاضر جواب بیٹا ہوا کرتا تھا، مگر اب ایک عجیب سی سنجیدگی اور لیا دیا سا انداز اس کی پہچان بننا جا رہا تھا۔

”ہوں۔ اچھا کیا۔“ انہوں نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

سفینہ نے جوس کا گلاس بھر کے معین کے سامنے رکھا۔ اسی وقت امتیاز احمد کامو بائل بجنے لگا۔

”ٹھیک سے ناستا کرو معین! ضروری نہیں کہ یونیورسٹی جا کے الم غلم سے بیٹ بھرا جائے۔“ سفینہ بیٹے کو ٹوک رہی تھیں۔

”ہوں۔ اچھا۔“ امتیاز احمد مبہم سے انداز میں فون پر بات کر رہے تھے۔

”کتنے چاہئیں؟“ ان کا لہجہ مدہم پر اتنا سفینہ کے کان گھڑے ہو گئے۔

”اچھا کب تک؟“ امتیاز احمد انہیں متوجہ ہوتے دیکھ کر اٹھ گئے۔ مو بائل ان کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہاں سے ہٹ گئے۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں پنچا دوں گا تم فکر مت کرو۔“ وہ دھیمی آواز میں کہتے دور چلے گئے تھے۔

”دیکھا تم نے کن ہوا زیں نیں اڑ رہے ہیں۔“ دانت پیٹتے ہوئے سفینہ نے کہا تو معین چونکا۔

”جی ماما! کون اڑ رہا ہے؟“

”مہی۔ تمہارا باپ اور کون۔ کئی دفعہ ایسے ہی خفیہ فون آتے ہیں دن میں۔“

وہ تلملا رہی تھیں۔ معین نے ایک سنگتی نگاہ ادرھڑالی، جدھر امتیاز احمد گئے تھے۔ وہ کیا ناواقف تھا باپ کی اس اداس۔ ہرگز نہیں۔

یہ وہ فون کال تھی جو وہ اس کی ماں کے سامنے سننے کی ہمت نہیں رکھتے تھے، مگر جسے سننے سے وہ بھی انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

”کم آن ماما! ایسے کوئی خفیہ والوں سے تعلقات نہیں ہیں ان کے۔“ معین نے سراسر انہیں ہلایا۔

”لکھ کے رکھ لو تم معین! تمہارا باپ ابھی تک اس حرافہ سے رابطے میں ہو گا۔ دنیا چھوڑ دے اسے۔ یہ کبھی نہیں چھوڑے گا۔“

اس موضوع پر سفینہ حد سے زیادہ زہریلی ہو جاتی تھیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ سالوں پہلے وہ قصہ ابو نے اپنے ہاتھوں اپنی مرضی سے ختم کیا تھا۔ پھر بھی آپ کو یقین نہیں آیا۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”مگر یہ مت بھولو کہ وہ مجبور ہو گیا تھا اس قصے کو ختم کرنے کے لیے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کچھ آنے والا نہیں تھا۔ میں تو مجبوری کا سودا ہوں اس شخص کے لیے۔“

سفینہ نے اولاد سے کبھی ماضی کا ایک لفظ نہ چھپایا تھا۔ کیوں کہ یہ ان کے باپ کا ماضی تھا۔ اپنا ہوتا تو یقیناً ”چھپائیں۔ امتیاز احمد لوٹ آئے۔“

”آفس سے فون تھا۔“ ان کی وضاحت قطعی غیر ضروری تھی۔

”تو بیس بیٹے کے سن لیتے۔ یہاں کون سا پابندی ہے آفس کے متعلق بات کرنے پر۔ تم تو یوں اٹھ کے کونے میں گئے جیسے پرانی محبوبہ نے فون کر دیا ہو۔“ سفینہ کی زبان کے آگے کھائی تھی۔ اب کی بار امتیاز احمد کو بھی برا لگا۔

”سوچ سمجھ کے بات کیا کرو سفینہ! چھوٹے چھوٹے لفظوں کی پکڑ بہت سخت ہوا کرتی ہے۔“ پھر وہ انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر معین کی طرف متوجہ ہوئے۔

”تم فارغ ہو چکے تو مجھے ذرا بینک لے چلو۔ پھر آفس چھوڑ دینا۔“ ان کی گاڑی ورکشاپ میں تھی اور آج کل ان کے پک اینڈ ڈرائیو کی ذمہ داری معین پر ہی تھی۔

”جی چلیے۔“ وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ اس موضوع نے اس کی طبیعت بھی اچھی خاصی مگر کر دی تھی۔ جانے اس موضوع کے ساتھ معین احمد کے کیسے تار جڑے تھے کہ اس کی سوچیں مرتعش ہو جاتیں اور وہ خود کو بہت تنہا اور بے بس پاتا۔

”ہو نہ! آفس کا فون۔ ابھی میں مو بائل چیک کرتی تو پول کھل جاتی جناب کی۔ جو ان اولاد کال کاٹ کر لیا میں نے ورنہ۔“ سفینہ کا غصہ ان کے جانے کے بعد بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ وہ مسلسل بریدار رہی تھیں۔

وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ امتیاز احمد نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر تاسف سے بولے۔

”اپنی ماں کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ خواہ مخواہ اپنا بی بی شوٹ کرتی رہتی ہے۔“

”ان کے سامنے جب ”خفیہ“ فون آئیں گے تو ان کا بی بی لازمی شوٹ کرے گا۔“ معین کا انداز خفگی سے بھرا تھا۔

”تم بھی۔؟“ امتیاز احمد کو برا لگا۔

”کیا ابو! خواہ مخواہ کا ورد سربال رکھا ہے آپ نے۔ کیوں اپنی پرسنل لائف خراب کر رہے ہیں۔ یاد کریں ماما کا رویہ تب سے اتنا پوزیسو ہوا ہے جب سے ان کا لڑکا سلسلہ چلا ہے۔“ معین نے انہیں یاد دلایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر بڑے سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔

”تم بتاؤ۔ تم نے اپنے فیوچر کے متعلق کیا سوچا ہے؟“ معین نے بے اختیار باپ کا چہرہ دیکھا۔ وہ دند اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ معین ان کے سوال کی گہرائی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تب ہی سامنے متوجہ ہوتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

”میں اپنی زندگی اپنی ترجیحات کے مطابق گزارنا چاہتا ہوں۔“

”اور اگر اس میں میری کوئی خواہش بھی شامل ہو جائے تو۔؟“

ان کے لب و لہجے میں ایک آس ایک امید سی اتر آئی تھی جسے محسوس کرتے ہوئے معین احمد کا دل ویسے ہی پکھلنے لگا جیسے آج سے تین سال پہلے۔ اس نے سر جھٹکا۔

”آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کی خواہش کا بوجھ ہی ڈھورہا ہوں میں۔“ اس ”یاد“ نے حسب معمول اسے تلخ کر دیا تھا۔

”مگر تم چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو معیذ! اگر ایک قدم میں نے اٹھایا ہے تو دو سراسر اٹھاؤ۔“ انہوں نے بدستور مصالحتانہ انداز اپنا رکھا تھا۔

”میں وہ قدم اٹھا چکا ہوں! مگر اب بس اور کچھ نہیں۔ میں اس راہ پر چلنا ہی نہیں چاہتا۔ اپنی زندگی کے لیے میں اپنے دل و دماغ کی تمام تر ضمانندی کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔“

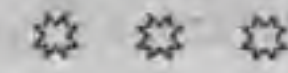
اس نے سلکتے ہوئے قطعی انداز میں جواب دیا۔ امتیاز احمد نے لب بھینچے۔ معیذ نے بینک کے سامنے گاڑی روکی۔

”یہ ٹاپک مجھے ٹینشن کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتا ابو! اما کے سامنے میں خود کو چور سا محسوس کرتا ہوں کیوں کہ اس راز میں میں آپ کا شریک ہوں۔“ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ قدرے رکا اور پھر سختی سے بولا۔

”بلکہ اس گناہ میں بھی جسے کرنے کی اجازت ماما زندگی بھر نہ دیتیں۔“

”تم محض جذباتی ہو رہے ہو معیذ! کبھی ”اس“ سے ملو گے تو یقین کرو میرے فیصلے کو بہتر نہ پاؤ گے۔“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے رسائی سے بولے۔ معیذ نے سلگتی نگاہوں سے انہیں بینک میں داخل ہوتے دیکھا۔

”ہونہ! بہترین فیصلہ۔ جس کا تادان تین سال سے موٹی موٹی رقوں کی صورت بھر رہے ہیں۔ آپ ”اس“ کی رگ رگ میں وحشت سی بھرنے لگی تو پر آگندہ سوچوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے گاڑی میں پر شور میوزک گالیا اور سیٹ سے سر نکا کر آنکھیں موند کر خود کو پرسکون کرنے لگا۔



”کیا بات ہے۔ کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو؟“ دھپ سے اس کے پاس گھاس کے قطعے پر بیٹھتے ہوئے حنا نے کچھ اس قدر اچانک آکے پوچھا کہ وہ بل بھر کو گڑبڑا سی گئی پھر جلدی سے خود کو سنبھالا۔

”تی جلدی پیرنڈ ختم ہو گیا؟“ اس نے بات بدلنا چاہی مگر حنا یوں قوف ہرگز نہ گئی۔

”محترمہ! آوے گھٹنے کا پیرنڈ تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جب میں گئی تھی تب بھی تم اسی پوزیشن میں بیٹھی تھیں اور اب جب آئی ہوں تب بھی ویسے ہی بیٹھی ہو۔ مسئلہ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں یا! بتایا تو تھا۔ سر میں درد ہے۔ تب ہی تو کلاس بھی بینک کی ہے میں نے۔“ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے گویا وہاں سے شکستگی کے تاثرات کو مٹانے کی سعی کی۔

”اللہ!“ حنا نے جیسے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے گردن گھما کر تھوڑی دور لان میں بیٹھے لڑکیوں کے گروپ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ یوں ہی ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ حنا نے چند لمحوں کے بعد اسے گھور کے دیکھا۔

”تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے ایسا! کہ تم ہریل ایک گم گشتہ سیارہ بنے رہنا چاہتی ہو جسے ہر وقت کوئی کھو جتا رہے۔ خود سے مجال ہے جو ایک لفظ بھی پھوٹ دو۔“ وہ جھل سی ہوئی۔

پچھلے تین سال سے وہ دونوں بہترین مسہل حال تھیں اور ایسا حال سے اتنا جان نہیں پائی تھی جتنا حنا اسے سمجھ چکی تھی۔

”سمسٹر کی فیس کے لیے پریشان ہو؟“ حنا نے یلکھت ہی اتنے یقین سے پوچھا کہ وہ جو مصمم ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ کم از کم حنا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گی چپ کی چپ رہ گئی۔ چند ثانیوں تک اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد

حنانے لاپرواہی سے کہا۔

”اچھا چھوڑو ان فضول اور فالتوں کے مسائل کو۔ چلو کینٹین میں چل کے گرم گرم سموسے کھاتے ہیں۔ ساتھ میں ٹھنڈی ٹھار بول۔“ ایسا نے شکوہ کنائے نظروں سے اسے دیکھا پھر ناراضی سے بولی۔

”مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ میرے سر میں درد ہے۔“

”ہاں۔ فقط درد ہی درد ہے اس میں۔ دماغ تو ہے ہی نہیں سرے سے۔“ حنا اب طنز پر اتر آئی تو اس کا دل گداز ہونے لگا۔

”گھر فون کیا تھا؟“ حنا نے جیسے اس پر ترس کھا کر پوچھا۔

”ہوں۔“

”ہاں۔ کہہ تو رہے تھے کہ پیسے بھجوا دوں گا مگر کل لاسٹ ڈیٹ ہے فیس جمع کرانے کی بلکہ ہاسٹل کے ڈیوڑپے کرنے کی ڈیٹ تو گزر بھی چکی۔“

ایسا کے لہجے میں محسوس کن جھکن تھی۔

”مجھے ایک بات تو بتاؤ یا! ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تمہارا یوں ہاسٹل میں رہنا بلکہ ان تین سالوں میں میں نے تمہیں کبھی کبھار ہی گھر جاتے دیکھا ہے وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے اور بس۔“

اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر ایسا مراد کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ جو اس کا باپ ہونے کا دعویٰ وار تھا وہ اسے محض چند گھنٹے کے لیے ٹھکانے ہی لے جاسکتا ہے اور بس۔

وہ تو شکر تھا کہ چھٹیوں میں حنا گھر چلی جاتی تھی ورنہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ ان دنوں بھی ایسا ہمیں ہوتی تھی۔ ہاسٹل ویران ہو جاتا۔ وہ تو اللہ مہربان تھا کہ ہاسٹل وارڈن کی رہائش وہیں پر تھی اور وہ اضافی کرایہ وصول کر کے ایسا کو وہاں رہنے کی اجازت دے دیتی تھی۔

”تو کیا ہوا۔ تمہارا گھر بھی تو اسی شہر میں ہے۔ تم بھی تو ہاسٹل میں رہتی ہو۔“ ایسا نے فی الفور خود کو سنبھالا تھا۔

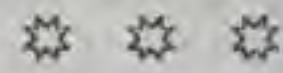
اپنے ماضی کو ننگا کر کے وہ خود کو بے پردہ نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر اس قدر غلیظ ماضی۔

”میرا مسئلہ اور ہے۔“ حنا نے سر جھٹکا۔

”تو بس۔ میرا مسئلہ بھی اور ہی ہے۔ بتایا تو تھا تمہیں۔ سوتلی ماں مجھے گھر میں قدم نہیں رکھنے دیتی۔“ ایسا نے اس سے نظریں ملاتے بغیر کہا اور پھر فوراً ہی بیگ سنبھالتی اٹھ گئی۔

”اچھا چلو۔ آج کینٹین کا بل تمہارے ذمے۔ پیسے آئیں گے تو میں بھی تمہیں عیش کراؤں گی۔“

”کبھی تو مجھ پہ اعتبار کرو گی۔“ حنا اسے جاتے ہوئے اٹھی تھی۔ ایسا لب بھینچ کر رہ گئی۔



”امتیاز احمد! تم پوچھتے کیوں نہیں معیذ سے۔ کیوں اتنا بدلتا جا رہا ہے وہ۔ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھو۔ کہیں کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں۔“

سفینہ نے لان میں پیچھی میز پر چائے لاکر رکھتے ہی ڈرون حملہ کر دیا تھا۔ اخبار میں گم امتیاز احمد جو نکلے بے اختیار اخبار بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں کیسے شک ہوا؟“

”ایک تو یہ کہ وہ تمہارا بیٹا ہے اور دو سرائیہ کہ اس کی خاموشی اور سنجیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ شادی کا نام لوں تو یوں بدلتا ہے جیسے کسی گناہ کا کام کہہ دیا ہو۔“ طنز کرنے سے وہ باز نہ آئی تھیں۔ پھر اپنے خدشات بھی بتا دیے تو

انہوں نے گہری سانس بھری۔

”تم بھی تاسفینہ۔“ انہوں نے تاسف سے بیوی کو دیکھا۔

”وہ باب تو کب کا بند ہو چکا بلکہ میں نے اپنے ہاتھوں بند کر دیا۔ دل کی مرضی سے تم سے شادی کی مگر تمہیں آج تک یقین نہیں آسکا۔“

”ہاں۔“ سفینہ کی صاف گوئی میں ہشوہری کی جھلک تھی۔

”کیوں کہ مجھے کبھی لگا ہی نہیں کہ وہ باب مکمل طور پر بند ہوا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس تحریر کی جھلک مجھے دکھائی دے ہی جاتی ہے۔“

سفینہ کی بات پر انہوں نے گہری سانس بھر کے جیسے اندر کی کثافت کو کم کیا پھر اخبار لپیٹتے ہوئے میز پر رکھ دیا۔

”اس عمر میں لڑکے پونہ پاتوں کو دل پہ لے لیتے ہیں۔ وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

انہوں نے گول مول سا بھروسہ کیا مگر وہ سفینہ امتیاز تھیں۔ جنہوں نے گزرے پچیس برسوں میں ان کا ماضی نہیں بھلایا تھا۔ (اور نہ ہی انہیں بھولنے دیا تھا) تو اپنے لاڈلے بیٹے کے معاملے میں کیسے چوکھیں۔

”اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرے نا۔ پہلے مجھی تو ایسے ہی کرتا تھا۔ مگر اب دو تین سالوں سے جیسے اپنے آپ میں سمٹ کے رہ گیا ہے۔“

”ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ۔“ وہ محتاط سے انداز میں کہہ کر چائے پینے لگے۔ سفینہ نے تیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یعنی کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟“ امتیاز احمد گڑبڑ سے گئے۔

”یہ میں نے کب کہا۔ میں تو بریگیٹل تذکرہ بات کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کوئی مسئلہ ہو اس کا۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ سفینہ ڈھیلی پڑ گئیں۔

”یونیورسٹی کے بعد چند گھنٹوں کے لیے تمہاری فیکٹری میں بھی تو بیٹھتا ہے کریدنے کی کوشش کرو اسے۔“

”ہوں۔“ سچ کہہ رہی ہو۔“ وہ فرماں برداری سے بولے۔

کیا کہتے۔ بیٹے کے گزرے سالوں کا ایک ایک پل وہ جانتے تھے۔ ان کی خواہش بروہ خازن پر چل پڑا تھا۔ اگر سفینہ جان جاتیں کہ باب بیٹا کس بات کے ہمراز ہیں تو قیامت سے پہلے ہی شاید اس گھر میں قیامت آجاتی۔

زارا اور ایزد اندر سے کسی بات پہ الجھتے ہوئے چلے آ رہے تھے ان دونوں کی توجہ تھی۔

”ماما! دیکھ رہی ہیں اسے کتنا بگڑ رہا ہے۔ یہ۔ آئندہ میں ابو کے ساتھ کلج جاؤں گی اور انہی کے ساتھ واپس آؤں گی یا پھر بھائی کے ساتھ۔“

وہ دھوپ سے کرسی پر بیٹھی۔ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جبکہ ایزد کے ہونٹوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔

امتیاز احمد بے اختیار مسکرا دیے۔

”کیوں بھی۔ کیا معاملہ ہو گیا۔ ہماری چچھاتی چڑیا اداس کیوں ہے؟ موسم تو بہت اچھا ہے آج پھر موڈ کیوں خراب ہے؟“ انہوں نے پیار سے پوچھا تو سفینہ کے دل میں ہمیشہ کی طرح سکون سا بھرتا چلا گیا۔ امتیاز احمد کا اولاد سے محبت کرنا انہیں ہمیشہ اپنے پیروں کی مضبوطی کا احساس دلاتا تھا۔

”ہاں ہاں! پوچھیں اس سے۔ ایک تو اسے پک اینڈ ڈراپ کرو۔ دھوپ میں گھنٹوں کھڑے ہو کے اپنا رنگ جلاؤ اور اسے دیکھیں احسان فراموش۔“ ایزد نے کہا باب اٹھایا۔

”تو کون کتنا ہے آکے وہاں لڑکیوں کو تاڑنے کی ڈیوٹی سرانجام دو۔“ زارا تنگی۔

”دیکھا آپ نے۔ نیکی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں ہے۔“ وہ شاکی ہوا مگر اس کی نگاہوں اور انداز سے چھلکتی شرارت

واضح تھی۔

”میں باز آئی ایسی نیکی سے۔“ زارا نے دونوں ہاتھ جوڑ کے ماتھے سے لگائے۔

”ایزدا کیوں تنگ کرتے ہو۔ بہن کو۔“ سفینہ نے پیار سے بیٹے کو گھر کا۔

”بھری دوپہر میں اپنے کالج سے اس کے کالج تک جاؤ۔ وہاں جلتی دھوپ میں کھڑے ہو کے اس کا انتظار کرو۔

بہن صاحبہ پھر بھی راضی نہیں۔“ وہ اپنے کپ میں چائے نکالتا متاسف ہوا۔

”ہاں اور وہ بھی بتاؤ نا۔ جو مجھے آرڈر کر رکھا ہے کہ آدھے گھنٹے سے پہلے کالج گیٹ سے باہر نہ نکلوں۔“ زارا

تلملائی۔ پھر اس کی شکایت لگانے لگی۔

”درخت سے ٹیک لگا کے ہیرو کا پوز مارے کھڑا رہتا ہے، جب تک ساری لڑکیاں چلی نہیں جاتیں۔“ امتیاز

احمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی جسے بیٹی کی ناراضی کے ڈر سے وہ چھپا گئے۔ البتہ سفینہ نے بیٹے کو گھر کا۔

”ایزدا! کیا سن رہی ہوں میں؟“

”ظاہر ہے۔ جو آپ کی بیٹی بتائے گی وہی کچھ سنیں گی آپ۔ ہم مردوں کی اس گھر میں کم ہی چلتی ہے۔ کیوں

ابو! وہ بات کو کہیں کا کہیں لے گیا۔ امتیاز احمد بس دیے۔

”اب آپ ہی بتائیں ماما! اتنی گرمی میں اتنا فاصلہ طے کر کے روزا سے لینے جاتا ہوں اب دھوپ میں جلنے کا

کوئی فائدہ بھی تو ہو۔ چند حسین چہرے دیکھ کر فریش ہونے میں کوئی حرج ہے کیا؟“ وہ ڈھٹائی سے بولا تو زارا رو ہانسی

ہونے لگی۔

”دیکھ رہی ہیں آپ۔ کس قدر بے شرم ہے یہ۔ ذرا جو اپنے کرتوت چھپاتا ہو۔“ وہ دونوں جزواں تھے۔ ایک

دوسرے سے لڑتے جھگڑتے مگر دوسرے ہی بل گھرے دوستوں کی مانند ہو جاتے۔

”باطل سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں ہم

سو بار لے چکا ہے تو امتحان ہمارا“

ایزدا نے برے اشائل سے شعر پڑھا تھا۔

”فہ! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جاؤ زارا! بھائی کو بلا کے لاؤ۔ اتنے اچھے موسم میں بھی آکے کمرے میں بند

ہو گیا ہے۔“ سفینہ نے بات سمیٹی۔

”وہ تو میں چلی ہی جاؤں گی۔“ وہ جھٹکے سے اٹھی۔ پھر انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔

”مگر اس مسئلے کا حل مجھے چاہیے۔ دھوم مچی ہوئی ہے وہاں لڑکیوں میں کہ پتا نہیں یہ ہیرو لینے کس کو آتا

ہے۔“ ایزدا کا تقہ بے ساختہ تھا۔

”تعریف کا شکریہ۔“ وہ آواب بجالایا۔ زارا پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔

”کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔“ سفینہ نے تنبیہی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

”اے شوق ہے تنگ ہونے کا۔ میری تعریفوں سے جھلس ہوئی ہے اور بس۔“ وہ لاپرواہی سے بولا اور اپنا

کباب ختم کرنے لگا۔

زارا دروازہ کھٹکھٹا کر اجازت ملنے پر معیز کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ شیشے کے آگے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔

”اتنے اچھے موسم میں آپ کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟“ زارا مسکرائی۔

”دیکھ تو لیا ہی ہے تم نے۔ اب کیا بتاؤں۔“ وہ برش لہرا کر بولا۔

”چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور میرا موڈ خراب۔“ زارا نے منہ پھلایا۔ وہ برش رکھ کے پلٹا۔

”کیا ہوا۔ پھر کوئی نئی لڑائی؟“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی تو پورے جوش و خروش سے اسے

ایزدا کی شکایت لگا رہی تھی۔ اسے زارا کے ساتھ آتے اور پوری توجہ سے بہن کی بات سن کر مسکراتے دیکھ کر

سفینہ کا دل مطمئن ہوا۔ وہ معیز کے لیے کپ میں چائے نکالتے لگیں۔

زارا کے لیے ان دنوں ایک بہت اچھا پروپوزل زیر غور تھا۔ رات کے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو یہی

موضوع زیر بحث تھا۔

”میں تو ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ اچھی فیملی ہے۔ لڑکے کے متعلق بھی اچھی رپورٹ ہی ملی ہے۔“ امتیاز

احمد نے گویا اب گیند سفینہ کے کورٹ میں پھینک دی تو انہوں نے مدد طلب نظروں سے معیز کو دیکھا۔

”اچھے لوگ ہیں ماما! اور پھر سفیر کو تھوڑا بہت تو میں پہلے سے جانتا ہی ہوں۔ بڑی اچھی طبیعت کا بندہ ہے۔“

گویا معیز بھی راضی تھا۔

”اور میری طرف سے تو ہاں ہی ہاں ہے۔“ ایزدا نے ہاتھ اٹھا کر رضامندی دی تو یکن میں برتن دھوئی زارا

تلملائی۔

”اس کو تو میں پوچھوں گی۔ بڑا شوق ہے اسے میری شادی کروا کے اپنا راستہ کلیئر کروانے کا۔“

”اچھی تو پڑھ رہی ہے۔“ وہ متذبذب تھیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتی تھیں اور بیٹی کی

نوعمری کا خوف بھی لاحق تھا۔

”سال ہی تو رہ گیا ہے ماما! اگر بچویشن کمپلیٹ ہو جائے تب شادی کرو بھیجے گا۔ فی الحال سنگنی کی رسم کر لیں۔“

معیز نے مشورہ دیا۔

”مسنز ریاض تو بھلی ہے۔ سرسوں جمائے کو تیار ہیں مینا! سفیر کا ارادہ ہے فرانس جانے کا۔ ان کا خیال ہے کہ نکاح

کرویں ہم زارا کا۔“

سفینہ نے نئی بات بتائی تو لمحہ بھر کو سب چپ رہ گئے۔

”فرانس کیا کرنے جا رہا ہے؟“ امتیاز احمد گوا چنبھا ہوا۔

”ان کا تو یہاں بہت اچھا بزنس چل رہا ہے۔ باپ ہے تین اور بھائی بھی ہیں ساتھ۔“

”پتا نہیں۔ کوئی ریفلیش کورسز کے لیے جانا چاہتا ہے۔ وہاں ماموں ہوتے ہیں اس کے۔“ سفینہ نے بتایا تو

امتیاز احمد نے ہنکارہ بھرا۔ ”ہوں۔“

”میری تو خواہش تھی کہ معیز اور زارا کی اکٹھی شادی کروں۔“ سفینہ نے اچانک ہی اظہار کیا تھا۔ امتیاز احمد

نے بے اختیار معیز کو دیکھا جس کے تاثرات میں فوراً ہی پتھر پلاپن اترنے لگا تھا۔ اپنی بات کہہ کر سفینہ اب

خستہ نگاہوں سے معیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ذرا سا جھنجھلا گیا۔

”میرا یہاں کیا ذکر؟“

”حالانکہ ذکر تو میرا ہونا چاہیے۔ میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے وہ۔“ ایزدا نے منہ بسورا۔ مگر سفینہ شاید اس بارے

میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں۔

”کیوں کیا تم شادی نہیں کرو گے کبھی؟“

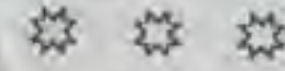
”فی الحال تو آپ زارا کی شادی پر فوکس کریں۔ میں نے اس معاملے میں ابھی کچھ نہیں سوچا۔“ وہاں سے نظر

چرا گیا تھا۔

”تو اب سوچ لو۔ دنوں میں لڑکی مل جائے گی میرے شزاوے بیٹے کے لیے۔“ سفینہ مسکرائیں اور پیار سے

اسے دیکھا۔ امتیاز احمد کا دل گھبرا سا گیا۔
 ”صحیح کہ رہا ہے یہ۔ تم زارا کے متعلق سوچو ابھی۔ اس کی کون سی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ سوچ لینے دو اچھی طرح۔“ امتیاز احمد جس طرح بے جا بولتا ہوا تھا، بولے تھے سفینہ کو تحیر، گھبراہٹ، جبکہ باپ کی طرف اٹھنے والی معیذ کی نگاہ میں شکوہ، تاسف تھا۔ بڑی جتنی ہوئی نگاہ تھی اس کی۔
 ”کمال ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زارا کے جانے کے بعد اس گھر میں ایک رونق آجائے اور آپ کو اس بات سے فرق ہی نہیں پڑتا کوئی۔“ سفینہ ان سے الجھنے لگیں۔
 ”فہم! ابھی تو یونیورسٹی چل رہی ہے اس کی۔ ٹھیک سے اپنے پاؤں پہ تو کھڑا ہو لینے دو۔“ صاف لگ رہا تھا کہ امتیاز احمد معیذ کی شادی کے حق میں نہیں ہیں۔
 ”میں بھی آپ کے ساتھ فیکٹری سنبھال رہا ہے۔ یہ شادی نہ کرنے کا مضبوط جواز نہیں ہے۔“ سفینہ نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

”کم آن۔“ ایک سختی معیذ نے دونوں ہاتھ نیپل کی سطح پر مارے تو ایک خاموشی سی چھا گئی۔
 ”اس موضوع کو چھوڑ دیں آپ لوگ۔ میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ تلخی سے کہتا وہ ان سے اٹھ کے ہی چلا گیا تھا۔
 ”مائی گاؤ۔“ ایزد متحیر تھا۔ ”میں نہیں کیا ہوا۔ اتنا غصہ؟“
 اور پریشان تو سفینہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ معیذ کا رویہ کچھ نفسیاتی سا لگنے لگا تھا اور یوں شادی کے نام سے بد کننا۔ ان کا دل ہول سا گیا اور ان سب سے سوا امتیاز احمد کسی اور ہی فکر میں تھے۔
 کہیں معیذ شادی کے لیے راضی ہی نہ ہو جائے۔ ”یہ سوچ ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔“



جتنا تیزی سے دروازہ کھول کے اندر آئی تو ایسا گواہی کیڑوں میں ملبوس نوٹس کے ساتھ سر کھپاتے دیکھ کر چلا اٹھی۔
 ”تم ابھی تک یونیورسٹی سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھی ہو۔“ ایسا ڈر سی گئی۔ مگر جتنا کوئی کھاتا تو نگاہوں میں ستائش سی اتر آئی۔ وہ ابھی پارلر سے تیار ہو کے آئی تھی۔ نئے اسٹائل کی کنگ بیٹل اور آئی بروز بنوانے سے اس کی شکل نکل آئی تھی۔
 ”میں کیا کروں گی وہاں جا کر جتنا! تمہارا بھائی کہے گا، کسے اٹھائی لائی ہے ساتھ۔“ جتنا کی خشمگیں نگاہوں کے جواب میں وہ گڑبڑا کر بولی۔ تو اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔
 ”وہ میرا بھائی ہے۔ تمہارا نہیں۔ اٹھو اور اب مزید ایک بھی لفظ کہے بغیر تیار ہو جاؤ۔“

اس نے ہاتھوں میں تھامے شاپنگ بیگز بستر پہ ڈھیر کیے۔
 ”چھا! تمہارا برتھ ڈے ہے۔ ہوٹل میں جانے کی کیا تک ہنسی ہے؟ گھر جا کے سیلیبریٹ کیوں نہیں کرتیں؟“ ایسا نے اپنی الجھن کو زبان دے ہی دی۔
 ”ہو نہ! وہاں ٹائم ہی کس کے پاس ہے میرے لیے۔ می کو اپنی پارٹیز سے فرصت ملے تو دو سروں کی پارٹیز شروع ہو جاتی ہیں اور پیا تو ہیں ہی امریکا میں۔ ایسے میں خالی دیواروں سے جا کے سر پھوڑنے سے بہتر ہے کہ بھائی کے ساتھ چند لمحے خوشی کے بتالوں۔“
 جتنا اس ہونے لگی تو ایسا کو افسوس ہوا کہ ایسے ہی اس موضوع کو چھیڑا جس کے متعلق وہ پہلے بھی کئی مرتبہ

بتا چکی تھی۔

”چھا! اس بار معاف کر دو اور اپنا گفٹ ہمیں یہ وصول کر لو۔ اگلی بار لازمی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
 ”خبردار!“ جتنا نے آنکھیں نکالیں۔ ”جو تم نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی تو۔“
 ”فہم! میرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ پتا تو ہے تمہیں۔“ ایسا کھٹکشاں کا شکار ہوئی۔
 ”وہ تو تم فکر ہی مت کرو نہ صرف اپنی بلکہ تمہاری بھی شاپنگ کر کے لائی ہوں۔“
 جتنا نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کے شاپنگ بیگز اٹھائے لگی تو بستر پہ دو جگمگاتے جوڑوں کے ساتھ جانے لگا۔
 ایسا گہری سانس بھر کے رہ گئی کہ اب فرار کی کوئی صورت نہ بچی تھی۔



”چھا! ویری گڈ! تمہاری صلاحیتوں کا میں یوں ہی تو معترف نہیں ہوں۔“
 سفینہ بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو امتیاز احمد بڑے موڈ میں کسی کے ساتھ موبائل پر محو گفتگو تھے۔ ان پر نگاہ پڑی تو امتیاز احمد نے بات مختصر کر دی۔
 ”چلو ٹھیک ہے۔ باقی باتیں مل کے طے کرتے ہیں۔ اوکے اللہ حافظ۔“
 ”کیوں فون بند کر دیا۔ میں کون سا آپ کی گفتگو میں خلل ڈالتی۔“
 سفینہ اندر کی بے چینی کو دہاتے ہوئے بولیں اور بیڈ کے کنارے ٹک گئیں۔
 ”ایک بہت بڑا کنٹریکٹ مل گیا ہے ہماری کمپنی کو۔ اس کے لیے لون بھی منظور ہو گیا ہے۔“ وہ خوش تھے۔
 ”چھا!“ سفینہ نے شکی انداز میں کہا۔ ”میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی۔“ امتیاز احمد ٹھٹکے۔ ان کی مسکراہٹ چھلکی رہی تھی۔

”کیا بات ہے تمہاری سفینہ بیگم! نہ کبھی خود میرے دل میں اتریں اور نہ مجھے یہ موقع دیا تم نے اتنے سالوں میں بھی نہیں جان پائیں مجھے؟“
 ان کے انداز میں بہت عرصے کے بعد شکوہ دور آیا۔ مگر نہ اس سے پہلے تو وہ نظر انداز ہی کر دیتے تھے ان کے ہر شک اور ہرج اورائی کو۔
 اور واقعی۔۔۔

سفینہ نے ہمیشہ انہیں سطحی انداز سے پرکھا تھا، کبھی اندر نہ اتر پائیں، ابھی وہ اسی تاظر میں بولیں۔
 ”فل!؟ تمہارے پاس دل تھا ہی کب امتیاز احمد! میرے پاس تو تم بے دل آئے تھے۔ بے روح جذبوں کے ساتھ۔“
 ”کیا اس بات سے بھی انکار کرو گی کہ جب میں تمہارے پاس آیا تو اس وقت صرف تمہارا تھا؟“ وہ بحث کم ہی کرتے تھے مگر اس وقت جیسے وہ بھی بحث پر اتر آئے۔
 ”صالہ تمہاری ملکیت ہی نہیں، بچپن کا پیار تھا امتیاز احمد! اور محبت کی راہ میں تم نہیں، وہ کسی اور موڑ مڑ گئی تھی۔ تم تو تنہا شاہراہ محبت پہ چلتے ہی جا رہے تھے۔ ایسا عشق تھا تمہیں اس بے حیا سے۔ جس نے پتا نہیں کس کے ساتھ یاری لگالی۔“ سفینہ اس ذکر پر سالوں بعد بھی اسی جذباتیت کا شکار تھیں جیسے آج ہی کی بات ہو۔
 ان کے انداز گفتگو نے امتیاز احمد کی رنگت لال کر دی۔ انہوں نے تنبیہی انداز میں سفینہ کو ٹوکا مگر وہ اپنے

مزاج کی مالک تھیں۔

”تو کیا جھوٹ ہے اس میں امتیاز احمد! کہو کیا اس نے کسی اور کی خاطر تمہیں ٹھکرا دیا تھا؟ سگی چچا زاد تھی تمہاری مگر کیسی بد فطرت نکلی۔ سر سے پاؤں تک نیلو نیل کر دیا ماں باپ نے مگر اس کا چاروںوں کا عشق جیت گیا۔“ وہ سلگتے لہجے میں ساری کہانی بیان کر رہی تھیں۔

”شادی سے انکار بہر حال میں نے کیا تھا۔ بلکہ اس کی شادی سے پہلے ہی میں نے تم سے شادی کر لی تھی۔“ وہ تکلیف میں تھے۔ سفینہ بیگم یوں ہی نشتر ہاتھ میں لیے ان کے زخم کریدتی رہتی تھیں کسی ماہر جراح کی طرح۔ جانتی تھیں زخم کو کہاں سے چھیننا ہے۔

”اس میں بھی تمہاری محبت بلکہ عشق کی خود غرضی شامل تھی۔ کیوں کہ تم جانتے تھے تمہارے چچا صالحہ کی وہاں شادی مر کے بھی نہ کرتے۔ تم نے اپنی محبت کی قربانی دے کر صالحہ کی محبت کا میاب کروادی۔ تم سے مایوس ہو کر تمہارے چچا نے اسے بیاہ دیا اس کے عاشق کے ساتھ۔ اور زندگی بھر یوں قطع تعلق کیا کہ ماں باپ کی میتوں پر بھی نہ پہنچائی وہ۔“

وہ جیسے لطف لے رہی تھیں۔ صالحہ کی بے بسی کا امتیاز احمد کا کام محبت کا۔

واقعی جب صالحہ اپنی محبت کے لیے ان کے سامنے تڑپی، بلکی تو انہوں نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ سفینہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سفینہ ان کی خالہ زاد تھیں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں میں سفینہ ان کی دلہن بنا دی گئیں۔ تب چچا نے بیٹی کی ضد اور جان دینے کی حد تک ٹیلے پن کو دیکھتے ہوئے اس کی مراد صدیقی سے شادی کر کے اس سے ہر تعلق توڑ لیا۔

مگر یہ سب تو ماضی بعید تھا۔

ایسا ماضی جس کا دفن ہو جانا ہی بہتر تھا مگر سفینہ تو ان کے ماضی کو جیسے مسالے لگا کے ’ممی بنا کے‘ محفوظ کر کے سنبھالے ہوئے تھیں۔

”بس کرو سفینہ۔ اللہ کے لیے بس کرو۔ مریجی ہے وہ۔ اب تو اسے بخش دو۔“ امتیاز احمد بے اختیار سے ہو گئے۔

”ہو نہ! زمانے میں کسی کو بتا نہ چلا اس کے مرنے کا۔ تم ہی سے سنا تھا میں نے۔ رابطہ تھا تب ہی پتا چلانا تمہیں۔“ وہ بے حد سفاک تھیں یا شاید دل سے انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ حسین مورت مریجی ہے جو بھی امتیاز احمد کے دل کی ملکہ ہوا کرتی تھی۔

”ہاں۔ تمہارا رابطہ۔ مگر اب وہ کہیں نہیں ہے۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھ لیتیں۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یہ بات بھی تمہارے لیے قابل اطمینان نہیں؟“ وہ پھٹ پڑے تو سفینہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہاں۔ نہیں ہے اور نہ ساری زندگی ہوگی۔ کیوں کہ اس نے ٹھکرایا تھا تمہیں راستہ اس نے بدلا تھا تم نے نہیں۔ تمہارے دل میں تو اس کے لیے محبت ہی محبت بھری تھی۔“

”بے کار کی بحث کر کے میرا سرو کھا دیا ہے تم نے۔ جاؤ۔ یہاں سے یا پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔“ وہ بد دل سے ہو گئے۔

”رہنے دو۔ میں ہی چلی جاتی ہوں تمہاری تنہائی سے۔ تم تھوڑی دیر اور یا دوں میں کھیل لو۔“ وہ جاتے جاتے بھی طنز کرنے سے باز نہ آئی تھیں۔ امتیاز احمد نے گہری سانس بھر کے اندر کی کثافت کم کرنے کی سعی کی۔ پھر آنکھیں موند لیں۔

”بیا۔ وارڈن کو یہی کہنا کہ تمہاری کسی دوست کے ہاں پارٹی ہے۔ کیوں کہ میں نے اسے یہی بتایا ہے۔“ حنا تیار ہونے کے بعد بولی تو سینڈل پہنتی ایسا ہیڈ کی۔

”کیا مطلب۔ جھوٹ بول کے اجازت لی ہے تم نے باہر جانے کے لیے؟“

”سو واٹ۔ وہ خبیث وارڈن نکلنے کہاں دیتی ہے ویسے۔ اتنی مشکلوں سے تو مارکیٹ تک جانے دیا تھا اس نے۔ ایک چوٹی میں تو ہاسٹل سے باہر جاتی رہتی ہوں نا اس لیے مجھے اجازت دیتے ہوئے اسے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے لیے تو اس نے فوراً ہی اجازت دے دی تھی۔“ حنا نے مجبوری بیان کی مگر وہ تذبذب کا شکار تھی۔

”گر وارڈن کو بتا چل گیا تو؟“ میرا یہاں کون ہے جس کا بہانہ کر کے کہیں جاؤں میں۔“

”فہ۔ بلا وجہ بتایا تمہیں۔ ارے یار! کہنا کسی دوست کا ہی بہانہ بنایا ہے۔ چلو اب شام ہو رہی ہے۔ واپسی پر دیر ہوئی تو وارڈن کچا چبا جائے گی ہمیں۔“

”ہاں چلو۔“ وہ دل سے اس کے ساتھ جانے کو راضی نہ تھی مگر ایک ہی دوست تھی اسے ناراض ہونے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

حنا نے تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ بالکل ساوہ سے حلیمے میں رہنے والی ایسا ہانے قیمتی لباس تو پہن لیا تھا، مگر میک اپ کی کسی شے کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا، مگر اس سادگی میں بھی وہ جگمگاتی تھی جبکہ اس کے برعکس حنا نے اچھی خاصی تیاری کر رکھی تھی۔ اسے حنا کے ساتھ جاتے دیکھ کر وارڈن کی نگاہوں میں ناگواری سی اتر آئی۔ ایسا کادل لرزنے لگا۔

”میں نے اسے کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔“ حنا نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹے ہوئے سرگوشی میں بتایا۔ باہر آ کے ایسا ہانے ناراضی سے اپنا بازو چھڑایا۔

”انسان ایسا کام کرے ہی کیوں جس میں جھوٹ بولنا پڑے۔ اگر تمہارا بھائی خود آ کے تمہیں ہاسٹل سے لے جاتا تو ہم دونوں ہی گناہ گار نہ ہوتیں۔“

”چھالی لی مومنہ۔ آئندہ ایسا ہی کروں گی۔“ حنا نے فوراً ہی بات سمیٹ دی۔ مین روڈ سے انہیں رک شامل کیا تو کسی ریسٹورنٹ کا نام بتا کر حنا جلدی سے اندر بیٹھ گئی۔ جبکہ ایسا ہانے بڑی بے دلی سے اندر قدم رکھا۔

وہ اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی، مگر ہائے ری دوستی۔ یہ وہ بھی کام کروالیا کرتی ہے جو کوئی دوسرا کہے تو ہم صفا چٹ انکار کر دیں۔ ایسا سوچ رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں ایک بہترین ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایسا ہانوس ہونے لگی۔

”یہاں جائیں گے ہم؟“

”ہاں۔ تو؟“ حنا نے جیسے اس کی پریشانی سے لطف لیا۔

”حنا پلیز! مجھے ان جگہوں کے میز کا ذرا نہیں پتا، بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ دروازہ اندر کی طرف کھلے گا یا باہر کی طرف۔“

”تم چلو تو۔ دروازہ میں کھول دوں گی تمہارے لیے۔“ حنا بڑی برا اعتماد تھی۔ کیونکہ جس کلاس سے اس کا تعلق تھا وہاں ہولڈنگ عام سی بات تھی، مگر ایسا ہانے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ہوٹل دیکھنے والی تھی۔ حنا کا ہاتھ تھامے وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح اندر داخل ہوئی تو اسے سی کے خشک ماحول نے ان کا پر تپاک استقبال کیا۔ دھیر سا رے لوگ، باتوں کی جھجھکاہٹ، برتنوں کا شور، میز رفقاری سے آتے جاتے ویٹرز۔

ایسہا کی ٹائٹلس لرز رہی تھیں۔

یہ تو کوئی اور ہی دنیا تھی۔ غموں سے دور بے فکر۔

”کم آن بیابی کانفیڈنٹ۔ کیا جاہلوں کی طرح جی ہو کر رہی ہو۔ ایسی جگہوں پر یوں ظاہر کرنا چاہیے جیسے کتنی ہی دفعہ آچکے ہوں۔“

حتا متلاشی نظروں سے ہال میں دیکھتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی۔ پھر اس کو لیے ایک کارنر کی ٹیبل کی طرف چل دی۔

اونچا لمبا، مناسب شکل و صورت کا وہ شخص حنا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھا اور والہانہ انداز میں اسے ملا۔ اس نے گلے سے لگتے ہوئے حنا کے رخسار پر پیار کیا تھا۔

”کیسی ہو۔“ وہ یوں ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے پوچھ رہا تھا۔ ایسہا کا دل عجیب سا ہونے لگا۔

بہن بھائی کی ایسی بے باک بے تکلفی شاید حنا کی کلاس کا ہی حصہ تھی۔

حنا اس سے الگ ہو کر بیٹھی اور ایسہا کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ کیا۔

”یہ میری ایسٹ فرینڈ ہے۔ ایسہا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا فون پر۔“ حنا اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ جبکہ مقابل کی گہری نگاہوں نے لمحہ بھر میں ہی ایسہا کو سر تپا پسینے میں شرابور کر دیا۔ اس کا شدت سے وہاں سے غائب ہو جانے کو جی چاہا۔

”ہائکس ٹو میٹ یو۔“

اس نے ایسہا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی رنگت اڑ گئی۔ اس نے بے اختیار خود کو حنا کی اوٹ میں کر لیا۔

”کم آن سیٹی۔“ حنا نے بے تکلفی سے اپنے بھائی کے شانے پر ہاتھ مارا۔

”یہ ہماری کلاس کے رویوں کی عادی نہیں ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے ایسہا کو کرسی پر بٹھایا۔

”آئی سی۔“ وہ اب بھی ایسہا کے دکتے روپ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر حنا کو دیکھ کر معنی خیزی سے بولا۔

”خیر۔ حسن کی ہر خطا معاف ہوتی ہے۔“ حنا ہستی ہوئی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

”بروی ویر لگا دی آنے میں۔ میں تو کب سے آنکھیں پچھائے بیٹھا تھا تمہاری راہ میں۔“ وہ حنا کو والہانہ نظروں سے لگتے ہوئے بولا۔

جانے بہن بھائی کی ملاقات کتنے لمبے عرصے کے بعد ہو رہی تھی۔ ایسہا کو عجیب سا محسوس ہوا۔ حنا ہلکے سے کھنکھار کے بولی۔

”ایسہا کو منانے میں ٹائم لگ گیا۔ میں نے کہا میری برتھ ڈے پر میری دوست ہی ساتھ نہ ہو تو کیا مزہ۔ مگر

تمہاری موجودگی کی وجہ سے یہ جھجک رہی تھی۔ میں نے کہا میرا بھائی تمہارا بھائی۔“ حنا کے انداز میں ہلکی سی شرارت تھی مگر سیٹی جیسے بدک اٹھا۔

”بھائی۔؟“ حنا نے بے اختیار سیٹی کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے دہرایا۔

”جی میرے بھائی۔“ وہ جیسے تنبیہی انداز میں بولی تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

”لعلت ہے یار! بندہ کم از کم لفظ تو سوچ سمجھ کے نکالے منہ سے۔“ حنا زور سے ہنسی۔

”تمہیں زیادہ اعتراض کس پر ہے۔ میرے بھائی ہونے پر یا ایسہا کے؟“

”شٹ اپ۔“ وہ قدرے برہم سا ہوا۔

”جھا۔ چلو سو رہی۔ اور اب جلدی سے آرڈر دو۔ وارڈن نے صرف ایک گھنٹے کا ٹائم دیا ہے۔“ حنا نے فوراً

ہی بات کے ساتھ موڈ بھی بدل لیا۔
 ”حتا! واپس چلیں۔“ ایسا کادل ہنوز کسی نے مٹھی میں لیا ہوا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ماحول اس کی تربیت اور اقدار سے میل نہیں کھاتا۔
 ”ہور کرو یا میری فرزند کو۔“ حنا نے سیفی کو گھورا پھر ایسا کو پیار سے دیکھ کر بولی۔
 ”آئم سوری یار! اسی لیے تو تمہیں کہتی ہوں کہ اپنی دقیا نو سیت کی چادر کو اتار پھینکو۔ ہر جگہ آیا جایا کرو تب ہی کانفیڈنس آئے گا تمہارے اندر۔“

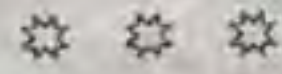
ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے کر وہ دونوں مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے تو ایسا کو اپنی موجودگی غیر ضروری لگنے لگی۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے ڈائنگ ہال میں نظریں دوڑانے لگی۔ جہاں ہر چہرے پر رونق اور بے فکری تھی۔ اور یہ دونوں ایسی چیزیں تھیں جن کا ایسا کی زندگی میں فقدان تھا۔ وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ ہر کوئی اپنی فیملی اپنے فرزند کے ساتھ مگن تھا۔ یوں جیسے کبھی کوئی دکھ انہیں چھو کر نہ گزرا ہو۔ کرسی تھینے کی آواز پر ایسا بے اختیار جوگی۔ اس نے سیفی اور حنا کو کھڑے ہوتے دیکھا۔
 ”کھانا آنے میں تھوڑی دیر لگے گی بیا! تم ذرا بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔“ حنا نے عام سے انداز میں کہا مگر اس کی رنگت اڑ گئی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“
 ”یہ بڑا خبیث ہے۔ میرا گفٹ کمرے میں ہی بھول آیا ہے اور اب اکیلے لانے پہ راضی بھی نہیں۔ جا کے دیکھوں تو سہی ایسا کون سا نادر و نایاب گفٹ ہے۔ بس میری جان! میں دو منٹ میں آئی۔“ وہ اسے پچکار تے ہوئے بولی تو سیفی کی موجودگی میں ایسا کوئی اعتراض بھی نہ کر سکی مگر اسے بہت عجیب سا لگا۔
 بسن نے اسی شہر میں گھر ہوتے ہوئے بھی ہاسٹل میں پناہ لے رکھی تھی تو بھائی کون سا کم تھا۔ اس نے ہوٹل میں کمرالے رکھا تھا۔ وہ گہری سانس بھرتی پھر سے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔
 ذرا دیر کے بعد ویٹر آ کے برتن سیٹ کرنے لگا۔

ایسا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر حنا کی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔
 اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اپنا موبائل ہاسٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ ورنہ کم از کم حنا کو کال ہی کر لیتی۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ دونوں بڑے فریش اور اچھے موڈ میں واپس آئے۔ اس دوران ایسا کئی دفعہ حنا کے ساتھ آئندہ نہ آنے کا مہم ارادہ کر چکی تھی۔ حنا نے ایک ہی نظر میں اس کا بگڑا موڈ بھانپ لیا۔
 ”آئم سوری یار! پاپا کی کال آگئی تھی سیفی کے موبائل پہ۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ سو

سوری۔“ وہ جھک کر ایسا کے گال پہ پیار کرتے ہوئے بولی تو اسے موڈ ٹھیک کرنا ہی بڑا۔
 ”اتنا کچھ رکھ گیا ہے ویٹر۔ ان کا وقت تو بہت اچھے سے گزر سکتا تھا۔“ سیفی کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ گہری تھی۔
 ”یہ دیکھو۔ ڈائمنڈ رنگ اور برہسٹ گفٹ کیا ہے سیفی نے مجھے۔“ حنا اسے دکھا رہی تھی۔ ایسا نے سرسری نگاہ ڈالی مگر واپسی پر وہ حنا سے الجھ پڑی۔

”یہ دونوں چیزیں اتنی وزنی تھیں کہ تمہارا بھائی اٹھا کر لانا نہ سکا کمرے سے۔“ حنا دل کھول کے ہنسی۔
 ”کچھ تحفے لینے کے لیے مقابل کی ہریات ماننی پڑتی ہے میری جان!“ ایسا اس کی ڈھٹائی پر کڑھتی رکشے سے باہر دیکھنے لگی۔



سب کی رضا مندی کے ساتھ سفیر کا رشتہ زارا کے لیے منظور کر لیا گیا تھا۔ ان دنوں سفینہ کا موڈ اور مزاج قدرے بہتر تھا۔ جانے والے کے مرنے کی خبر یہ یقین آگیا تھا یا پھر بیٹی کا بہترین جگہ رشتہ لگ جانے کی خوشی تھی۔ چونکہ ان لوگوں کا ارادہ نکاح کرنے کا تھا اس لیے شاپنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ابھی وہ زارا کے ساتھ اس کے سسرال والوں کے لیے شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔

”اف! زارا نے شاپنگ بگڑا دیا۔ صوفیہ ڈھیر کے اور خود بھی وہیں گری گئی۔“
 ”اس سے پہلے شاپنگ کرنے میں اتنی تھکاوٹ کبھی نہیں ہوتی تھی۔“ زارا ماں کی طرح کچھ زیادہ ہی نزاکت پسند تھی۔ بلکہ اس پر شاید ماں کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔
 ”اس سے پہلے تمہاری بات بھی تو طے نہیں ہوئی سسر! ایزد نہاد دھوکے فریش سا جملہ کستانی وی کے آگے جم کے بیٹھ گیا۔“

”ماما! اب ایزی کیا کرے گا؟“ زارا نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے سفینہ سے پوچھا تو ایزد ماں سے پہلے ہی بولا۔
 ”میں تمہاری شادی کے بعد ایزی فیل کروں گا اور کیا۔“
 ”جی نہیں۔ تو سنو ہو ہر کام میں شروع سے میری نقالی کرتے آئے ہو۔ میں تو ڈرتی تھی کہیں اب تم بھی نکاح کے لیے شور نہ مچا دو۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”ارے واہ۔“ ایزد کو بھی جیسے دھیان آیا۔
 ”مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ کچھ سوچیں ماما! کہیں سے کوئی لڑکی برآمد کریں۔“ وہ جیسے بے تاب ہوا شادی کرنے کو۔ سفینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
 ”ایسے تھوڑی بوجھ کی طرح سر سے اتار دوں گی۔ میں تو اپنے بیٹوں کے لیے چاندی دہلیزیں لاؤں گی۔ دنیا دیکھے گی جیسے چاند کو دیکھتی ہے۔“

”چاند جیسی۔ یعنی کڑھے پڑے ہوں گے چہرے پہ؟“ اس نے چہرے پر صدماتی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا تو سفینہ کو ہنسی آگئی۔

”بے وقوف! مثال دے رہی تھی۔“ پھر انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”جب تک معیذ کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک تم اپنے بارے میں سوچنا بھی مت۔“

”لو۔ اب ان ہی کے بارے میں سوچنا رہوں گا تو میرے بارے میں کون سوچے گا۔“ اس نے ناراضی سے کہا۔
 ”تمہارا میں خود سوچ لوں گی۔“ انہوں نے مسکراہٹ بھائی۔

”میرا تو خیال تھا کہ اس ملی کے ساتھ ہی بھائی کی نیا بھی پار لگا دیتیں۔ کم از کم میرا راستہ تو صاف ہو جاتا۔ پھر میں جب جی چاہے اپنے بارے میں سوچ لیتا۔“ وہ یونہی باتیں بکھارتا تھا۔
 ”وہ مانے بھی تو نا۔ ایسے بد کتا ہے شادی کے نام سے جیسے کوئی خطا کرنے کو کہہ دیا ہو۔“ سفینہ واقعی معیذ کے رویے سے پریشان تھیں۔

”آپ کہیں تو میں پتا لگاؤں، موصوف کہیں دل دل نہ لگا بیٹھے ہوں کسی غریب سی لڑکی سے۔ اور اب اس ڈر سے آپ کو نہ بتا رہے ہوں کہ کہیں آپ اسے ریجیکٹ نہ کر دیں۔“ اس نے لمحوں میں کہانی بنائی تھی۔ سفینہ نے اسے گھورا۔
 ”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“

”کوئی۔“ وہ ہنسا۔ ”ہر ماں کا یہی ڈانٹ لگ ہوتا ہے۔ تو جو ایسا کرتے ہیں وہ پتا نہیں بیڑوں پہ اگتے ہیں شاید۔“ اس کی بات پہ سفینہ کے ساتھ زارا ابھی ہنسی تھی۔ باہر کی طرف جاتے معیض کو سفینہ نے آواز دے کے بلا لیا۔

”جی ہاں؟“

”کہاں جا رہے ہو؟“

”یوں ہی۔ دوستوں کی طرف۔“ وہ مختصراً بولا مگر سفینہ شاید تفصیلی بات کے موڈ میں تھیں۔

”اپنے بہن بھائی کی فرمائش سنی تم نے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ زارا کے ساتھ ہی تمہاری بھی شادی ہو جانی چاہیے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”جیسا چل رہا ہے چلے دیں۔ فی الحال میں شادی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ماما!“ وہ بڑی بے زاری سے کہہ کر ایکسکسکو زکرتا چلا گیا۔

”واہ واہ! کیا نخرے ہیں بھئی۔“ ایزد نے متاثر ہو کر سرو صفا پھر شکایتاً بولا۔

”یہ اب موڈ چلیں گے اور ادھر ہم ارادہ باندھے بیٹھے ہیں اور کسی کو پروا نہیں۔“

”شیٹ اپ ایزد! ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ بھائی کے رویے کو دیکھو۔ یہ نارمل نہیں ہے۔ پہلے ہمارے ساتھ ہر بے گلے میں شامل ہوتے تھے، موج مستی، میرو تفریح۔ اور اب انہوں نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بنالی ہے۔ یونیورسٹی، آفس اور گھر کے علاوہ بس دوستوں کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارے لیے تو جیسے وقت ہی نہیں ان کے پاس۔“ زارا جذباتی ہونے لگی۔

”وہ بڑے ہو گئے ہیں اب۔“ ایزد نے اسے پککارا۔

”وہ پہلے بھی ہم سے بڑے ہی تھے۔ کوئی نئے نئے بڑے نہیں ہوئے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”خیر۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس موضوع پر معیض سے کھل کے بات کروں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“ سفینہ نے کہا۔

”اور اگر ان کی ڈیمانڈ آپ کے لیے قابل قبول نہ ہوئی تو؟“ ایزد نے ماں کا امتحان لیا۔ وہ اسے ٹالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

”وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے اس سے بات تو کرنے دو۔ دیکھتے ہیں بٹاری میں سے کیا نکلتا ہے۔“

”سانپ ہی نکلے گا ماما! سپر اتو نکلتے سے رہا۔“ ایزد کی زبان پھر پھسل گئی تو وہ ہنس دیں۔ زارا اپنی شاپنگ سمیٹنے لگی۔

سفینہ نے یہی موضوع امتیاز احمد کے سامنے چھیڑا تو وہ بے ساختہ بولے۔

”تو اس میں غلط کیا ہے۔ جب موڈ ہو گا کر لے گا۔“ سفینہ ان کے جواب پر لمحہ بھر کو انہیں دیکھ کر رہ گئیں پھر بولیں۔

”کیا دماغ ملتا ہے باپ بیٹے کا۔ ایسے فیصلے موڈ کے پابند نہیں ہوا کرتے امتیاز احمد!“

”فہ۔“ میرا مطلب تھا اسے سوچنے کے لیے وقت دو۔“ انہوں نے گڑبڑا کر کہا۔

”اس کا کام صرف رضامندی شو کرنا ہے۔ لڑکی میں خود تلاش کروں گی اپنے بیٹے کے لیے۔ اعلا خاندان کی۔“ سفینہ نے تقاضا سے کہا تو امتیاز احمد نے بے اختیار پہلو بدلا۔

”تنی جلدی کس بات کی ہے تمہیں۔ پہلے خیریت سے زارا کا نکاح ہو جائے دو۔ پھر سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔“ سفینہ نے انہیں گھورا۔

”کمال ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ تم میرا ساتھ دو گے مگر تم تو اسی کی زبان بول رہے ہو۔“ یہ حقیقت ہے سفینہ! کہ ہم معیض کی رضامندی کے بغیر اس کی زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کچھ عرصہ صبر کرو۔ ہو سکتا ہے ابھی واقعی وہ شادی نہ کرنا چاہتا ہو۔ پڑھ رہا ہے وہ ابھی۔“

”اسٹمسٹر چل رہا ہے اس کا۔ اس کے بعد فل ٹائم فیکٹری سنبھالے گا۔ تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے وہ اسکول میں پڑھ رہا ہے۔“ وہ بد مزہ ہو کر بولیں۔

”تو ان کی کج بحثی سے واقفیت کی بنا پر امتیاز احمد نے بہتر سمجھا کہ اپنا پہلو بچا جائیں۔ ویسے بھی معیض خود ہی شادی کے لیے راضی نہیں تھا۔ وہ اس کی حمایت نہ بھی کرتے تو یہ معاملہ سرخڑھنے والا نہیں تھا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ تم جو مناسب سمجھتی ہو وہ کر لو۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔“

”وہا نے تب نا۔“ سفینہ جھنجھلا گئیں۔

”تو پھر فی الحال اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“ ان کے اطمینان کو سفینہ نے شکی نظروں سے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

وہ امتیاز احمد کے آفس میں بیٹھا تھا۔ ان کی بات سن کے اچھل ہی تو پڑا۔

”کیا کہہ رہے آپ ابو! اس کو زارا کے نکاح میں انوٹ کریں گے؟“ بے یقینی سے زیادہ ناگواری اس کے لہجے سے ہو رہی تھی۔

”تو؟“ امتیاز احمد نے استفہامیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

”جائز اور شرعی رشتہ ہے اس کا سب سے۔“

”آپ اپنے لفظوں سے پھر رہے ہیں۔ شادی کے وقت آپ نے کہا تھا کہ اس کا ہمارے گھر اور اس کے مکیوں سے کوئی رشتہ نہ ہو گا۔“ معیض نے سچے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہت سے فیصلے وقت اور حالات کو دیکھ کر کرنے پڑتے ہیں معیض! اور اس وقت حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے تہانہ چھوڑوں۔ جو ذمہ داری میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کے اپنے شانوں پہ لی تھی اسے نبھاؤں۔“

وہ بے حد شجیدہ تھے۔ معیض نے اپنی چیغنے کی خواہش پر بہت مشکل سے قابو پایا تھا۔ خود کو بدقت تمام سنبھال کر وہ تکی سے بولا۔

”اور ماما۔ وہ جو قیامت چائیں گی اس کا کچھ سوچا ہے آپ نے؟“

”اگر تم میرا ساتھ دو گے تو میں اسے سنبھال لوں گا معیض!“ انہوں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

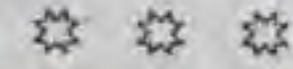
معیض نے فی الفور قطعیت سے انکار کر دیا۔

”ہرگز نہیں ابو! میں پہلے ہی آپ کا بہت ساتھ دے چکا ہوں مگر اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ آپ اسے گھر بلا میں گے تو اپنی ذمہ داری پر ساما کے سامنے آپ کو کھڑا ہونا پڑے گا۔“

”تم صرف اس کے ساتھ اپنے رشتے کا تعین کر لو معیض! باقی کام میرا ہے۔“ معیض نے تاسف سے باپ کو دیکھا۔ پھر خفیف سے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

”اس کا ہر رشتہ صرف آپ سے ہے ابو! میں نے تو فقط ایک مشکل وقت میں آپ کا ساتھ دیا تھا۔ آپ کا بھرم رکھا تھا اور بس۔“

”اور بس۔۔۔؟“ نہیں اس کے لفظوں نے تکلیف دی تھی۔
 ”جی اور بس۔۔۔ ویش اور اینڈ آل۔“ وہ تنہی سے کہتا پھر وہاں رکنا نہیں تھا۔ اٹھا اور آفس سے باہر نکل گیا۔
 امتیاز احمد نے بے اختیار اپنے دل کو مسلا۔ جہاں وہ ہلکا سا درد محسوس کر رہے تھے۔
 ”جانے میں یہ ذمہ داری نبھایاؤں گا یا نہیں؟“



زارا کے نکاح کی تقریب شہر کے بہترین میرج ہال میں منعقد ہوئی۔ سفیر اور زارا کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج معین کا موڈ بھی بہت اچھا تھا۔ بہت عرصے کے بعد وہ سب کے ساتھ خوش گہیوں میں مشغول تھا۔ ایسے میں کتنی ہی بار اس نے خود کو کسی کی نگاہوں کے حصار اور کسی کی توجہ کا مرکز پایا۔
 وہ رباب تھی۔ زارا کی نند۔ بے حد ماڈرن اور بولڈ۔ ایک ایسی لڑکی جسے اپنی خوب صورتی کا پوری طرح احساس تھا۔ اور اسی احساس نے اسے اتنا اعتماد دیا تھا کہ جب معین سفینہ کے پاس کھڑا تھا تو وہ خود آکر سفینہ سے بولی۔
 ”دیکھ رہی ہیں آئی! یہ ویلو ہے لڑکے والوں کی۔ یہاں تو ہمیں کوئی لفٹ ہی نہیں کروا رہا۔“ بڑا ناز بھرا شکوہ تھا۔ نگاہ غلط لارو اپنے کھڑے معین پر تھی۔
 ”کیا ہوا بیٹا! سفینہ کی پریشانی فطری تھی۔“

”بھئی کوئی کمپنی ہی نہیں دے رہا ہمیں یہاں۔ بور ہو گئی میں تو۔ ایک ایریز سے دوستی ہوئی تھی مگر آج تو وہ بھی اسٹیج پہ بیٹھا پوز دے رہا ہے۔“ اس نے منہ بسور اتو سفینہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ انہوں نے معین کا بازو تھام کر کہا۔

”تو چلو اب معین سے دوستی کر لو۔ یہ بھی بہت اچھی کمپنی دیتا ہے۔“ سفینہ جیسے اسے معین کے حوالے کر کے ایکسکسکو ز کرتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ ان دونوں کے درمیان خاموشی ٹھہری گئی۔
 ”آپ اپنی زبان دکھائیں گے؟“ رباب نے اچانک فرمائش کی تو معین حیران ہوا۔

”جی۔ وہ کیوں؟“
 ”تھینک گاؤ! دراصل میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بے زبان مرد نہیں دیکھا تھا۔ مگر آپ تو اچھا خاصا بول لیتے ہیں۔“ وہ شرارت سے بولی تو وہ بے ساختہ ہی ہنسنا شروع ہوئے۔ مگر اسے اپنا ہنسنا خود ہی کچھ اتنا عجیب لگا کہ فوراً ہی ہونٹ سمیٹ لیے۔

”ہائے۔ آئی ایم رباب۔“ اس نے جیسے نئے سرے سے تعارف کراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا جسے تھام کر وہ اسی سنجیدگی سے بولا جس کا خاصہ بن چکی تھی۔

”مجھے معین احمد کہتے ہیں۔“
 ”تو معین احمد صاحب! آپ کو اچھا لگ رہا ہے یہ آپ جناب اور بناوٹی تکلفات؟“ وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ معین نے شانے اچکائے۔

”تمہاری مرضی۔ تم جیسے جی چاہے بات کرو۔ میں نے تمہیں ادب و آداب کا آرڈر نہیں دیا۔“
 ”شکریہ۔“ وہ سر جھکا کر ممنونیت سے بولی۔

”معین یار! تمہاری گاڑی کسی کی گاڑی کے پیچھے کھڑی ہے پارکنگ میں۔ جا کے دیکھو۔ انہوں نے گاڑی نکالنی ہے اپنی۔“

معین کے کزن نے آکر پیغام رسائی کی تو رباب نے بد مزہ ہو کر اسے دیکھا۔ معین ایکسکسکو ز کرتا ہال کے دروازے کی طرف بڑھا۔ رباب کی ستائشی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ پارکنگ ایریا میں آکر معین نے اپنی گاڑی نکالی تو آگے والی گاڑی کو نکلنے کا راستہ ملا۔
 وہ دوبارہ اپنی گاڑی پارک کر کے اندر کی طرف بڑھا۔

”ایک نسوانی آواز نے بعجلت اسے پکارا تو وہ ٹھٹک کر پلٹا۔ سیاہ چادر میں ملفوف وجود۔ معین کو شک ہوا۔ کیا اس نے مجھے ہی پکارا ہے؟“

”جی! فرمائیے؟“ سیاہ چادر کا پردہ رخ سے ٹھوڑا سا ہٹا تو معین کی نگاہ لہجہ بھر کو ٹھٹک سی گئی۔
 ”وہ۔۔۔ یہاں کوئی شادی کا فنکشن ہے؟“ وہ گھبرائی سی پٹائی سی لڑکی تھی۔
 ”کس کی شادی؟“ انوایٹنڈ ہیں آپ؟“ معین نے استفسار کیا۔

”جی۔ وہ دراصل شادی ہے نکاح تھا شاید۔ امتیاز احمد صاحب کی بیٹی کا۔“
 اس کی پیشانی جھک اٹھی تھی۔ معین بڑے زور سے چونکا۔ اس کی خاموشی پر وہ گھبرائی گئی۔
 ”میں ان کے ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔ اس نے مجھے باہر ڈراپ کیا ہے۔“ معین کے تن بدن میں شرار سا دوڑ گیا۔

”کون ہو تم؟“

”جی۔ میں۔۔۔ ایسہا۔“ وہ اس کے بدلتے انداز سے خوف زدہ سی ہو کر بولی تو معین لہجہ بھر کو لڑکھڑاسا گیا۔ جس قیامت کا وہ سوچتا بھی نہ چاہتا تھا آج وہ اس کی وہیلنر۔ آن کھڑی ہوئی تھی۔
 اسے اندر ہال میں سب کے ہنستے مسکراتے مطمئن چہرے نظر آئے اور اگر یہ فتنہ اندر چلا گیا تو کیا فساد مچے گا کیسی جگہ نسائی ہوگی اور ماما۔۔۔ وہ تو قیامت اٹھا دیں گی۔
 معین کی رگوں میں ملاو دوڑنے لگا۔

اس نے بے اختیار آگے بڑھ کے ایسہا کا بازو ہاتھ میں جکڑ کر غراتے ہوئے کہا۔
 ”میں امتیاز احمد کا بیٹا ہوں۔ جانتی تو ہوگی تم مجھے۔ معین احمد نام ہے میرا اور میں تمہیں اپنے ہنستے ہنستے گھر کو تباہ کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ ابو نے تم سے جو رشتہ جوڑا ہے اس میں ان کا ساتھ دینا میری مجبوری تھا مگر تمہاری وجہ سے میری ماں کا سکون برباد ہوئیے مجھے قطعاً قبول نہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔“

معین نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تو اس کی چادر سرک کر شانوں پر ڈھلک گئی۔ معین کی آنکھیں چند حیا سی گئیں۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے اس کا تعارف اس پر پہاڑن کے گرا ہو۔
 معین نے اسے خفیف سا دھکیلا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔

”رفع ہو جاؤ یہاں سے اور بھول جاؤ کہ کسی کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ گیٹ آؤٹ۔“

وہ نفرت بھرے لہجے میں کہتا لہجے ڈگ بھرتا اندر کی طرف بڑھا اور جیب سے موبائل نکال کر امتیاز احمد کے ڈرائیور کو کال ملائی۔

”عجیب خان! باہر پارکنگ میں ابھی جس لڑکی کو ڈراپ کیا ہے اسے واپس وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے تھے۔“ وہ تحسنا انداز میں بولا۔

موبائل آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے معین احمد نے خود کو عجیب سی وحشت کا شکار ہوتے محسوس کیا تھا۔
 (باقی اگلے صفحہ پر ان شاء اللہ)

دیکھا علی سید



اس شام احمد رضا جب گھر پہنچے تو حسب معمول بے حد تھکے ہوئے تھے۔ ایک تو چلا پلا تھی، آگ برساتی ہوئی بدن کو جھلساتی ہوئی دھوپ، گرم ہواؤں کے پیچھے اس پر کنسرکشن سائٹ پر حسب معمول مزدوروں کے ساتھ سارا دن کی مغز ماری۔ بندھال سے احمد رضا اس یقین کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے کہ ہاجرہ کو دیکھتے ہی ان کے دن بھر کی تھکن راحت میں بدل جائے گی۔ وہ ان کی آنکھوں کا نور اور کیچے کی ٹھنڈک جو تھی۔ اور آج تو ویسے بھی اس نے ان سے شام جلدی گھر آنے کی تاکید کی تھی، حالانکہ وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی۔

احمد رضا پیشے کے اعتبار سے ٹھیکے دار تھے اور گھروں کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ کئی مزدور ان کی زیر نگرانی رزق کھاتے تھے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ احمد رضا دولت میں کھیل رہے ہوتے، لیکن واقعی سی دنیاوی تعلیم رکھنے والے احمد رضا دل میں دینی علم کا سمندر رکھتے تھے۔ چنانچہ کوئی ایسا کام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صریحاً نافرمانی کے زمرے میں آئے۔ وہ بے حد فرض شناس اور ایمان دار تھے۔ کسی دوسرے کی وجہ سے خود ان کا کتنا ہی نقصان ہو جائے، لیکن کسی دوسرے کی تکلیف یا پریشانی کا سبب ان کی اپنی ذات بنے، یہ انہیں گوارا نہیں تھا اور ایسی صفات کے ساتھ ان کے گھر میں بے شک مال و دولت کا انبار نہیں تھا، لیکن دلوں

میں راحت اور زندگی میں سکون وافر تھا۔ ان کی نوکری مقررہ گھنٹوں والی نہیں تھی۔ بعض دفعہ وہ صبح فجر کی نماز ادا کر کے گھر سے نکلتے اور رات گئے گھر میں گھستے۔ دوسرے گھر والوں کی طرح خود ہاجرہ کو بھی احمد رضا کی اس مشقت بھری زندگی کا احساس تھا۔ اس کے باوجود آج جلدی گھر آنے کی تاکید نما فرمائش ہاجرہ نے ان سے کی تھی کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار وہ اپنی گھر کی شادی کر رہی تھی اور ہاجرہ کی کسی فرمائش کو کیسے ٹالا جائے؟ یہ احمد رضا کو آسانی نہیں تھا۔

وہ ان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ تین بیٹیوں کی پیدائش کے بعد نہ جانے کتنی دعاؤں، منتوں اور مرادوں کے طفیل اللہ نے انہیں اس من موہنی گڑیا سے نوازا تھا۔ کون سا پیر فقیر اور درویش تھا جس سے انہوں نے دعا نہیں کروائی تھی وہ جن بڑے چھوٹے علاقوں میں کام کرتے رہے تھے وہاں کی مساجد سے لے کر اپنے محلے کی مسجد کے پیش امام اور دیگر نمازی تک ان کی اس خواہش سے واقف تھے۔ دوست احباب، رشتے دار، بہن بھائی یہاں تک کہ ان کی شریک حیات یا سمین بھی بیٹی کے لیے ان کی تربیت پر ان کا مذاق اڑاتے تھے اور حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے کیونکہ وہ جس معاشرے میں رہتے تھے وہاں بیٹی کی پیدائش ”قسمت“ تصور کی جاتی تھی ”خواہش“ نہیں۔ سب کو بیٹیوں کی چاہ ہوتی تھی۔ ان ہی کی پیدائش پر شاید نے بچتے تھے، مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ احمد

رضا بعض دفعہ ان کی حیرت پر مسکراتے لیکن زیادہ تر وہ خاموشی پر ہی اکتفا کیے رکھتے۔ صرف ایک بار یا سمین کی بات کا انہوں نے کچھ برامتا تھا۔
”احمد صاحب! دنیا سے نرالی خواہش پالے بیٹھے ہیں آپ۔ لوگ تو بیٹیوں کی دعائیں کرتے ہیں مگر ان کا ہاتھ نہیں، باپ کے کندھوں پر سے ذمے داریوں کے بوجھ کو کم کر سکیں اور ایک آپ ہیں۔ اللہ نے تین تین بیٹے دیے ہیں، بن مانے کیسے جھولی بھری ہے اللہ نے اور بیٹی۔ بیٹی کیا ہوتی ہے احمد صاحب! نرا بوجھ پالو پوسو، لکھاؤ یرحاً اور اگلوں کے گھر رخصت کر دو۔ اس پر بھی سو طرح کے دھڑکے، خوف اندیشے۔ بیٹی لاکھ اچھی ہو مگر والدین کی زندگی کا سب سے بڑا سمجھوتا ہوتی ہے اس معاشرے میں جہاں ہم رہتے ہیں۔“

”یا سمین! میرے آقا سرکار دو عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، بیٹی رحمت ہوتی ہے والدین پر اللہ کی۔ جنت کا دروازہ کھولتی ہے بیٹی اور تم کہتی ہو بیٹی کی خواہش دنیا سے نرالی ہے۔ اری نیک بخت! جنت کے دروازے کی خواہش کرنا دیوانگی ہے کیا؟“ احمد رضا کے لب کیکپاٹے لگے تھے۔ ”میں تو اللہ سے اپنی خوش بختی مانگتا ہوں، کیا اللہ سے اس کی رحمت نہیں مانگتا



چاہیے؟“ پھر یاسمین کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے احمد رضا کی جنون بستی ہوئی خواہش پر کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ وہ خود بھی نمازوں میں اللہ سے بٹی کی دعا کرنے لگی تھیں۔ یاسمین کو بہر حال اس بات کا احساس ہو ہی گیا تھا کہ بیٹے لاکھ بہت نیک فرماں بردار تھے، لیکن وہ جو گھر میں ایک مخصوص ملاحیت، نرمی اور رونق ہوتی ہے جو بیٹی کے دم سے ہوتی ہے وہ ان کے گھر میں نہیں تھی۔

اور پھر اللہ نے ہاجرہ کی صورت میں احمد رضا کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔ یاسمین موہنی صورت گلابی پلکوں اور رخساروں والی اس ننھی کلی کو پا کر بے حد مسرور تھیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ اللہ نے انہیں ایک سہیلی سے نوازا ہے۔ تینوں بیٹے بھی ننھی پری کو ”پہلے میں لوں گا“ ”نہیں پہلے مجھے دو“ کے مقابلے میں پیش پیش تھے اور احمد رضا۔

احمد رضا کی اس روز بار بار آنکھیں نم ہوتی رہی تھیں۔ کیسی راحت سی راحت تھی جو اس معصوم کو گود میں لینے پر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بن کر پھولی تھی۔ کیسی شفقت سی شفقت تھی جو اسے سنے سے لگاتے ہی ان کے دل سے دھڑکنیں چیرتی ہوئی نکلی تھی۔ اس دن کوئی احمد رضا سے پوچھتا کہ دونوں جہانوں کا خزانہ کسے کہتے ہیں تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بازوؤں میں سوئی ہوئی ننھی منی سی ہاجرہ کو آگے کر دیتے۔

وقت کسی مشین کی طرح گھر کے کام دھندوں میں مصروف دیکھا تو بنا کسی کے کہے یا سمین کے منع کرنے کے باوجود ان کی ہمدردی گہری ہو گئی۔

بھائی زیادہ تر گھر سے باہر رہتے تھے۔ کبھی تعلیم کے سلسلے میں تو کبھی یاری دوستی۔ لہذا ہر قسم کے احساس ذمہ داری سے عاری، انہیں گھر کے اندر بھی مصروف کر دیا کہ کم از کم وہ اپنے ذاتی نوعیت کے کام خود کرنے لگے تھے۔ وہ خود بھی تو بھائیوں کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ان کے امتحانات ہوتے یا وہ کبھی بیمار پڑتے تو ساری ساری رات ان کے ساتھ جاگتی، انہیں وقت بے وقت بھوک ستاتی تو کچھ نہ کچھ بنا کر لے آتی۔ بھائیوں کا بھی یہی خال تھا، اپنے جیب خرچ سے اس کے لیے ہر شام کچھ نہ کچھ کھانے کو لے آتے یا کھلانے لے جاتے اس کی کتابیں لیے چلے آتے۔ وہ جیسے کوئی سپر ہیرا بن گئی تھی۔ خود اپنی تعلیم سے بھی اسے عشق تھا کیونکہ یہ باپ کی خواہش تھی کہ وہ خوب پڑھے لکھے۔ سات برس کی عمر میں اس کا یہ عالم تھا، اب تو خیر سے وہ چودہ برس کی ہو گئی تھی، لیکن احمد رضا کے گھر آتے ہی وہ اب بھی سب کچھ بھول کر باپ کو ”پاری“ ہو جاتی تھی۔ کبھی ان کے پیروانی تو کبھی سر۔ احمد رضا جتنے بھی تھکے ہوئے گھر آتے، ہاجرہ کی ہلکی سی مسکراہٹ ان کی ساری تکان ایک لمحے میں ختم کر دیتی تھی۔ لیکن آج۔ ہاجرہ کو روٹا دیکھا اور اس بری طرح روٹا دیکھا۔ کیسا لگتا تھا انہیں۔؟

وہ یہ توقع لیے گھر میں داخل ہوئے تھے کہ گھر میں خوب رونق لگی ہوگی۔ ہاجرہ بہت مسرور اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوگی۔ ڈھولک پر مندی کے گیت گائے جا رہے ہوں گے۔ مگر بہت محبت سے پاس بیٹھ کر وجہ دریافت کی لیکن ہاجرہ کی سسکیاں رکنے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔ یاسمین الگ پریشان بیٹھی تھیں۔ دوپہر سے سمجھا سمجھا کر بارگئی تھیں۔ تینوں بھائی جو کچھ دیر قبل ہی اکیڈمی سے گھر آئے تھے الگ گم غم کیفیت میں اسے روتے دیکھ رہے تھے۔ احمد رضا پوچھ پوچھ رہا تھا مگر جب ہاجرہ نے کچھ بتا

کر نہیں دیا تو یاسمین کو مختصر ترین الفاظ میں سارا ماجرا سنا پڑا۔ احمد رضا پہلے تو کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہے پھر یکدم ان کا قبضہ بلند ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی تینوں بھائیوں کی بھی دبی دبی ہنسی گونج اٹھی۔ یاسمین بھی مسکراتے لگیں۔ صرف وہی بھی جو آنکھوں میں آنسو لیے شاکی نظروں سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ باپ سے مخاطب ہوئی۔

”مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی ابو۔ مجھے تو یقین تھا کہ آپ۔“ آنسوؤں کا گولہ یکدم حلق میں چسنا تھا اور بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گئی اور احمد رضا کے قہقہے کا گلا ایک لمحے میں گھٹ گیا تھا۔ کیا نہیں تھا اس کے مختصر سے جملے میں۔ یہ ناممکن ہی تھا کہ احمد رضا ہاجرہ کی بات کا متن نہ سمجھ پاتے۔ اس یقین۔ اس اندھے بھروسے کو نہ محسوس کر پاتے جو ایک بیٹی کو ایک باپ پر ہوتا ہے۔ ہاجرہ کو کیسے یہ مان نہ ہوا کہ اس پر جان دینے والا باپ اس کے ایک مسئلے کو جو خود اس کی اپنی نظر میں ہرگز معمولی نہیں تھا، چٹکی بجا کر ختم نہیں کر سکتا۔

چند ہی لمحوں بعد احمد رضا اپنے تیسرے بیٹے کو ساتھ لے کر گھر سے نکل گئے تھے۔ یاسمین نے بے حد تاسف سے شوہر کو باہر جاتے دیکھا تھا جس نے گھر آکر ابھی پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا۔ یاسمین اٹھ کر ہاجرہ کے پاس چلی آئیں۔

”بہت بری بات ہے ہاجرہ۔ دن بھر کا تھکا ہار باپ گھر آیا اور تو نے اپنا رونا ڈال دیا۔ اب وہ بنا کچھ کھائے پیے نکل گیا ہے بازار کی خاک چھانسنے۔ ہے کوئی شے۔“

”ای! ابو کو دیکھ کر مجھے وہ تذلیل پھر سے یاد آگئی تھی۔“ اس کے جواب نے یاسمین کو چپ لگا دی تھی۔ اس کی باتیں تو یوں بھی ان کے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ آج بھی اس کی منطق ان کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ اب پچھتا رہی تھیں کہ انہیں ہاجرہ کے اس ”گڑیا کی شادی“ کے شوق کو پورا

کرنے کی اجازت دینی ہی نہیں چاہیے تھی۔ دوپہر سے گھر کا ماحول سوگوار تھا اس شادی کے معاملے پر۔ ہاجرہ کو جہاں یہ ملال ستانے لگا تھا کہ ناحق باپ کو پریشان کیا، وہاں یہ اطمینان بھی تھا کہ باپ اب اس کا مسئلہ حل کر کے ہی لوٹے گا۔

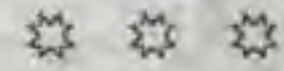
ہاجرہ کی سہیلی نے محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ آکر اس کی گڑیا سے اپنے گڈے کی شادی سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ہاجرہ اپنی گڑیا کو اپنی سہیلی کی حسب منشا چیز نہیں دے سکتی تھی۔ اب اسے جہاں سے جینز ملنے کی امید تھی وہ اپنے گڈے کی شادی وہاں کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کمر پر ہاتھ ٹکا کر بالکل کسی بڑی عورت کی طرح ہاجرہ کو باتیں بھی سنائی تھیں۔ اسے اتنا رنج اس کی باتوں، شادی سے انکار اور جینز کی فرمائش سے نہیں ہوا تھا، جتنا غصہ اور تکلیف اسے اس کی اس بات پر ہوئی تھی کہ ”ویسے تو تم اپنے ابو کی اتنی لاڈلی ہو مگر تمہارے ابو بیٹی کی گڑیا کا معمولی سا جینز بھی نہیں دے سکتے۔“ اسی وقت ہاجرہ نے ارادہ باندھ لیا تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو منہ توڑ جواب دے گی۔ بات اس کے باپ کی عزت پر آگئی تھی اور ہاجرہ کو اپنے باپ کی ذات پر آنے والا حرف کسی طور پر برداشت نہیں تھا۔

قصور ان بچیوں کا بھی نہیں تھا۔ ہوش سنبھالنے پر اپنے آس پاس اپنے گھروں میں انہوں نے شادی بیاہ کے حوالے سے جو مسئلے مسائل اور جس قسم کی باتیں سنی تھیں، وہی باتیں اسی انداز میں انہوں نے ہاجرہ کو بھی سنادی تھیں۔ وہ گئے بڑے۔ تو بیویوں کو بھی اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ وہ اپنی باتوں، رویوں اور خواہشوں سے چھوٹے اور معصوم ذہنوں پر کس طرح منفی اثرات ڈال رہے ہیں۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد احمد رضا گھر واپس آئے۔ اس دوران وہ ایک ہی جگہ بیٹھی ان کا انتظار کرتی رہی تھی۔ جس وقت وہ گھر کی دہلیز عبور کر کے اندر داخل ہو رہے تھے، اس نے ان کے چہرے پر چھائی تھکن اور پریشانی کو نہیں دیکھا تھا وہ ان کے دائیں ہاتھ میں موجود شاپر

کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم چمکدار ہنسی اس کے ہونٹوں پر آگئی تھی وہ دوڑ کر ان کے پاس گئی۔ اسے خوش اور ہنستا ہوا دیکھ کر احمد رضا کا طویل مشقت بھرا دن ڈھل گیا تھا۔

اگلے چند دنوں تک احمد رضا منتظر ہی رہے کہ گھر میں باجرہ کی گڑیا کی شادی کے حوالے سے دوبارہ کوئی رونق میلہ لگے، لیکن ایسا پھر کچھ نہ ہوا۔ اس روز احمد رضا کو باجرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر چند سالوں بعد انہیں اس کی ساری باتیں سمجھ میں آگئی تھیں۔



آنگن میں شام اتر آئی تھی۔ چند مہینوں سے گھر میں جو رونقیں اور چمیلیں تھیں وہ جیسے چراغ کی مدھم لوٹا ہوتی تھیں جسے ہلکی سی پھونک نے بجھا دیا ہو۔ یا سمین ماتھے پہ دوپٹا باندھے کمرے میں تخت پر بیٹھی مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں۔ بار بار اندر آنے والی نمی صاف کر رہی تھیں مگر قراب۔ قرار آکر نہیں دے رہا تھا۔ تیسرے نمبر والا بیٹا پاس بیٹھا تاسف سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کی حالت پر بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے وہ الفاظ بھی نہیں مل رہے تھے جو اس کی ماں کے لیے تسلی اور تسفی کا باعث بن جاتے۔ گھر کی فضا میں خاموشی، اداسی، ویرانی اور وحشت پھیلی ہوئی تھی وہ اسے بھی ختم نہیں کر سکتا تھا۔

آس برسوں کے لوگ دور و قریب کے رشتے داروں میں سے فردا، فردا، لوگ وقفے وقفے سے آرہے تھے اور یا سمین کا کلیجہ اپنے سوالوں کے تیروں سے گھاگل کرتے جارہے تھے۔ یا سمین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگوں کی زبانوں میں اگ آنے والے کانٹوں اور نگاہوں میں در آنے والے تجسس نما تسخرو کو کس طرح برداشت کریں؟ اور جس کی وجہ سے یہ وقت آیا تھا ان پر وہ وجود اپنے کمرے میں بند تھا۔

کیسا عذاب سا عذاب تھا جو ان پر آیا تھا۔ یہ ان

میں سے کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے گھر پر جو قیامت ٹوٹے گی وہ کسی اور کے نہیں، باجرہ کے طفیل ٹوٹے گی۔

بڑی ہو پورے دنوں سے تھی۔ اس کی حالت الگ خراب تھی اس پر گھر میں آنے والا یہ طوفان۔ بڑا اور منجھلا بیٹا گھر میں ٹٹک ہی نہیں رہے تھے نہ جانے گھر سے باہر کس چیز کی تلاش تھی انہیں؟ کیا مل جاتا تھا ان کو؟ یا سمین کو سب سے زیادہ ڈر بھی ان ہی دنوں سے تھا، دنوں غصے کے تیز تھے اور پھر مردوں میں اتنا حوصلہ کہاں ہوتا ہے کہ اپنے گھر کی کسی عورت کا ذکر سرعام سن سکیں۔ دفعنا! انہیں احمد رضا کا خیال آیا تھا۔ چھوٹے بیٹے کو چھت پر دوڑا لیا جا کر اپنے ابو کی تو خبر لو۔ بستر سے ہی لگ گئے ہیں نہ چھوٹا بیٹا سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔ یا سمین ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھنے لگی تھیں کہ سب سے بڑی مندر کی آمد ہوئی۔ یا سمین نے گہری سانس لی اور کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا کہ بوڑھی ہو گئی تھیں مگر آج تک سسرال کے دل میں اپنے لیے گنجائش پیدا نہیں کروا سکی تھیں جس عداوت اور عناد کا بیج ان کی مرحومہ ساس نے بویا تھا اس کی جڑیں ان کی اولاد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مند صاحبہ نے آتے ہی پہلے تو جی بھر کے بین ڈالے۔ خوب سرپیٹا۔ اتنا رو میں دھاڑیں کہ ان کا دواویلا سن کر احمد رضا بہ نفس نیچے چلے آئے۔

”ارے کیسی مصیبت سر پہ آن پڑی میرے بچے کے۔“ لاڈلے بھائی کو دیکھا تو جذبات میں مزید شدت آگئی۔ احمد رضا سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ یوں بھی اب ان کا سر کبھی نہیں اٹھاتا تھا۔

”کہاں ہے وہ آفت کی پرکال۔ کروں تو میں اس کا دماغ درست۔“ اب تو یوں کا رخ باجرہ کی جانب تھا۔ ”دیکھ لیا احمد رضا لاڈلے کا انجام۔ اسی دن کے ڈر سے تمہیں سمجھاتے تھے کہ نہ چڑھاؤ بیٹی کو اتنا سسر۔ ایسی لاڈلوں پلی ہی عزت کو بٹا لگاتی ہیں۔ اوپر سے کلج تک بڑھالیا۔ یہ ہی نتیجہ نکلا ہے اس مولیٰ انگریزی تعلیم کا۔“ فرد جرم تھے کہ بڑھتے ہی جارہے تھے۔

”کیسا صاف انکار کرو یا شادی سے۔ وہ بھی مایوں بیٹھے سے دو دن پہلے۔ غضب خدا کا ایسی جرات۔ ایسی دیدہ دلیری۔ ہمارے خاندان میں کسی لڑکی تو چھوڑا غیر خاندان کے کسی لڑکے کی بھی ایسی بے شرمی نہ دیکھی نہ سنی۔ توبہ توبہ۔“ انہوں نے گلے پیٹے۔

”جس ڈھٹائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ اس چھٹانک بھر کی لڑکی نے کیا ہے؟ میں پوچھتی ہوں کہ باپ داوا کے سر میں خاک ڈال کر اب کس کو نے کھدرے میں چھپی بیٹھی ہے۔ جس یار نے اتنی ہمت دلائی وہ اب سامنے کیوں نہیں آتا؟“

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپا؟“ احمد رضا ان کے آخری جملے پر تڑپ سے گئے۔

”کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔ جوان جہان لڑکی میں اتنی جرات کب آتی ہے بھلا؟ تب ہی نا جب کسی نے اسے سبزیاں دکھائے ہوتے ہیں۔“ وہ چمک کر بولیں۔ ”کاج جاتی تھی یہ کیسے ناممکن ہے کہ اس کا کہیں نین نہکانہ چل پڑا ہو۔“ احمد رضا نے مدد طلب نظروں سے یا سمین کو دیکھا جو خود نگاہیں چرا رہی تھیں۔

”پھر بھی کیا۔“ احمد رضا نے کمزور سے لہجے میں بیٹی کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

”یہ سب میں نہیں کہہ رہی احمد رضا۔ یہ باتیں ساری دنیا کر رہی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ گہری ہوئی باتیں گندے اندازے۔ اور لوگوں کو ایسا موقع دیا کس نے ہے؟ لڑکی جب اپنے سسرال والوں کے سامنے عین مایوں سے دو دن پہلے شادی سے صاف انکار کرے گی تو لوگ تو ایسی باتیں کریں گے ہی۔“ انہوں نے وضاحت کی تھی یا تو بیہوش احمد رضا فیصلہ نہیں کر سکتے۔

”جو کچھ بھی کہنا ہے مجھ سے کہیں، ابو سے بات نہ کریں۔“ یکدم ایک پاٹ دار آواز آئی۔ یا سمین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ احمد رضا کی بڑی بہن بھونچکی رہ گئی تھیں۔ احمد رضا نے البتہ سر نہیں اٹھایا تھا۔ وہ یا سمین سے مخاطب ہوئے۔

”میں سے کہو کہ اندر جائے۔ بہت برداشت کر رہا

ہوں۔ نہ آزمائے یہ میرے صبر و حوصلے کو اتنا کہ جسے کبھی پھول کی ہنکھٹیوں سے نہیں چھوا، آج اس پر ہاتھ اٹھاؤں۔“ کپکپاتی آواز، بھیگا لہجہ ”زندہ درگور تو کر رہی دیا ہے اس نے مجھے اور اب۔“ وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔

”ابو۔ خدارا ایسا مت کہیں۔ ایسا مت سوچیں۔“

”کیوں نہ کہے ایسا؟ جس باپ کی تجھ جیسی بے دید اور نامراد بیٹی ہوگی وہ تو پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر لٹک جائے گا۔“ احمد رضا کی بڑی بہن نے مزید گل افشانی کی۔

”باپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا بیٹی نہیں ڈالتی۔ یہ کام دنیا والے کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بیٹی تو باپ کو ذلت اور مجبوری کی صلیب پر چڑھنے سے بچا رہی ہے۔“ بے حد جھپٹتے ہوئے لہجے میں اس نے جواب دیا۔

”ابو! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے آپ کو زندہ درگور ہونے سے بچانے کے لیے انکار کیا تھا، اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں۔“ وہ ریو ہانسی ہو گئی۔ یہ بات اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ باپ اس کی شکل تک نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے ہرگز کسی بات سے تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ نہ ہمدردی کی آڑ میں اپنے تجسس کی تسکین کرنے آنے والے لوگوں پر۔ نہ ان کے سوالوں پر اور نہ ہی ان کے اندازوں پر اور نہ ہی آن کی آن میں اپنی ذات کے متنازعہ بن جانے اور معتبہ بھرائے جانے پر۔

دو دن ہو گئے تھے اسے اپنے کمرے میں بند ہوئے۔ ہر وقت واری صدقے جاتی ماں، جان بچھاؤ کرنے والے بھائی، بڑی بہن جیسی بھابھی اور سر پر کسی تاج کی طرح سجا کر پھرنے والے باپ میں سے کسی نے اس کے کمرے میں جھانک کر تنگ نہیں دیکھا تھا۔ ابتدائی لعن طعن کرنے کے بعد کوئی اس سے مخاطب نہیں ہو رہا تھا۔ ہر آئے گئے کے سوالوں، باتوں اور حیرت انگیز فقروں کو وہ سن رہی تھی۔ نظریں

جھکا کر۔ نیچی آواز میں اپنی ماں اور بھائیوں کے وضاحتی جملے بھی اس کے کانوں میں پڑتے رہے تھے۔ اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ وہ سب شرمندہ ہیں بلکہ شرمندگی، ذلت، رسوائی تو بہت ہی معمولی الفاظ تھے اس ایک چیز کے لیے جو وہ سب محسوس کر رہے تھے اور جس کا سبب اس کی اپنی ذات تھی۔

جس لڑکی نے ماہوں بیٹھنے سے محض دو دن پہلے اپنے سسرال والوں کے سامنے دو ٹوک اور بے جگ انداز میں شادی سے انکار کر دیا ہو، جیڑ کا وہ سامان بھی واپس منگوا لیا ہو، جو اس کے باپ اور بھائی چار دن پہلے ہی اس کے سسرال چھوڑ کر آئے ہو۔ اس لڑکی کی دماغی حالت اور کردار کے بارے میں چہ گوینیاں کیسے نہ ہوتیں؟ اس کے باوجود وہ بے حد مطمئن تھی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“ ہر بار وہ خود کو یہی کہہ کر دلاسا دیتی رہی تھی۔

”تم نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔ تم میری اولاد ہو۔ وہ اولاد جس سے عشق کیا تھا میں نے۔ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا تھا، مگر تم۔ تم ویسی بیٹی نہیں ہو۔ دل نہیں دکھایا باجرہ تم نے۔ دل دکھا ہوتا تو یہ سب نہ کہتا۔ تم نے تو مجھے۔“ آنسوؤں سے روتے ہوئے احمد رضا کہہ رہے تھے۔

”میں تو تمہیں بددعا بھی نہیں دے سکتا۔ صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ اس سے کہو، اپنے ماں باپ کو بھیجے۔ میں اس سے تمہاری شادی جلد از جلد کرونا چاہتا ہوں۔“ چند ہی لمحوں میں احمد رضا نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی بہن کے ایک ”امکان“ پر نہ صرف غور کر لیا تھا بلکہ اسے ”حقیقت“ بھی تسلیم کر لیا تھا۔

ہاجرہ بے یقینی سے باپ کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ماں کو دیکھا۔ کبھی ماں بھی اولاد کو بے یارو مددگار چھوڑتی ہے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار یہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی پچھو کو دیکھا، جو بے حد جلتا ہی ہوئی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

وہ ذہین تھی۔ بے حد ذہین۔ اور اسے بہت ہی خوش فہمیاں بھی تھیں۔ اسے یہ گمان بھی تھا کہ وہ ”انسان“ تھی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے کی پوری صلاحیت اور اہلیت رکھنے والی انسان۔ اسے یہ گمان دلایا بھی کس نے تھا؟ والدین اور بھائیوں نے۔ اسے ایک مضبوط اور پر اعتماد انسان والدین نے ہی بنایا تھا۔ ان کی پرورش نے۔ پھر شخصیت سازی میں جو کئی بیشی رہ گئی تھی، وہ تعلیم نے پوری کر دی تھی۔ اسے شعور دیا تھا۔ لیکن ایک لمحہ۔ محض ایک لمحہ لگا تھا اور اس کی ساری خوش فہمیاں ختم ہو گئی تھیں۔

اس ایک لمحے نے اس پر منکشف کیا تھا کہ وہ ”انسان“ نہیں، ایک ”لڑکی“ ہی، جسے ہر حال اس معاشرے میں فیصلے کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا بس یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں ہونے والے فیصلوں پر صرف سر جھکائے اور نیک پار سا اور پاکیزہ ہونے کا ثبوت دے۔ چاہے دنیا والے اسی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے کسی بازاری کی کسی دکان میں سجا کوئی شوپیس سمجھ کر اس کے بارے میں مول تول کریں۔ بولیاں لگائیں مگر وہ کسی کو ایسا اختیار دینے پر تیار نہیں تھی۔ اس ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کیا تھا اور اب۔ اب بات ایک بار پھر باپ کی عزت کی آگئی تھی۔

”پچھو! آپ کو اپنے بھائی اور خاندان کی خاک ہوتی عزت کا بہت خیال ہے نا؟“ اس نے اپنے چہرے پر پھیلی کمی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ لہجہ بلا کا صاف اور کٹ دار تھا۔ ”تو پھر اب اس عزت کو بحال بھی آپ ہی کریں۔“

پچھو استغابہ نظروں سے اسے گھورنے لگیں۔ یاسمین نے یکدم اپنا دل تھما، وہ اب کیا کرنے والی تھی۔

”میرے لیے رشتہ آپ ڈھونڈیں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکیں تو پھر میرے باپ کو تماشا بنانے بھی مت آئیے گا۔“ وہ کہہ

کر نہایت اطمینان سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔
پچھو پچا بکا ”سر پھری“ کو جاتے دیکھتی رہیں۔
یا سمین کی شرمندگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور احمد رضا۔ احمد رضا نے ان دونوں میں پہلی بار اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی وہ جانتے تھے، لیکن وہ کیا چاہتی ہے۔ یہ شاید وہ کبھی سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

احمد رضا پنڈال میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان بیٹھے تھے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ پچاس بادن کے قریب مرد مہمانوں کے درمیان بیٹھے احمد رضا بے حد مطمئن تھے۔ چند مہینوں سے وہ جن دھڑکوں، واہموں اور اندیشوں کے ساتھ مل جل کر مرتے جیتے کی سی کیفیت میں مبتلا تھے وہ نکاح خواں کے نکاح پڑھاتے ہی ختم ہو گئے تھے۔ چند مہینوں سے ان کے جان پہچان رشتے دار اور محلے والوں نے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا اور جن کے بارے میں ہاجرہ نے ان سے کہا تھا۔
”ہو! لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے یا یوں کہہ لیں کہ لوگوں کو چٹخاروں کے لیے ہر دوسرے دن ایک نیا قصہ چاہیے ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی باتوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی کہ ان کے ڈر سے انسان اپنی زندگی عذاب میں ڈال لے۔“

آج واقعی وہی سب وہاں موجود تھے، انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا، وہ سب کچھ فراموش کیے انہیں اتنے عمدہ انتظامات پر سہرا رہے تھے۔ مبارک باد دے رہے تھے، حالانکہ ہاجرہ نے انہیں کچھ بھی کرنے نہیں دیا تھا اور اس کی خواہش کے مطابق علاقے کے ایک نسبتاً ”چھوٹے میدان میں شامیانہ لگا کر مرد و خواتین کے لیے علیحدہ نشستوں کا سامان کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ باراتیوں اور دلہن والوں کے سمیت کل سوا سو کے قریب افراد تھے کھانے میں بھی اسراف سے اجتناب برنا گیا تھا اور تو اور ہاجرہ نے اپنی

سسرال والوں کو بری وغیرہ کے اہتمام سے روک رکھا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں تاکہ میں عزت سے اپنے گھر رخصت ہو جاؤں تو پھر میں جیسا کہہ رہی ہوں بالکل ویسا ہی کریں۔“ ہاجرہ نے ان کے ہر اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔

”آپ کو ہاجرہ بلارہی ہے۔“ یا سمین نے محلے کے ایک بچے کے توسط انہیں پیغام بھجوایا۔ وہ یکدم اٹھ کر اس جانب چل پڑے، جہاں قاتیں لگا کر مکمل پردے میں دلہن بنی ہاجرہ بیٹھی تھی۔ یا سمین بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

”کیا بات ہے؟“ بے حد گھبرائے ہوئے انداز انہوں نے یا سمین سے پوچھا۔ یک بہ یک ماضی کا ایک منظر انہیں یاد آ گیا تھا۔ ”جو لڑکی بایوں سے دو روز قبل۔“ احمد رضا کو لگا تھا کہ نکاح ہو جانے کے باوجود کوئی تلواریں ان کے سر پر ابھی بھی لٹک رہی ہے۔
”ہاجرہ کچھ کہنا چاہتی ہے آپ سے۔“ یا سمین نے جیسے سے کہا۔

”ہاں کہو۔“ احمد رضا نے کہتے ہوئے تھوک نگلا۔
”ہو! آپ کو یاد ہے۔“ ہاجرہ نے سر جھکائے ہوئے کہنا شروع کیا۔ لہجہ بھیجا ہوا تھا۔ ”سالوں پہلے میری گڑیا کی شادی ہوئی تھی۔ اس شام جب آپ گھر آئے تھے تو میں آپ کو روٹی ہوئی نظر آئی تھی۔“ احمد رضا حیران نظریں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ شام انہیں یاد آگئی تھی مگر اس شام کا آج کیا ذکر۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ہاجرہ ان کے تاثرات سے انجان بولتی جا رہی تھی۔

”اس کے بعد بھی میں نے اپنی گڑیا کی شادی اپنی سہیلی کے گڈے سے نہیں کی تھی۔ پتا ہے کیوں ابو؟“ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ احمد رضا گنگ ہو گئے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جس نے احمد رضا کے تن بدن میں سنسنی دوڑا دی تھی۔
”کیوں کہ میری سہیلی لالچی تھی۔ پلاسٹک کے چہ

برتنوں سے کھلونوں اور کھانے بننے کی چیزوں کی ہی سی۔ لیکن لالچی تھی۔ اور لالچ کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے مگر وہ بے نیاز بولتی گئی۔

”آپ نے میرے لیے اپنی ہڈیاں ریت کرتے ہوئے جو کچھ جوڑا تھا وہ لوگ اس سب چیزوں کے قدر دان نہیں تھے۔ میں نے اپنی گڑیا لالچی لوگوں کو نہیں دی، مگر آپ نے اپنی گڑیا کے لیے لالچی لوگوں کا ہی انتخاب کیا تھا۔ وہ آپ کی بیٹی کو بیاہنے نہیں آرہے تھے ابو! وہ آپ کی اپنی بیٹی کے لیے بے حد حساب محبت کی قیمت وصول کرنے آرہے تھے۔ وہ تین بھائیوں سے ان کی اکلوتی لاڈلی بہن کا تادان طلب کر رہے تھے۔ اپنی حیثیت کا سب کچھ دینے کے باوجود بایوں سے دو روز قبل وہ ایک نئی فرمائش لیے چلے آئے تھے۔ ابو! آپ اپنا سب کچھ بیچ کر وہ فرمائش پوری کر دیتے۔ مجھے ان کے گھر رخصت کر دیتے پھر بھی میری آئندہ زندگی کی خوشیوں کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے۔ آپ اور بھائیوں کا سران کے آگے ہمیشہ جھکا رہا تھا۔“ وہ اب ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔
”ابو! آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ بیٹیاں جنت کا دروازہ ہوتی ہیں، مگر ابو جنت کا دروازہ بیٹیوں کی اعلا پرورش سے کھلتا ہے، عمدہ اور مہنگے جینز سے نہیں۔“

یا سمین نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا اور احمد رضا۔ تو ملنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اللہ نے کیسا انعام دیا تھا انہیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر روتے ہوئے تیزی سے باہر چلے گئے۔
احمد رضا کی گڑیا۔ احمد رضا کا فخر تھی ان کے سر کا تاج۔ اس نے ان کا سر جھکنے نہیں دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ساری باتیں ہاجرہ نے ان کے دل میں اپنے لیے ناراضی کو ختم کرنے کے لیے بالآخر بتا دی تھیں جو وہ شاید ہمیشہ خود تک محدود رکھتی۔

احمد رضا کی گڑیا نے کیسا سبق انہیں سکھایا تھا۔ ”رضیا اور دنیا کی باتوں کے خوف سے لڑکیاں رسوم و

رواج کی سولی چڑھ جاتی ہیں، خود کو رو لیتی ہیں، والدین کی زندگیاں جسم بننے دیتھتی رہتی ہیں مکرہت اور حوصلے سے کسی غلط فعل کے خلاف ڈٹ کر کھڑی نہیں ہوتی ہیں۔ وہ غلط کرتی ہیں۔“

احمد رضا نے اپنی گڑیا کو ایک کونے میں کھڑے ہو کر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ جسے اس وقت اس کی ساس اور مندریں بے حد محبت سے گاڑی میں بٹھارہی تھیں جبکہ اس کا دلہما احترام بھری نگاہوں سے نئی نویلی دلہن کو دیکھ رہا تھا۔

”کون کتنا ہے کہ نیک اور اچھے لوگوں کے قدردان نہیں ہوتے؟ جن کو دنیا کا ڈر نہیں ہوتا صرف اللہ کا ڈر ہوتا ہے، اللہ انہیں کبھی رسوا نہیں ہونے دیتا۔ اپنے والدین کی عزت، محبت اور لازوال خوشی کا پاس رکھنے والے ہیرے کو اللہ کبھی مٹی میں رکنے نہیں دیتا۔“ احمد رضا غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنی گڑیا کو رخصت کرنے آگے بڑھ گئے۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوشحالت ماحول

سایہ خوں لالچی

راحہ حیات



قیمت - 300/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر: 32735021

37، انداز بازار، کراچی

سیرتِ حسنہ

اپنی عادت کے برعکس عید کی نماز پڑھ کے آئی تو دروازہ بند نہیں کیا۔ چوری کا ڈر نہ چکاری کا۔ آج تو امید اور آس ہی تھی۔ دروازہ کھلے اور قدموں کی چاپ سنائی دے۔

سرٹلی بدھردھیسی سی آواز۔
”باجی! یہ گوشت رکھ لیں۔ اماں نے بھجوا دیا ہے۔“

لیکن۔ نہیں۔
اس نے رات کی چائے گول کر دی تھی۔ چلو بھر دودھ تو بیچ ہی گیا تھا۔ کچھ صبح کی چائے کا دودھ۔ آج اس نے خوب عیاشی کا سوچا اور دودھ جی کے دو گنا بنا کے ایک خود پیا اور ایک اماں کے حوالے کیا۔ رضیہ اور نجمہ لپچاتی نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔ اس نے پرواہی نہ کی۔

عید گاہ سے واپسی پر گلیوں میں وہ جانور ذبح ہوتے تو دیکھ ہی رہی تھی۔ کئی جگہ پر رٹے میں سبزی رانیں بھی نظر آئیں۔ اپنی غریب بے بسی اور کم مائیگی پر دل میں ہوک سی اٹھی اور آنکھوں کے راستے بسہ نکلی۔ آنسو پونچھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی اور ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔

”غریب، نفس پر بھی قابو پاسکتا ہے۔ لذتوں سے بھی مٹہ موڑ سکتا ہے۔ کیا یہ اس کی غریب کی سزا ہے۔“ ابا تو گول گپوں کا ٹھیلا لے کر کب کا عید گاہ کی طرف جا چکا تھا۔ اماں کے آگے اس نے اپنا سوال

رکھا۔
اماں اپنے مخصوص دھیسے لہجے میں بولیں۔
”بھیا! اللہ کی شان بڑی نرالی ہے۔ یہ شک کے کانٹے بیچ میں مت لایا کرو۔ شک کفر کی طرف لے جاتا ہے۔“

”مر اماں! امیر خطا کار ہو کر بھی ان سب چیزوں سے فائدہ اٹھائے اور غریب بندگی کر کر کے بھی محروم رہے؟“

”اماں مسکرائیں۔ شینہ کو یوں لگا اماں کے تعجب کا نور مسکراہٹ میں ڈھل کر چاروں اور پھیل گیا ہے۔ اماں نے بس ایک ہی بات کی۔

”ہم تو صبر کریں گے۔ محروم ہیں۔ اللہ نے ہمارے مقدر میں نہیں لکھا، پر راضی رہنا ہمارا اجر بن جائے گا۔ لیکن تمورانی! یہ تو سوچو کہ وہ امیر جو آج تین تین بکرے اور سالم گائے ذبح کرے گا وہ تنکے، بریانی، سامنے رکھ کر بھی نہیں کھا سکے گا۔ اس کا صبر زیادہ مشکل نہیں ہو گا؟ چیز موجود ہو۔ لیکن کولیسٹرول، بلڈ پریشر جیسے روگ ڈراؤرا کر ایک بولی تنک نہیں چکھنے دس گے۔ محروم وہ ہوئے کہ ہم؟“ اب اماں نے سوال کی گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔

”ہائیں! شینہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ وہ چیخ کر بولی اور پھر اپنی امی کی گود میں گھس گئی دو سال کی چچی بن کر۔
”ہائے اللہ جی! آپ کتنے اچھے ہیں۔“

اسے یہ سوچ کر مزہ آ رہا تھا کہ امیر لوگ بھی محروم رہیں گے، سب بھرن بھرن کے کھانے سے۔ ابھی ان ہی سوجوں میں ملن بھی کہ ایک بچے کی آواز نے واپس اسی دنیا میں لا کھڑا کیا۔
”باجی! یہ لو قریبی کا گوشت۔ گائے میں حصہ ڈالا تھا۔“ پلیٹ کے بجائے وہ شاپر شینہ کے ہاتھ میں تھما کر یہ جاوہ جا۔

شینہ نے شاپر میں سے گوشت نکالا۔
ایک بڑی اور چھوٹی سی بولی کو موٹی سی چربی نے یوں چھپایا ہوا تھا کہ جیسے منگانی اور بے حیائی نے لوگوں کو قابو کر رکھا ہو۔ شینہ کا دل بچھ کر رہ گیا۔
اب اس آدھی چھٹانک کی بولی کو کون پکائے؟ اس نے بولی جا کر کچن میں رکھ دی۔ پروس میں مرزا صاحب کے حالات تو ان ہی جیسے تھے ایک وقت



پیٹ میں جاتا تو دو وقت کی فکر ہی سر پر مسلط رہتی۔ لیکن انہوں نے بیٹے کو درکشاپ میں ڈلوادیا تھا۔ کچھ نہ کچھ لگی بندھی آئی ہی تھی۔ اس دفعہ انہوں نے بھی گائے میں حصہ ڈالا تھا اور رضیہ، ثمنہ، نجمہ تینوں اندازے لگا رہی تھیں دیوار کے اس پار۔ بریانی کا سالانہ رہا ہے یا کبابوں کا۔ چھوٹا بھائی فرحان کھیلتا کھیلتا اندر آیا۔

”نہ بریانی نہ کباب۔ فاخرہ آئی تگے بنا رہی ہیں۔“

”تگے۔“ رضیہ چیخی۔

”ثمنہ باجی! تگے کیسے بنتے ہیں؟“

”مجھے کیا پتا میں تو جیسے تگے اور کو فٹے بناتی رہتی ہوں۔“ اس نے اپنی دوست کے ہاں ایک دفعہ کو فٹے کھائے تھے۔ مانو! جیسے منہ میں اب تک ذائقہ گھلا ہوا ہو۔ گھنٹہ بھر وہ تینوں گوشت کی بنی ان ڈشوں پر تبصرے کرتی رہیں جو وہ کبھی کھا چکی تھیں یا دیکھ چکی تھیں۔

”آئی! میری کلاس فیلو چلی کباب بھی لاتی ہے اور کیچپ ڈال ڈال کر کھاتی ہے۔ پتا نہیں ان کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟“ نجمہ نے سوال کیا۔

”پچلو! اٹھو! ماسی الفت کو دیکھو۔ وہ کیا لے کر آئی ہے؟“

تینوں کی نظر سامنے والی ماسی الفت کے ہاتھوں پر تھی۔

ایک پلیٹ میں گوشت والے چاول تھے۔ دوسری میں گوشت، سبزیوں تو کم تھیں۔ البتہ چربی کافی تھی۔ پلیٹیں دھودھلا کرواپس کیں تو تینوں چاولوں پر ٹوٹ پڑیں۔ دو دو لقمے بھی نہ کھائے کہ پلیٹ ختم۔

”آئی! جس چیز میں گوشت ڈال جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ اتنا مزے کا کیوں ہو جاتا ہے؟“ نجمہ نے پھر سوال دہرایا۔

”تم سوال اپنے پاس رکھو اور جلدی سے لہسن پیاز لاؤ۔ صبح والی بونی اور یہ والا گوشت ملا کر شوربہ بنالیتے ہیں۔ ابا آئے والے ہیں۔ آج تو بغیر ناشتے کے ہی چلے گئے تھے۔“

رضیہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ نجمہ لہسن پیاز کاٹنے میں مصروف تھی اور ثمنہ گوشت دھو کر چربی الگ کر رہی تھی۔ لیکن تینوں ایک ہی سوچ میں مگن تھیں۔ کیا کبھی ان کے گھر میں قربانی کا جانور بندھ سکتا ہے۔

کیا ان کے ابا بھی کبھی رب کی رضا کے لیے قربانی کا جانور خرید سکتے ہیں۔

”اگر ایسے ہو تو میں اس دن اپنی ساری حسرت پوری کروں گی۔ کڑھائی گوشت، بریانی، چائیں، سارا گوشت الگ الگ کروا کے ہر چیز بناؤں گی۔“ ثمنہ نے اعلان کیا۔

☆ ☆ ☆

ابا کے گول ہپوں کی ریڑھی جہاں پر لگتی تھی وہ کسی لائق صاحب کی سائیکلوں کی مرمت کی دکان تھی۔ ابا ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ بہت ٹیک دل اور انسان دوست بندہ ہے۔

اس بقر عید پر کلو بھر گوشت کا شاپر تھماتے ہوئے ابا کے کان میں سرگوشی کی۔

”آج رات ہم لوگ آپ کے گھر آئیں گے۔“

”ضرور ضرور۔“ ہاتھ تلک سسی دل کے بڑے کھلے تھے ابا۔

”آپ کی شرافت اور ایمان داری کا گھر میں اکثر تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ میری گھر والی اکثر بیمار رہتی ہے۔

اب تو اس کے گئے گوڑے جواب دے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں نے بھی مایوسی ظاہر کر دی ہے۔ گھر میں دو بیٹے ہیں، میری بوڑھی اماں۔ آپ نے میرا عتیق پتر تو دیکھا بھی ہے۔ اپنی دامادی میں لے لیں تو ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“

ابا تو کم صم ان کی شکل ہی دیکھتے رہے۔ عتیق بھی ان کا دیکھا بھالا تھا۔ خاموش طبع مملنسار۔ اکثر مینہ آندھی میں ان کا ٹھیلہ اندر کر دیتا۔

شام ڈھلے لیتق صاحب کا قافلہ ان کے غریب خانے آیا اور وہ غریب خانہ خوشیوں کی بھرمار سے

دولت کدہ بن گیا۔ وہ مٹھائی، میٹھ، پلاؤ، کباب ساتھ لائے تھا۔ ثمنہ نے کلو گوشت جو ابا نے پکڑ لیا تھا، شوربے والا بنا لیا تھا۔ ساتھ میں اس نے اپنی بچتوں کو خرچ کر کے دوڑھ بھرنیوں۔ سلا درائت۔

اچھا سادہ عیت کا سالانہ ہوا۔ آج بار بار ابا کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔

اماں بھی بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ ثمنہ بار بار سوچ رہی تھی۔

”کیا دولت گھر کے دکھوں کو قہقہوں میں بدل دیتی ہے۔“

جاتے جاتے ہزار کانٹ ہاتھ پر رکھ کے صرف رشتہ ناتا ملے ہوئے کا اعلان نہیں کیا۔ بلکہ ریح الاول کی نو تارخ گوشتادی کا عندیہ بھی دے دیا۔

مہمانوں کی رخصتی کے بعد گھر کا ہر فرد ہلکا پھلکا تھا۔ ابا سے بار بار پیار کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ریح الاول کی نو بھی آگئی۔ ثمنہ عتیق کی امانت بن کر رخصت ہو گئی۔ ابا نے اس کا ہاتھ عتیق کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بس اتنا کہا۔

”غریب ضرور گھر میں دیکھی میری بچیوں نے۔ لیکن میں نے ان کی تربیت شہزادیوں کی سی کی ہے۔“

لئے گھرنے لوگ نئے طور طریقے۔ اگلے سات آٹھ ماہ گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور بقر عید کا چاند نظر آ گیا۔ ثمنہ میٹھ لگی۔ بہنیں بار بار پوچھ رہی تھیں۔

”آئی! قربانی تو تمہارے سسرال والے کرتے ہی ہیں۔ اس دنہ اپنی مرضی سے خوب ڈشیں بنانا۔ ہم بھی آئیں گے۔ کچھ میٹھ کے کباب کھانے۔“

ثمنہ مسکراتی رہی۔ کہا کچھ نہیں۔ بقر عید کے دن گائے کا گوشت پہلے آ گیا۔ بکرا بعد میں ذبح ہوا۔ ثمنہ کے لیے اس کی زندگی کا یہ ایسا منظر تھا جو بچپن سے آنکھوں کے راستے دل و دماغ میں جم چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے سامنے گوشت کا ڈھیر ہوا۔ اور وہ چائیں الگ کرے۔

قیے کا گوشت الگ۔

پسندے سب کو پسند۔ اور کھڑے سالے کے گوشت کے لیے وہ سینے کا گوشت الگ کرے۔

آج وہ موقع آ گیا تھا۔ رضیہ اور نجمہ بھی امی کے ساتھ عید ملنے آئی تھیں۔

اتنا بڑا گوشت کا ڈھیر دیکھ کر ثمنہ بار بار آنکھوں کا پانی صاف کر رہی تھی۔

پھر سب نے دیکھا۔ اس نے ہاتھ مار کے الگ کیے گوشت کے حصوں کو اکٹھا کر دیا۔ پلیٹیں بھر بھر کے وہ محروموں اور منتظر کو بھجواتی رہی۔

”آئی! یہ تو سارا ہی بانٹ دیا۔ آپ نے تو رکھا ہی نہیں۔ اب ان بوٹیوں سے کیا بنا میں گی؟“

گوشت کی چند بچی بچی بوٹیوں کو دیکھ کر وہ ہکا بکا تھیں۔ ان کے حصے کا گوشت من کے محلے کے غریبوں کے لیے وہ پہلے پکڑا چکی تھی۔ اور اب اس کے آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم یہ نہ سمجھنا کہ میں گوشت سارا تقسیم ہونے پر رو رہی ہوں۔ میں تو اس لیے رو رہی ہوں ڈینے والوں نے تو اپنا صلح فرماں بردار بیٹا اللہ کو دیا تھا۔ یہ تو چند بوٹیاں ہیں۔ پتا نہیں اللہ نے قبول کیں یا نہیں؟“ ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”کہاں جیتا جاگتا بڑھاپے میں ملا بچہ۔ آنکھوں کا نور، دل کا سرور اور کہاں یہ چند بوٹیاں۔“ بھل بھل اس کے آنسو بہ رہے تھے۔

اس لمحے عتیق اندر آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا سارا کمر ان دیکھی روشنی سے بھرا ہوا ہے۔

تقویٰ کی روشنی۔ ایمان اور اطاعت کے ساتھ ساتھ مستی کی روشنی!!

کیرے گھر کی



آہ جھروکے کیوں کھڑی رہی لاڈو
کیا تیرا من پچھتائے رہے
اک پچھتاوا یہ کروں رہی اماں
میں گوری ساس کے جائے سانورے
آج تین دن سے گھر میں ڈھولک کھڑک رہی
تھی۔ شام ہوتے ہی جانے کہاں سے لڑکیاں قافلے کی
صورت نمودار ہوتیں پھر ہنسی قمقمے ڈھولک کی ڈھم
ڈھم۔ کان پڑی سنائی نہ دیتی۔

جنید میاں نے بھلا یہ شور شرابا یہ ہنگامہ کب دیکھا
یا سنا تھا۔ گیارہ سال کے بعد پاکستان آئے تھے۔ زچ ہو
گئے۔ بقول چچی جان کے ان کو اسی لیے اوپر کا کمرادیا گیا
تھا کہ شور سے پریشان نہ ہو جائیں۔ لیکن آوازیں ہوا
کے دوش پر لہرائی کھڑکی سے روشن دان سے کمرے
میں پہنچ جاتیں۔ کھڑکی بند روشن دان بند۔ مگر جھروں
کے یا درازوں کے ذریعے سفر کرتی جنید میاں کی
سماعت میں گنگنائیں۔ رات کے وقت کہیں جا بھی
نہیں سکتے تھے کسی سے واقفیت نہ تھی۔ راستے بھی
انہوں نے سچا جان نے یہ وسیع و عریض کوٹھی یا بچ چھ
سال پہلے خریدی تھی۔ ورنہ پرانا آبائی مکان جو گنجان
محلے میں تھا۔ جنید میاں وہاں کے راستوں سے واقف
تھے لوگوں سے کچھ جان پہچان بھی تھی۔ لیکن یہ
علامت ان کے لیے قطعاً نیا تھا۔

گلانے والی آج نئی آواز تھی اور کئی آوازیں مل کر
میں بلکہ ایک ہی سرپلی لے میں گارہی تھی۔ سمجھ
میں بھی آ رہا تھا کہ وہ کیا گارہی ہے جبکہ سب مل کر تو
سوائے شور کے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لو بھئی۔ لاڈو کو
تو ساس کے بیٹے کا سانولا ہونا ہی پسند نہ تھا۔ جبکہ یہاں
تو ہر سانولے یا کالے مرد کے لیے گوری دلہن ہی درکار
تھی۔ یہ شکوہ بھی اپنی جگہ خاصا اہم تھا۔ گلانے والی کی
آواز میں سرپلا این تھا اور اس طرز کا اتار چڑھاؤ قابل

سماعت تھا۔ کوئی نئی آواز تھی۔

”یہ پچھتاوا مت کرو ری بیٹی! اماں گوری ابا
سانورے“

چلو جی۔ اماں نے تو گل مکاوی۔ واہ کیا مزے دار
مکالمہ تھا۔ جنید میاں نے کھڑکی پاٹوں پاٹ کھول دی۔
ڈھولک کی آواز بھی دھیمی تھی۔ اس لیے الفاظ صاف
سمجھ میں آ رہے تھے۔

”آہ جھروکے کیوں کھڑی رہی مندی!“

کیا تیرا من پچھتائے رہے۔“

اب بھابھی مند کو آہ تلے کھڑی اداس دکھائی دی
تھیں۔ وہی سوال وہی جواب۔

”اک پچھتاوا یہ کروں رہی بھابھی!“

میں گوری ساس کے جائے سانورے۔“

”یہ پچھتاوا مت کرو ری مندی!“

بھابھی گوری بھیا سانورے۔“



وہی پچھتاوا۔ وہی تسلی اور ہائے بے چاری گوری حسینہ۔ چچی خالہ مائی پھوپھی سب نے یہی تسلی دی۔ ایک ہی جواب۔

”اے بے سارے مرد کیا ویسٹ اینڈ سے لائے گئے تھے۔“ کسی نے ہنسی میں مذاق میں اعتراض جڑ دیا۔

اس کے بعد گانے والی کی آواز کی تعریفیں شروع ہوئیں۔ گانا بھی پسند کیا گیا۔ قہقہے تو تھے ہی۔ ”سمانہ! کوئی اور پھر کتا ہوا گانا سنا۔“ فرمائش۔

”اچھا سنئے!“

”گنگنا لے دو جان گنگنا لے دو جان“

”پاپا تلی گوری بیاں رے“

”گڑکی فرمائش کر رہی ہے میاں سے کہ اسے ایک کنکن دلا دے۔ وہ گوری ہے اور تلی تلی بائیں ہیں۔ سونی بائیں کنکن سے جیتی ہیں۔“ گانے والی خود تشریح کر رہی تھی۔

”اب آگے سنئے!“

”سساس کو ہو گیانز لہ“

”مندی کو بخار بالی کو بخار“

”سیاں کو ہو گیانز توندارے“

”باز کا بھلا جوان“ سیاں کو کیا ملا؟ پڑوسن؟ جی جی نہ تو اور کیا ہو گا۔ پڑوسن کے لیے بندھے سیاں جی۔ پتلی گوری یا نہیں کنکن کو ترستی رہ گئیں۔

”ہائے ہائے منہ جلی پڑوسن خاک پڑے کبخت۔“ آوازیں تجزیے۔ اظہارِ تاسف۔

”اب آگے سنئے۔“

”سساس کے ہو گئی بیٹی“

”مندی کے دولال“

”بالی کے دولال“

”سیاں کے ہو گئی بندریارے“

”اچک کائے جو گال۔ اچک کائے جو گال“

”پاپا تلی گوری بیاں رے“

”گنگنا لے دو جان۔“

”چلو بھئی“ چھٹی ہوئی۔ موٹی بندریا نے خوب اچک اچک کے گال نوچے۔ موائی قابل تھا۔ ”قہقہے شور۔“

”ایک دفعہ اور نقل کر کے بتا سمانہ! کیسے گال کائے بندریا نے۔“ ہو ہو ہو۔

”گانا فی الحال رک گیا۔ چائے آگئی تھی پھر نماز مغرب ہو گئی۔ نیا اس کے لیے چائے اور کیک لے آئی۔“

”یہ کون گارہا تھا۔ میرا مطلب گانے والی کون تھی نیا؟“

”جیند بھائی جان! سمانہ باجی تھیں۔ اتنا اچھا گاتی ہیں نا۔ اتنا مزا آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ نقل بھی کرتی ہیں۔“

”نیا کے چہرے سے اس کے لطف کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں پوری کھلی ہوئی۔ ہاتھوں کے اشارے خوشی سے بے قابو۔“

”پتا ہے۔ مائی جان کو بھی بہت اچھا لگا۔ جھٹ سے سو روپے نکال۔ فٹ سے ان کو تھما۔“

”اچھا اور یہ سمانہ باجی ہیں کون۔؟“

”آپ کو نہیں پتا۔ ہائیں! تو پھر راشد بھائی کا کیا پتا

”ہو گا۔“

”کون راشد بھائی۔“ وہ الجھ گئے۔

”دیکھا۔ مجھے پتا تھا۔ اور اے اپنی سمانہ باجی کے میاں۔“

”جیند میاں نے ایک کیک پس اس کی طرف بڑھایا“

”لو کھاؤ اب بتاؤ۔ کون ہیں یہ سمانہ باجی۔“

”وہ جلدی جلدی کیک نکلنے لگی پھر ”پوچھ کر بتاؤں گی۔“ کہہ کر نیچے بھاگ گئی۔

”پتا نہیں اب کس سے کیا پوچھے گی اور کوئی کیا نتیجہ اخذ کرے گا۔ خیر میں نوید سے پوچھ لوں گا۔“ نیچے ڈھونگ بند تھی۔ بس کچھ آوازیں۔ کچھ ڈانٹ ڈپٹ۔ مستقل کسی کو پکارا جا رہا تھا۔ نوید نہ جانے کہاں تھا۔ اس کا انتظار فضول تھا۔ بے زار ہو کر نیچے آئے۔

”مرد لوگ نماز کے لیے مسجد گئے ہوئے تھے۔“

”خواتین برآمدے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ لڑکیاں فی الحال ڈھونگ سے الگ ٹکڑیوں میں بیٹھ ہوئی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔“

”مگن میں چند لڑکیاں کالم سے زیادہ باتوں میں مگن تھیں۔ وہ اپنی چائے والی ٹرے لے آئے تھے۔ جن میں کیک اور ایک خالی پلیٹ تھی۔ وہ اندر آ کر کھنکھارے تو لڑکیوں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔“

”ہائے اللہ جیند بھائی! آپ یہ ٹرے کیوں لے آئے۔“ نیا لے آئی۔ آپ مہمان ہیں۔“ ایک چمکیلی سی لڑکی بولی۔

”جیند بھائی! آپ تو خاصے دولہا دولہا سے لگ رہے ہیں۔ سب سے سنورے۔“ دوسری پٹاخہ نے شوشا چھوڑا۔

”(ہائیں صرف نرا کر لباس اچھا سا پہنا۔ اور بال ہی بنائے تھے۔“

”ارے ہو دولہا نہیں! ہیرو لگ رہے ہیں۔“

”تیسری نے رائے زنی کی۔“

”ہائیں ہائیں! یہی کہنا چاہتی تھی۔ منہ سے دولہا نکل گیا۔“

”اسی لیے کہتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر بات منہ سے

”نکالنی چاہیے۔ کبھی کوئی ساعت قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔“

”اور بھی اچھا ہے۔ اگر یہ ہم میں سے کسی کے دولہا بن جائیں۔“ بڑی تیز بے تکلف قسم کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جھینپ گئے۔

”آئیے۔ کرسی موجود ہے۔ ہم سے بھی کچھ رازو نیاز کر لیں۔ کینڈا کے موسم پر بات ہو جائے۔“

”ایک لڑکی تو آگے آ کر انہیں پکڑ کر کھینچنے لگی۔ کرسی پر بٹھا کر ہی چھوڑا۔ (اوہ۔ یہ تو بہت بولڈ ہے۔ توقع نہ تھی۔)

”ایک لڑکی پلیٹیں جمع کر رہی تھی۔ دوسری چمچے مگن کر رہی تھی جاری تھی۔ تیسری چولہے پر رکھے ہوئے دیکھے میں بڑا چچہ چلا رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر سب نے اپنا کام موقوف کر دیا اور انہیں دیکھنے اور اشارے کرنے لگیں آپس میں۔“

”کھانے میں کتنی دیر ہے؟“ سٹپٹا کر پوچھ بیٹھے۔ (اتنی حسین لڑکیوں کی نگاہوں کا مرکز بنے رہنا۔ اف)

”بھوک لگی ہے تو آپ کھالیں۔ نہیں۔“

”نہیں نہیں۔ سب کے ساتھ کھاؤں گا۔“

”آپ امریکا کی کس ریاست میں رہتے ہیں؟“

”ایک لڑکی اس کے سامنے کرسی پر ڈٹ گئی۔“

”میں کینڈا سے آیا ہوں۔ ٹورنٹو سے۔“

”اوہ اچھا یاد آیا۔ میری ایک سہیلی بھی ٹورنٹو میں رہتی ہے۔ اس کا نام نشا ہے۔ آپ اسے جانتے ہیں؟“

”اس کے ابا کا بہت بڑا اسٹور ہے وہاں۔“

”نہیں بھئی۔“ وہ جھینپ گئے۔ ”میں وہاں کسی پاکستانی لڑکی کو نہیں جانتا۔“

”تو آپ صرف کنیڈین لڑکیوں سے ہی ملتے ہیں بس؟“

”جیند میاں شرما گئے۔“ نہیں میں کسی۔ ارے نہیں بھئی۔“

”کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور کچن سے نکل گئے۔ تعاقب کیا شدید قہقہوں نے۔“

”دولہا بھاگ گیا۔“ یہ خبر نہیں۔ ہم کا دھماکا تھا۔ ہر سمت ہلکا کارچ گئی۔ پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا ہوا۔ پھر تبصرے۔ راز و نیاز۔

”ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ غیروں میں شادیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اب بھگتیں۔“

مگر یہ سب ایسے ہی نہیں ہوا۔ ہوائیوں کے نماز عشا کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ مرد لوگ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ لڑکیوں نے ڈھولک سنہال لی۔ چچی جان اور باجی شاہدہ کچن سمیٹنے کھانا پانٹنے رکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

فون کی گھنٹی بجے جارہی تھی۔ جنید میاں اوپر جانے کے لیے اوپر سے گزرے۔ فون برآمدے میں تھا۔ انہیں گھنٹی سنائی دی تو سامنے کسی کو نہ پا کر خود ہی فون اٹھالیا۔ دوسری جانب بھی کچھ شور مچا تھا۔ پھر ایک تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سنو! تم جو بھی ہو۔ اپنے گھر والوں کو بتا دو۔ دولہا بھاگ گیا ہے۔ اے بھائی برابر انکار کرے جا رہا تھا۔ کسی نے سنا نہیں۔ ماں باپ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اب۔۔۔ کل ہے مندی۔ وہ آتا ہے کہ نہیں۔ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مندی ہو کہ نہ ہو۔ شادی ہو کہ نہ ہو۔ بس سب سے کہہ دو۔“

”ہیلو ہیلو۔۔۔ سننے آپ ہیں کون کہاں سے بول رہی ہیں؟“ جنید میاں ہکا بکا تھے۔

”بھئی جو بھی ہوں۔ شادی والے گھر سے بول رہی ہوں۔ تمہاری طرف بھی ڈھولک کھڑک رہی ہے۔ میں نے پیغام پہنچانا تھا پہنچا دیا۔ لڑکی والوں کو بھی بتا دو۔ خیر صلا۔“

جنید میاں از حد پریشان حیران ریسیور کو گھور رہے تھے جہاں اب خاموشی تھی۔ کیا پیغام۔ کس کا پیغام؟ وہ انجان تھے کس سے کہیں اور فون کرنے والی کا نام تک نہیں پھر ہمت کر کے لاؤنج کے دروازے پر آکر

کھڑے ہو گئے۔ نہ چچی جان نظر آئیں۔ نہ باجی شاہدہ خواتین تو کئی تھیں۔ مگر وہ زیادہ پہچانتے نہ تھے۔ نہ جانے اتنی عورتیں کہاں سے جمع کر لی تھیں چچی جان نے۔

”سنے۔ ذرا سنے۔“ ایک بنی سنوری لڑکی گزری۔ اسی کو پکار بیٹھے وہ آگئی۔

”جی کہئے۔“ منظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ“ آپ چچی جان کو بلوا سکتی ہیں۔ ان سے بات کرنی ہے بہت ضروری۔“

”کیوں میں پسند نہیں آئی۔ کیا برائی ہے مجھ میں؟ مجھ سے کر لیں جو بات کرنا ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ سے نہیں۔ چچی جان یا باجی شاہدہ سے۔۔۔“

منہ بناتی وہ پٹاخہ لڑکی جھومتی جھامتی گئی اور باجی شاہدہ کو پکڑ لالی۔

”بیجے۔ آگئیں آپ کی باجی شاہدہ۔ کر لیں بات۔“

”کیا بات ہے جنید میاں! کچھ پریشان ہو؟“ وہ سمجھ گئیں۔

”جی باجی! وہ ابھی ایک فون انینڈ کیا تھا میں نے۔ میں تو چاہتا تھا۔ آپ کو یا چچی جان کو بلاؤں مگر کوئی سامنے نہ تھا۔ اس لیے میں نے۔۔۔“ بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی۔

”ہاں فون اچھا کس کا فون؟“

”باجی! میں نے پوچھا۔ آپ کون ہیں۔ تو انہوں نے کہا۔ میں جو بھی ہوں۔ لڑکی والوں کو پیغام دے دو۔ لڑکا شادی پر راضی نہیں۔ وہ انکار کرتا رہا کسی نے سنا نہیں۔ اب وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ پتا نہیں مندی پر بھی آتا ہے کہ نہیں۔ شا۔۔۔ شادی بھی ہوتی ہے کہ

۔۔۔“

باجی فکر فکرا نہیں دیکھ رہی تھیں۔ ”تم نے۔۔۔“

”سنا یہ سب۔“

”جی باجی! میں پوچھتا رہا آپ کون مگر۔“

باجی حواس باختہ ہو کر انہیں دھکا دیتی ہوئی باہر نکلیں ان کا رخ ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ ظاہر ہے سب ان سے ہی گواہی طلب کریں گے۔

باجی شاہدہ نے نے چچا جان سے کیا کہا۔ وہ سن نہ سکے۔ مگر وہاں موجود چند بزرگ اور چند دوسرے حضرات بھی حیران اور پریشان ہو گئے۔ چچا جان بے حد لکھے ہوئے لگ رہے تھے۔ بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

اشارے سے جنید میاں کو پاس بلایا اور موجود حضرات سب ان سے حجت کرنے لگے تھے۔ ہائیں

ہام نہیں بتایا۔ لڑکے کا نام بھی نہیں۔ واہ یہ تو معما ہو گیا۔ چچا جان کو کچھ بولنے پوچھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

دوسرے لوگ ہی بولتے رہے۔ پھر چچی جان کو بلالیا گیا۔ ان کو باجی شاہدہ نے بتا دیا۔ چچی جان رونے لگیں۔ ساحل خاصا سو گوار ہو گیا۔

”چچا جان! آپ ان کے گھر فون کر کے معلوم تو کریں معاملہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی رائگ نمبر ہو۔“

جنید میاں نے مشورہ دیا۔

”اوے میاں! کیا معلوم کریں۔ جب انہوں نے کہہ دیا کہ لڑکا انکار کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ کھل کر کوئی کیا کہے گا؟ اور مجھے تو شرم آئے گی پوچھتے ہوئے۔ یعنی کہ ہم اتنے گئے گزرے ہو گئے۔ خود سے پوچھیں کہ بھی ہماری لڑکی میں کیا عیب ہے جو وہ انکار کر رہا ہے۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔“ وہ سخت برا فروختہ تھے۔

جنید باجی کو الگ لے جا کر انہیں سمجھانے لگے کہ

”باجی! آپ فون کر لیں۔ معلوم تو ہو قصہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔“

”میں۔۔۔؟ مجھ سے تو بات نہیں کی جائے گی۔ گلا بند ہو جائے گا۔“

باجی شاہدہ بے حد رنجیدہ تھیں۔ وہ ان کے جذبات سمجھتے تھے۔ پھر بھی کوئی تو ان لوگوں کے مسئلے کا سبب معلوم کرے۔ کوئی بھی مگر وہاں سب غصہ مگرمی،

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جلال کے زیر اثر۔ چچا جان خاموش صوفے میں دھنسنے بیٹھے تھے۔ چچی جان لڑکے کو برا بھلا کہنے میں مصروف تھیں۔ کوئی بھی جنید کے مشورے کو ماننے پر راضی نہ تھا۔

”نوید۔ یہ نوید کہاں ہے؟“ جنید میاں نوید کی تلاش میں باہر نکلے۔ وہ لان میں تھا۔ وسیع و عریض لان جس کی گھاس بھی اب سوکھ چکی تھی۔ بچوں نے کرکٹ کھیل کر گھاس کے علاوہ کنارے پھولوں کی کیاریاں بھی تباہ کر دی تھیں۔ نوید لان میں شامیانے لگوا رہا تھا۔ کرسیاں کنارے رکھوا رہا تھا۔ مندی کا انتظام۔

”اف کس قدر ذمے دار لڑکا ہے یہ نوید۔ اب کن الفاظ میں اس سے کہیں کہ بھائی یہ سب چھوڑو اور فون سے چیک جاؤ۔“ آخر اسے جا پکڑا۔ وہ شامیانے لگانے والوں کو کچھ ہدایات دیتا ہوا جنید میاں کے پاس آیا۔ انہوں نے اسے پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے

ساری بات بتائی۔ نوید کی مٹی گم ہو گئی۔

”یہ کیسے۔۔۔ بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔“

مگر یہ ہو چکا تھا۔ جنید اسے پکڑ کر فون کے قریب لائے۔ سمجھایا کہ کس طرح بات کرنی ہے۔ مگر وہ چیخا چلاتا اندر بھاگا۔ پھر جونے سرے سے شور مچا اور عجیب طرح کا سناٹا۔ ہاں ڈھولک یک لخت بند ہو گئی تھی۔ لڑکیاں اپنی جگہ گم صم۔ ٹک ٹک دیدم۔ دم نہ کشیدم کے زیر اثر۔

جنید کو تھکن نے گھیر لیا۔ اچانک دھاڑ سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور حواس باختہ ایک لڑکی کچھ کہتی، کچھ تلاش کرتی باہر نکلی۔ ”بے ہوش ہو گئی چچی نازی بے ہوش ہو گئی۔“ کہتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

جہاں پوری پبلک موجود تھی۔ پھر وہاں سے بہت سی خواتین نازی کے کمرے میں جا گئیں۔ اندر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کوئی خاموش کارروائی پھر کچھ دیر ہوئی۔

بعد سب باہر آئیں۔ جنید کو نازی پر ترس آ رہا تھا۔ اچانک انہوں نے دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گئے۔ نازی تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ انہیں دیکھ کر سنبھل کر اٹھی۔ دو ٹا سر سے اوڑھ لیا۔ اس حسینہ۔ نظریں جھکی ہوئی۔ رنگ زرد۔

”میں بیٹھ جاؤں؟“ کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب لاتے ہوئے اجازت طلب کی۔ نازی نے گردن کے اشارے سے اقرار کیا۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”نازی! تم پریشان نہ ہونا۔ ہمت کرو۔ حوصلے سے کام لو۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ کمزوری آواز میں اس نے کہا۔

جنید میاں نے ”ٹھیک ہونا اسے تو نہیں کہتے۔ آواز میں نقاہت ہے اور رنگ ہلکی جیسا پیلا۔ حالانکہ تمہارا رنگ تو مسخ سفید تھا۔ اچانک یہ کیا ہوا۔“

”ہی ہی ہا ہا۔“ نازی کے عقب سے ایک قہقہہ برآمد ہوا۔ جنید نے دیکھا نہ تھا کہ وہاں کوئی اور خاتون بھی موجود ہیں۔ تعجب سے نظر اٹھائی۔ ایک بے حد صحت مند خاتون کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔

”ارے میاں یہ پیلا رنگ پریشانی کا نہیں ہے۔ تین دن سے صبح شام ابٹن ملا جا رہا ہے۔ خوشبوؤں والی جڑی بوٹیوں کو رگڑ کر ہلکی ملا کر۔ آیا کچھ سمجھ میں۔ دلہن کی رنگت پیلی ہو تو میک اپ اچھا ہوتا ہے۔ روپ آتا ہے۔“

کافی تفصیل پسند محترمہ ہیں۔ یہاں سب بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ یہ محسوس کیا جنید میاں نے۔ وہ چپ ہو میں تو جنید نے گلا صاف کر کے آہستہ سے کہا۔ ”دیکھو نازی! تمہارے پاس تمہارے مگیترا کا فون نمبر ہو گا۔ اسے فون کرو۔ اس سے بات کرو۔ آرام سے مسئلہ پوچھو۔“

”اتنی بڑی توہین کے بعد میں اسے فون کروں؟“ حیرانی تھی۔

”کوئی حرج نہیں۔ معلوم تو ہو کہ یہ بات درست ہے بھی کہ نہیں۔ کسی نے۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔“

”اجی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ کوئی اور پسند آگئی ہوگی۔ آج کل کے لڑکوں میں تلون بہت ہے۔“ نازی کے پیچھے سے ارشاد ہوا۔

”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ نازی تڑپ گئی۔ ”وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“ اتنا اعتماد۔

”کرتا ہے نہیں۔ کرتا تھا کہو بنو! بلکہ کرتا ہو گا۔“ عقب سے لقمہ دیا گیا۔

”تم فون تو کرو۔ ابھی پتا چل جائے گا۔“ جنید نے اصرار کیا۔

”کیا کہوں۔۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ہمت مایوس ہو کر نازی نے کہا۔

”یہی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ وہاں سے جو فون آیا اس کی حقیقت کیا ہے اور یہ کہ اگر یہی کرتا تھا تو۔۔۔ آخر مقصد کیا ہے؟ جو بھی پوچھ سکتی ہو پوچھو۔“

جنید کے اصرار پر آخر نازی نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا۔ نمبر ملایا۔ منہ بنا کر بولی۔ ”بند ہے۔“

”اس کی بہن یا بھائی کا نمبر۔ کسی سے بھی رابطہ کرو۔“

”اکھوتا ہے۔ بہن ہے نہ بھائی۔“ پھر بھی بار بار نمبر ملائی رہی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

”ویسے تمہارا موبائل تو بہت خوب صورت ہے۔ کافی قیمتی لگتا ہے۔“ جنید نے اس کے چہرے کی مایوسی سے متاثر ہو کر توجہ ہٹانے کے لیے بات بدلی۔

”شرجی کا دیا ہوا ہے۔ عید کا گفٹ۔“ نازی کے حلق سے آواز نکلی۔

”شرجی کون؟“

”ارے وہی ہرجائی بے وفا۔ شرجیل۔“ پیچھے سے مطلع کیا گیا۔

اب یاد آیا۔ دولہا کا نام شرجیل تھا۔ نازی اب

پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”بے وفا ہرجائی کے لیے قیمتی آنسو بہا کر خود کو اذیت پہنچانا فضول ہے۔“ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آئے۔

”لو حرجے باقی شہدے لکراؤ ہو گیا۔“

”تم یہاں نازی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟“ عجیب مشکوک سا لہجہ تھا۔

”کچھ نہیں۔ میں تو نازی کو تسلی دینے آیا تھا کہ فکر نہ کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ جنید میاں نے ان کو بھی تسلی دینی چاہی۔

”سب ٹھیک کیسے ہو جائے گا خود بخود؟“ باقی شاہدہ غصے میں تھیں یا صدمے کے باعث ہلکی ہوئی تھیں۔

”تھکے لہجے میں کہنے لگیں۔“ یہ خوب ہے۔ آج کل نی دی کے ہر ڈرامے میں یہ ڈانٹا لگ ضرور ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا نقصان ہو یا پریشانی، یہی کہا جاتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے بابا۔ کیسے بغیر ہاتھ پیر ہلائے؟ عقل استعمال کیے بغیر ہی؟“

”تو۔۔۔ فون تو کریں ان کے گھر پر۔“ (اگر عقل استعمال کرتی ہے)

”کیا تھا۔۔۔ فون خراب ہے۔ یا جان بوجھ کر انہوں نے ریسیور ہٹایا ہوا ہے۔ بے جان ہے بالکل۔ ٹوں ٹوں کے سوا کوئی آواز نہیں۔“

”ان کے گھر کسی کو بھیجیں۔“

”کوئی راضی نہیں ہوتا۔“ مایوسی سے گویا ہوئیں۔

”یا پھر تم چلے جاؤ مگر۔۔۔ تم انجان آدمی نہ تم کسی کو بچاؤ گے نہ وہ تمہیں۔“

”یہ تو ہے۔ میں تو ایسی بات کرنے کی پوزیشن میں ہوں ہی نہیں۔ آپ ایسا کریں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ بات آپ کریں۔“

”لو۔ میں جاؤں؟ تو تم جا کر کیا کرو گے۔ فالٹونڈ میں۔“

”یہ فالٹونڈ کیا ہوتا ہے؟“ جنید سمجھ نہ سکے۔ پھر سہلایا۔

”میں۔۔۔ آپ کی سپورٹ۔ میرا مطلب ہے مدد یا تعاون کے لیے۔“

”مگر میں جاؤں کیوں؟ ذلت کم ہوئی ہے؟ اور بھی ذلیل ہونے کے لیے جاؤں؟ نہ بابا! کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو امی! اب مجھے الزام دیں گے کہ میں نے بات خراب کر دی۔“ صاف جواب۔

”تو۔۔۔ جو درست بات کر سکتا ہو۔ اسے بھیجیں۔ نوید کو بھیج دیں۔ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“ نوید کے ساتھ جانا ٹھیک لگا نہیں۔

”آخر تم ہر کسی کے ساتھ کیوں لٹکنا چاہتے ہو فالٹونڈ میں۔“

لو پھر فالٹونڈ۔ آخر پوچھ لیا۔ ”یہ فالٹونڈ سے کیا مراد ہے آپ کی؟“

”مطلب تو کون میں خواہوا۔“ چلو ایک اور پہلی مگر خواہوا کا مطلب تو سمجھتے تھے۔

”دیکھیے۔ مجھے کسی کے ساتھ لٹکنے کا شوق نہیں ہے۔ میں تو صرف نازی کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ اسے کس جرم کی سزا دی جائے۔ آخر لڑکے والوں سے سوال کرنے کا حق تو ہے نا بھائی کہ عین وقت پر یہ انکار کا کیا مطلب ہے اور اگر لڑکے کی مرضی نہ تھی تو کیوں اسے مجبور کیا۔ ہماری لڑکی کو کیوں سزا ملے۔“ جی چاہا کہہ دیں (فالٹونڈ میں)۔

”بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ ان کی سمجھ میں آ گیا۔ ”اچھا کو! میں اب جان سے یا امی سے بات کرتی ہوں۔“

وہ مڑ کر چل پڑیں اپنی امی یا بابا کی طرف۔ جنید میاں شہتے ہوئے آگے بڑھے اور لاؤنج میں داخل ہو گئے۔

معلوم تو ہو۔ اب کیا طے ہوا ہے۔ وہاں کئی بزرگ خواتین ٹھہرے سے ایک تخت پر براجمان تھیں۔ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے اور دو ایک نیم دراز تھیں۔ دلی زبان سے بات چیت چل رہی تھی۔ ساتھ ہی چونا بھی چاٹا جا رہا تھا۔ درمیان میں بڑا سا پاندان کھلا ہوا دعوت عام دے رہا تھا اور سب خواتین اس میں ہاتھ ڈال کر انگلیوں کے ساتھ کچھ ٹونگ رہی تھیں۔ چھالیہ، سونف، یاریل اور تمباکو وغیرہ۔ دوسروں کی خاطر بھی کی جارہی تھی۔

”یہ نارمل کھالو۔ چونے سے منہ نہیں کٹے گا۔ چھالیہ باریک کر کے دوں کیا۔؟ پان میں کوئی لذت ہی نہیں۔ عجب طرح کے پھلکے سینٹھ پان ہیں۔“

”اری تم کو لذت کی بڑی ہے۔ طاہرہ کی خبر لو جا کر۔ کیسی ہے غوڑ ماری۔ بچی کا کیا حال ہے۔ اس کی مندی کا کیا ہو گا۔“

”بائی! طاہرہ تو مردانے میں ہے۔ سامنہ سے کہو۔ سامنہ۔ اے سامنہ! ذرا کسی سے جا کر پوچھ بیٹی! کہ اب مندی کا کیا پروگرام ہے۔ ہم اب رہیں یا گھر چلے جائیں اپنے۔“

”اے ہاں ہم تو مایوں اور مندی کے لیے آئے تھے۔ تو اب۔“

ایک بہت ہی طرح وار حسینہ سلیقے کا میک اپ کیے۔ گلابی شوخ رنگ کے سوٹ اور رنگ برنگی چڑی کندھے پر لٹکائے نخروں سے درمیان سے اٹھ کر آئی۔ اصل میں ڈھولک والی لڑکیاں درمیان میں فرش پر جمع کھسک پھس کر رہی تھیں۔ سامنہ صاحبہ ان کے درمیان بیٹھی ان سب سے باتوں میں مشغول تھیں۔ اٹھ کر آئیں۔ سب کی بات سنی۔

جنید نے ان کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ جنید کی نظروں کو خود پر مرکوز محسوس کر کے رکیں اور گردن اٹھا کر انہیں مسکراتے دیکھ کر پوچھ لیا۔

”آپ کون؟“

جواب تو تھا کہ میں خواجہ فالتوفت میں۔ جنید خوش ہو کر بولے۔ ”دیکھا آپ مجھے نہیں پہچانتیں۔ مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ سامنہ صاحبہ ہیں۔ آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔ میں نے آپ کے گانے سنے۔ بہت اچھے آواز میں۔“

”شکریہ۔“ وہ کچھ خشک آواز میں کہہ کر چلنے کو ہوئیں۔

جنید میاں نے فوراً ہی دوسرا سوال ٹھوک دیا۔

”ویسے یہ راشد بھائی کہاں ہیں۔ میرا ان سے تعارف نہیں ہے۔ ملو ایسے نا۔ ہم بھی اس خوش نصیب کو دیکھیں۔“

جنید کی بات پر سامنہ کا رنگ فق ہو گیا۔ پھر وہ سر ہر گئیں۔ اب وہ پیر پختی پیچھے کو مڑیں اور تخت نشین خواہن سے احتجاجاً چیخ کر بولیں۔

”دیکھیں نانی جان! یہ نہ جانے کون ہیں۔ مجھے راشد کے نام کا طعنہ دے رہے ہیں۔ شرم نہیں آتی

جنید میاں کی شئی گم ہو گئی۔ یہ کیا طرزِ مخاطب ہے۔ ادھر تخت پر آرام کرتی خواہن جیسے ہڑباز کر خواب خرگوش سے جاگ اٹھیں اور جو بیٹھی تھیں انہوں نے ہاتھوں کا چھبنا کر سامنے دیکھا اور ہنس دیں۔

”اے بے لویہ تو اپنا جنید ہے۔ ارے اقبال میاں کا بیٹا۔ افہ۔ اپنی سکندرہ کا لڑکا۔ اے لو۔ ابھی تمہیں دن پہلے ہی تو آیا ہے۔ ادھر آؤ بیٹا۔ میں تمہیں سب سے ملواؤں۔“

سفید لباس والی بزرگ خاتون جن کے دوپٹے پر چمکی گولڈن پی ٹی گلی ہوئی تھی اشارے سے بلا رہی تھیں۔ وہ ان سے آنے کے بعد ملے تھے۔ مگر بھول گئے تھے کہ کیا رشتہ ہے۔ سٹٹا کر تخت کے پاس پہنچے تو انہوں نے اشارے سے تخت پر بیٹھنے کا کہا۔ ”آؤ بیٹا میرے پاس بیٹھو۔“

وہ ڈرتے ڈرتے تخت کے کنارے پر ٹک گئے خطرہ تھا کہ تخت اتنا مضبوط نظر نہیں آ رہا تھا اور اس لیے بھی کہ پہلے ہی کئی بھاری بھر کم خواہن اس پر تشریف فرما تھیں۔ کہیں ان کے وزن سے بے چارہ تخت بیٹھ ہی نہ جائے۔

”یہ تو ہیں تمہاری چچی اور یہ ممانی۔ اور ان کو نہ جانتے ہو گے۔ اے بھئی یہ تمہاری دادی ہوتی ہیں رشتے میں اور میں نانی۔ سکندرہ کو گود میں کھلایا ہے میں نے اور اقبال تو ہمارے آنگن میں کھیل کر جوان ہوئے تھے اور تمہاری ایک بڑی بہن بھی تو ہیں۔ کہاں ہیں۔ بچے کتنے ہیں اللہ رکھے اور کسی بچے کی شادی ہوا ہے۔ ابھی نہیں۔“

جنید میاں نے تابڑ توڑ سوالوں کے جواب پھوٹے

سامنوں کے ساتھ دیے۔

”جی جی وہ ہیں ہیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ یعنی کہ میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔ اچھی ہیں۔ چار بچے ہیں۔ شادی کسی کی نہیں ہوئی۔ ابھی پڑھ رہے ہیں سب۔“

”نانی جان! میرا تو انصاف کریں۔ یہ مجھے راشد کے ہم سے چھیڑ رہے تھے۔ میرا مذاق کا رشتہ تو ہے نہیں۔ سامنہ صاحبہ پھر اڑیل ٹٹو کی طرح پیر زمین پر مار کر قدرے ٹھنک کر بولیں۔

”اے لڑکی! زیادہ بڑبڑ نہیں کرتے۔ چلو جاؤ جو تم سے کہا ہے وہ کرو۔ ہم بتاتے ہیں جنید میاں کو۔ انہوں نے کسی سے کچھ سن لیا ہو گا۔ چلو جاؤ۔ ٹلو ادھر ہے۔“ بزرگ خاتون ٹیٹ کر بولیں۔ سامنہ صاحبہ واقعی وہاں سے فوراً ٹل گئیں۔

”وہ۔ مجھے تو غیائے بتایا تھا۔“ جنید جلدی سے صغالی پیش کرنے لگے۔ ”میں نے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔ یہ کون گانا گارہا ہے۔ تو اس نے کہا سامنہ بائی۔ میں نے کہا کون سامنہ بائی۔ تو بولی۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔ تو راشد بھائی کو کیا جانیں گے۔ بس نانی! اس لیے کہ راشد صاحب کی خیریت پوچھ لی۔“ اٹک کر جنید نے بات پوری کی۔

”اچھا یہ غیاء کی بچی کی کارستانی ہے۔ سچ تو ہے۔ بچہ کیا جانے، ٹھہرو۔ ابھی بلاتی ہوں اس غیاء کی بچی کو۔ بدذات کہیں کی۔“

”تجھو لڑکیاں! خالہ جان وہ بچی تیز ہے ذرا۔ مگر کام کتنے کرتی ہے۔“ ممانی ٹائپ خاتون چھالیہ کا پھنکا لگا کر بولیں۔

”ہاں خیر بیٹا! بات یہ ہے کہ یہ جو سامنہ ہے۔ یہ بھی اپنی ہی بچی ہے۔ تمہاری خالہ کی منہ کی بیٹی ہے۔ غوڑی کے ساتھ ایسا ہوا کہ عین شادی کے دن بارات آکر لوٹ گئی۔ کچھ مہر بھگڑا ہوا تھا۔ لوجی! وہ دن آج کا دن۔ بھاری لٹوڑی پھر رہی ہے۔“ نانی جان نے پاندل ان سے چوسنے کی پچی نکالی۔ زبان سے چاٹ کر پھر واپس رکھ دی۔

”اوہ! جنید پر گھڑول پانی پڑ گیا۔“ مگر غیائے بتایا تھا کہ راشد صاحب ان کے شوہر ہیں۔“ بے حد تاسف سے کہا۔

”ارے وہ راشد۔ وہ دوسرا قصہ ہے۔ غوڑا وہ بھی اپنے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس سے سامنہ کا بعد میں نکاح ہو گیا مگر یہ سامنہ۔ کم نہیں ہے۔ نکاح کے بعد فرمائش شروع کر دیں۔ بس وہ ہتھ سے اکھڑ گیا۔ دوہی جا کر طلاق بھیج دی بدذات نے۔“

”ارے! وہ تقریباً! اچھل پڑے۔ مزید تاسف۔

”یہ کیسا ملک اور کیسا خاندان ہے جہاں مندی کے دن دو لہا شادی سے انکاری ہو جاتا ہے۔ بارات واپس چلی جاتی ہے۔ نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے طلاق۔ کس قدر بد اخلاق معاشرہ ہے۔ لڑکیوں کی زندگی کو کھیل سمجھ کر جو مرضی کرتے رہو۔ افسوس ناک بلکہ شرمناک رویہ ہے۔ کیا لڑکیاں اتنی بے بس ہیں۔ کیا وہ انسان نہیں۔ ان کو اتنا اپنی اور جد دیا ہوا ہے کہ جو چاہے دھتکارے۔ جب چاہے ٹھوکر مار دے اور یہ خاندانی لوگ کس طرح اس لیے کو چٹکارے کر بیان کر رہے ہیں۔ جیسے یہ عام سی بات ہے مذاق ہے۔ شاید یہاں اسے مذاق سمجھا گیا۔ اسی لیے تو اترے ہو تاروتا ہے۔ غور کرو تو کتنی اذیت ناک کہانی ہے۔ پتا نہیں اب بھاری نازی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کتنی معصوم سی ہے۔ کس قدر رونق چمک پھل شادی کے نام پر ہو رہی ہے۔ اب کیا ہو گا۔ مہمانوں سے کیا کہا جائے گا۔“

”نانی! نانی جان! طاہرہ ماما کا بلڈ پریشر ہائی ہے۔ وہ بستر پر منہ لیٹے پڑی ہیں۔ کہہ رہی ہیں۔ جس کا جو جی چاہے کرے۔ مجھے نہیں پتا۔“

یہ سامنہ تھی۔ جنید گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ”گھر والے کچھ کرتے کیوں نہیں۔“

”نانی! آپ چچا جان سے کہیں۔ کسی کو لڑکے والوں کے گھر بھیجیں۔ وہاں جا کر معلوم کر کے آئے۔“ انہوں نے نانی سے کہا۔

”سچ کہتے ہو۔ کسی کو ان لوگوں سے بات کرنے کے

لیے جانا چاہیے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا کشتی ہوں۔ وہ تخت سے اترنے لگیں تو جنید نے انہیں سارا دے کر اتارا۔ سمانہ ابھی بھی جنید کو گھور رہی تھی۔ وہ گھبرا کر نانی کے ساتھ ہو لیے۔ سمانہ بھی ساتھ چل پڑی۔ نانی بے حد تیز رفتار ٹکلیں خلاف توقع۔ جنید اور سمانہ پیچھے رہ گئے۔ نانی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو جنید اور سمانہ ابھی چند قدم پیچھے تھے۔

”سیے! آپ کو راشد کے بارے میں کس نے بتایا۔“ سمانہ کی آواز کہیں دور سے سنائی دی۔ وہ رک گئے۔

”نیا نے۔“ چور سے بن گئے۔

”اچھا، مفتی نہ ہو تو۔“ دانت کچکپائے۔

”آپ کی آواز۔۔۔ بہت اچھی ہے۔ سرلی اور یوج دار اور وہ گانا تو بہت دلچسپ تھا۔ بندریا والا۔ وہ تکلف کی دیوار گرانے میں کامیاب ہو گئے۔

”اچھا؟ آپ کی سمجھ میں آگیا۔ پسند آیا؟“

”ہاں اتنی اردو تو سمجھتا ہوں۔“

”کمال ہے۔ مگر راشد کو اس پر اعتراض تھا۔ اوھر ہر مقلی شادی پر لوگ مجھ سے گانے سننا چاہتے ہیں اور وہ کہتے تھے تم کیا ڈومنی ہو۔“

”ڈومنی کیا؟“ خاک پلے نہ بڑا۔ ”ویسے کیا صرف اتنی سی بات پر طلاق ہو گئی؟ نانی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ نے فرمائشیں شروع کر دیں۔ وہ ہتھ سے اکھڑ گیا۔ اسی لیے طلاق دی۔“

اب انہیں اس لڑکی سے ہمدردی ہو گئی۔ برآمدے میں کرسیاں بڑی تھیں۔ دونوں ان پر بیٹھ گئے۔

”سب نہیں سمجھتے ہیں۔“ سمانہ کی آواز بھاری ہو گئی۔

”میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ جو لوگوں کی زبان پکڑیں۔ راشد ہے تو اسی خاندان کا۔ اور مرد جو فیصلہ کر لے۔ اس پر یقین کر لیتے ہیں لوگ۔“ سمانہ نے کہا۔

”یہ بھی خیال ہے کہ حق مانگنا حق کے لیے ڈٹ جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ عورت کو بس چپ چاپ سمجھو تاکر کے زندگی کی قربانی دے دینی چاہیے؟“

”حق مانگنا تو عین ایمان کی نشانی ہے۔“ جنید میاں نے سر ہلایا۔ ”مگر سنا ہے“ آپ نے کچھ غلط قسم کی فرمائشیں شروع کر دیں۔“

”ہوایہ کہ۔۔۔ میں نے آئندہ زندگی کی مضبوطی کے لیے۔ راشد سے بس اتنا کہا کہ شادی کے بعد کچھ عرصہ ہم الگ رہیں گے اور جب ہمارے درمیان ہم آہنگی ہو جائے گی۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے تو پھر میں سسرال میں رہوں گی سب کے ساتھ۔“

”اس سے کیا ہوتا؟“

”اصل میں۔۔۔ راشد کی ماں بہت تنگ دل ڈکلیئر قسم کی ہیں۔ وہ اپنے دو بڑے بیٹوں کی شادیاں کروا کے چند ماہ بعد ہی بیٹوں کو طلاق کے لیے مجبور کر کے ہووٹل کو گھر سے نکال چکی ہیں۔ انہیں اپنی راجدھانی میں دو سری عورت کا عمل دخل گوارا نہیں۔ لڑکے بہت فرماں بردار ہیں۔ میں نے راشد کو اس عمل سے بچنے کے لیے تجویز دی تھی کہ تین چار ماہ ہم دونوں الگ رہ کر ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے۔ اس دوران راشد مجھ سے محبت بھی ہو جائے گی۔ تو وہ ماں کو سمجھالے میری حمایت کر کے۔ اس طرح میں گھر میں بس جاؤں گی۔ ہمارا گھر بچ جائے گا۔ مگر اس الٹی کھوپڑی کے بندے نے ماں کو بتادیا کہ میں الگ رہنے کی فرمائش کر رہی ہوں۔ بس اوھر سے ماں نے کہا۔ دے طلاق اور وہ حکم کا غلام۔ مجھ سے بات تک نہ کی۔ حالانکہ میں نے اچھی طرح سمجھادیا تھا کہ کس وجہ سے میں عارضی الگ رہنا چاہتی ہوں مگر۔۔۔ وہ پیٹ کا لٹکا جھٹ ماں سے جڑو یا۔ ماں فٹ سے آگ بگولہ۔ چلو قصہ ختم۔ اب تینوں بھائی بغیر بیویوں کے چھڑے چھانٹ پھر رہے ہیں اور سنا ہے اپنے عمل پر پچھتا رہے ہیں۔“

”خیر ان کی تو کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔“

”ایسے ہی ہو جائے گی۔ جی نہیں۔ ان کا واسطہ اب سمانہ سے بڑا ہے۔ میں ان کے گھر کی پل پل کی خبر لے رہی ہوں۔ ان کی ماں جب بھی کہیں لڑکی دیکھنے جاتی ہیں میں لڑکی والوں کو خبردار کر دیتی ہوں کہ شادی کے

بچی کی طلاق کے پتھر رہنا۔“

سمانہ پر جوش تھی۔ جنید حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ سمانہ ان پر دھاک بٹھانا چاہتی تھی۔ اپنی عقل کی۔

”جی ہاں پاکستان ہے۔ آزاد ملک کے شہری ہیں ہم اور میں جو ہوں نا بے قصور سزا ملنے پر انتقام لینا جاتی ہوں۔ حق ہے میرا۔“

یہ لڑکی انہیں حیران کیے جا رہی تھی۔

”اور یہ جاسوس کون ہیں جو ان کے گھر کی پل پل کی خبر دیتے ہیں؟“

”میری خبر رساں ایجنسی بہت اسٹرانگ ہے جی۔ ان لوگوں کے پڑوس میں رہتی ہے میری بچی دوست۔ راشد کے پڑوسیوں سے خاندانی تعلقات ہیں۔ راشد کی ماں جہاں جاتی ہیں۔ میری دوست کی ماں کو ساتھ لے جاتی ہیں۔ میری دوست مجھے خبر دے دیتی ہے۔ میں نے سنے سنے والوں کو سارا کچا چٹھنا دیتی ہوں۔ وہ معلومات کراتے ہیں۔ سب سچ ہوتا ہے۔ بس بات ختم۔ تم جگہ ختم کرائی ہے۔“

”بہت خطرناک ہو تم۔“ جنید کے منہ سے نکلا۔

”خطرناک نہیں۔ اب کچھ عقل آگئی ہے۔ پہلے بہت سیدھی سا دی سی تھی مگر اب۔۔۔ میرا مستقبل اندھیوں کی نذر ہو گیا ہے تو کیا احتجاج بھی نہ کروں؟ کب تک منہ میں گھٹکنیاں ڈالے بیٹھی رہوں۔“

”کیا ڈالے؟“ گروڈن آگے بڑھا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ افسردگی سے اوھر اوھر دیکھنے لگی۔

”اب یہ ہے کہ کوئی مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوتا۔ راشد کے گھر والوں نے گل پھندے لگا کر ایسا مجھے بدنام کیا ہے۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ ایک بھائی ہے۔ وہ بھی ناراض۔ بھابھی کو میرا وجود گوارا نہیں۔ کہاں جاؤ گی۔“ بہت مایوس تھی چاری۔ غم زدہ رہتی۔

”نہیں نہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ خوب صورت ہیں۔ ہو جائے گی آپ کی شادی کہیں نہ کہیں۔ مایوسی کی کیا بات ہے۔ کوئی کمی تو ہے نہیں آپ میں۔ لوگ بخوشی قبول کر لیں گے۔“ تسلی دلاسا۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر آپ ہی کر لیں مجھ سے شادی۔“

بے دھڑک بولی۔

جنید نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگے۔ بلاشبہ خاصی حسین تھی۔ شوقین اور خوش مزاج بھی ہو گی کبھی مگر حالات نے۔

اندر سے نانی نے انہیں پکارا۔ وہ اندر لپک گئے۔ سمانہ وہیں بیٹھی انگلیاں چٹکاتی رہی۔ مایوس اور دل گرفتہ۔

اندر جنید کی پیشی اور گواہی۔ فون کس کا تھا۔ کیا کہا گیا۔ دوبارہ انہوں نے حرف بہ حرف یعنی ایک ایک لفظ دہرایا۔ سب سر نیچا کر کے غور کرنے لگے۔ نانی نے کہا۔

”میں کہتی ہوں۔ کسی کو ان کے گھر بھیجو فون بند ہے۔ راستے بھی بند کر دیے کیا انہوں نے۔ نوید کو بھیجو۔“

”اب تو بہت رات ہو گئی ہے۔ سب سو گئے ہوں گے۔“ نوید نے کمزور سا بہانہ کیا۔ ”صبح۔۔۔ صبح دیکھیں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ رات کے دو بجے بھی کسی کو کیا تنگ کرنا۔“ چچا جان رضامند۔

جنید حیران تھے۔ بھئی یہ کیسے صابر لوگ ہیں۔ انہیں تو فوراً ”وہاں جانا چاہیے تھا۔ ان پریشان کن حالات میں دو بجے رات کا بہانہ۔ وہاں بھی سب جاگ رہے ہوں گے۔ مہمان وہاں بھی ہوں گے۔ کون سوتا ہے شادی کے گھر میں جلدی اور لڑکے کے غائب ہونے کے بعد ماں باپ کی نیند تو خود ہی غائب ہو گئی ہو گی۔ جیسے یہاں سب جاگ رہے ہیں۔“

وہ چڑ کر ہار آئے۔ سمانہ وہاں نہ تھی۔ وہ اوپر اپنے ٹھکانے پر آگئے۔ بستر لیٹ کر آیا کو کال ملائی۔

”آپا! یہاں ایک لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔ بہت خوب صورت، شوخ، چلبلی سی ہے۔ گاتی بھی بہت اچھا ہے۔ آواز بھی بے حد سریلی ہے۔ خاندان کی ہی ہے۔ کیا میں اس سے شادی کر لوں؟“ سیدھا سوال تھا۔

جواب بھی فوری آگیا۔ ”اپنے خاندان کی ہے؟ واہ

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ضرور کر لو اگر تمہیں پسند ہے تو۔ نکاح کے بعد کاغذات تیار کرو لینا ویزے کے لیے۔ کچھ زیورات میرے پاس ہیں۔ بھجج دوں یا وہیں خرید لو۔ شادی کے لیے اچھے سے کپڑے اس لڑکی کی پسند سے لینا۔

”شکریہ آپ! آپ بہت اچھی ہیں۔ بس اب انتظار کریں۔“

وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اب سمانہ کے لیے کس کے سامنے ہاتھ پھیلا میں۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ بھائی نہ جانے کون اور کہاں ہے۔ صبح شاہدہ باجی سے رابطہ کر کے سمانہ کے بھائی کا پوچھوں گا۔ بھئی واہ۔ یہ تو بڑا آسان نسخہ ہے۔ خوشی میں غنیمت غائب ہو گئی۔ سمانہ اچھی تو تھی لیکن مصیبت زدہ بھی تھی۔ غمزہ اور بے سہارا۔ اس کا سہارا بننا تو اب بھی ہو گا۔ سمانہ نے خود ہی ان سے شادی کی فرمائش کی تھی۔ اس لڑکی کو مطالبات کی عادت تھی شاید۔ اچھی بات ہے۔ اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے۔ خوشیوں کے حصول کے لیے دل کی بات ظاہر کرنا۔ وہ آپا کی منظوری کے بغیر اس کے سامنے اقرار نہ کر سکے۔

دراصل آئے تو اسی مقصد کے لیے تھے۔ بلکہ بھیجے گئے تھے۔ آپا کی ایک رشتے کی منہ کنواری بیٹی تھی۔ کسی کنیڈین یا امریکن رشتے کے انتظار میں۔ بھائی صاحب نے کہا کہ جنید انہیں جا کر دیکھیں۔ مل کر کوئی فیصلہ کریں۔ اگر پسند آجائے تو فوری شادی۔ دوسری صورت میں گوجرانوالہ میں بھائی صاحب کی سگی بڑی بہن رہتی ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ جو اچھی لگے۔ اس سے شادی کر لینا۔ میں خود آپا سے بات کر لوں گا۔ وہ انکار نہیں کریں گی۔

ادھر جنید کی آپا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی سسرال کی کوئی لڑکی جنید کی بیوی بن کر آئے اور ان کے سینے پر مونگ دے۔ انہیں یہ رشتے پسند نہ تھے۔ مگر بھائی صاحب کے اصرار پر جنید میاں مجبور ہو کر آگئے۔ چچا جان کے گھر ہی ٹھہرنے کا پروگرام تو تھا مگر یہاں شادی کی گھما گھمی دیکھ کر پریشان تھی ہو گئے لیکن نوید نے انہیں تسلی دی اور اپنا کمرابھی دے دیا۔ کوٹھی بہت ہی وسیع تھی۔ آٹھ دس بیڈروم تھے۔ مہمان بھی آئے ہوئے تھے مگر۔ شادی سے پہلے تو اب وہ کہیں جا نہیں سکتے تھے لڑکی سے ملنے نہ گوجرانوالہ۔ یوں بھی آپا کا خیال تھا کہ لاہور والی منہ کی عمر زیادہ ہے۔ گوجرانوالہ والی بھانجیاں آفت کی پرکالہ ہوں گی۔ کیونکہ ان کے خیال میں چھوٹے شہر کی رہائشی لڑکیاں بڑے شہر میں آکر دیدہ ہوائی ہو جاتی ہیں۔ سہر حال اب تو انہوں نے سمانہ کے لیے اقرار کر لیا تھا۔ بخوشی۔ تقریباً ”صبح کو غنیمت آئی۔ دیر سے آنکھ کھلی۔ نوید اپنی الماری کھولے کھٹو پڑ کر رہا تھا۔

”کیا ہو نوید! تم ہو آئے نازی کی سسرال سے؟“ وہ کہنی کے بل بیڈ پر بیٹھے یا لیٹے تھے۔

”لو کہاں ابھی تو سو کر اٹھا ہوں اور امی نے منع کر دیا ہے۔“

جنید میاں کی کہنیاں چمک گئیں۔ دھپ سے بستر گرے۔ ”کیوں؟“ حیرت کی زیادتی۔ حواس باختہ ہو گئے۔

”امی نے کہا۔ ان لوگوں کو خود آنا چاہیے تھا معذرت کے لیے۔ فون کھڑا دیا۔ جیسے ہم اتنے کرے پڑے دھولی جلا ہے یا پتا نہیں کیا ہیں۔ پہل ادھر سے ہوئی ہے۔ وہی کم ذات ہیں۔“

تفصیلی بیان جنید کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ارے کیسے اللہ تو کلی لوگ ہیں۔ کسی کو اپنی بیٹی بہن کی زندگی کا خیال نہیں۔ کیا نازی بھی سمانہ کی طرح۔

”فون کر کے دیکھا تھا؟“

”کیا تھا بند تھا یا پھر خراب۔“

”ایچھنج سے۔۔ مطلب کھلینٹ کرو۔ اگر خراب ہو تو۔“

”ایک ہی شہر ہے۔ اب کیا وہ گھر بھی چھوڑ گئے ہوں گے۔ جانتے تو ہوں گے کہ یہاں سے کوئی دریافت حال کے لیے جا سکتا ہے۔ (جو کہ نہیں جا رہا)۔“

”اگر ماں سے کوئی گیا بھی تو یقین ہے گھر کے افراد ادھر رہیں گے۔ بیٹھ جائیں گے۔ ملے گا کوئی نہیں۔ پھر کیا ہم دیواروں سے سر پھوڑنے جائیں؟“ کس قدر یقین ہیں سب۔ وہ بستر چھوڑ کر اٹھ گئے۔ واش روم سے نکلے تو دیکھا۔ دنیا ان کا ناشتالائی تھی۔

”ارے میں نیچے آجاتا۔ سب کے ساتھ ناشتا کر لیتا۔“

”سب کے ساتھ۔ کس کے ساتھ۔“ ”دنیا منہ بنا کر بولی۔ ”سب سو رہے ہیں۔ جو اٹھتا ہے وہ چائے بنا کر پی لیتا ہے۔ نوید بھائی نے بتایا کہ آپ جاگ گئے ہیں تو باجی نے آپ کے لیے ناشتا بھیجا ہے۔“

”باجی شاہدہ نے؟ نہ جانے خود بھی کچھ کھایا پیاتے انہوں نے کہ نہیں۔ کتنی غمزہ اور پریشان تھیں رات کو بے چاری۔“

”اٹھا اٹھا خا۔“ مٹھکے اڑانے والی مصنوعی ہنسی۔ ”وہ تو مجھے کئی دفعہ کھائی چکی ہیں۔ پہلے بسکٹ اور چائے پھر آلیٹ بنا کر توس مکھن کھایا۔ اب گرم گرم نان کباب منگائے ہیں تو وہ کھا رہی ہیں۔“ ”دنیا خاصی ہنسوڑ تھی۔

”سب جنید نے ٹرے پر نظر ڈالی۔ نان کباب۔ چائے اور چند بسکٹ۔

”اچھا آؤ۔ تم میرے ساتھ ناشتا کر لو۔ میں اتنا نہیں کھا سکوں گا۔“

”نہیں جی۔ بسم اللہ کریں۔ میرا تو پیٹ فل ہے۔“

”تم نے کیا کھالیا۔“

”میں نان کباب۔ حلوہ پوری۔“

”حلوہ پوری؟“ ”ٹرے میں ایسا کوئی ذکر نہ تھا۔“

”پہلے حلوہ پوری منگائی تھیں۔ وہ مہمانوں نے چٹ کر لیں۔ اب نان کباب منگائے ہیں۔“ جنید

حیرت کے سمندر میں غرقاب۔ یعنی ان پریشان کن حالات میں یہ خاطر ہے۔

”اچھا۔ تمہاری سمانہ باجی نے بھی کچھ کھلایا کہ نہیں۔“

”ہاں تھوڑا تھوڑا۔“

”تھوڑا تھوڑا کیوں۔“ ”جنید چائے انڈیل رہے تھے کپ میں۔

”باجی نے کہا تم موٹی ہوتی جا رہی ہو۔ کم کھایا کرو۔ ورنہ کون تم سے شادی کرے گا۔ تو انہوں نے بس نان کباب اور تھوڑا سا حلوہ پوری کھا کر بس کر دیا۔ بسکٹوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ ”دنیا خاصی خبر رساں ایجنسی تھی۔

”اچھا۔ نازی نے بھی کچھ کھلایا۔“

”وہ تو سو رہی ہیں۔ رات بھر جاگتی رہی تھیں اس لیے۔“

”ہاں بے چاری۔ روتی رہی ہوگی رات بھر۔“

”کوئی۔ وہ کیوں روتیں۔ روتیں ان کے دشمن۔ وہ تو رات بھر شرجیل بھائی کو برا بھلا کہتی رہیں۔ کوستی رہیں کہ خدا کرے شرجیل کو کالی موٹی بھینگی لنگڑی دلہن ملے۔ اس کا کبھی گھر نہ بے۔ روتا رہے ساری عمر۔ خوشیوں کو ترے۔“ بیان میں خاصی روانی تھی۔

جنید کا دل عجب طرح سے دھڑکا۔ نان کباب حلق میں پھنسے لگے۔ بسکٹ کھا کر چائے پی لی۔ کیسے لوگ ہیں سارے بے حس، بے خبر، بے نیاز، صابر یا انتہا درجے کے لاپرواہ۔

”تم چلو۔ میں ابھی آتا ہوں نیچے۔“ ”دل گرفتگی سے بولے۔

”ارے۔۔ آپ نے تو کچھ کھلایا ہی نہیں۔ آؤھا کباب دو لقمے نان کے باجی ناراض ہوں گی کہ میں نے باتوں میں لگا کر آپ کی بھوک ماری ہوگی۔“

”نہیں بس۔ دل نہیں چاہ رہا۔“

”تو میں ٹرے لے جاؤں؟“ ”کہہ کر ٹرے اٹھالی۔

ایک نان ہاتھ میں دو چا پورا کباب منہ میں بھر لیا پھر منگتی ہوئی چلی گئی۔ فل پیٹ کے بعد۔ بے چاری

کام بھی تو بہت کرتی ہے۔ چلتے پھرتے اترتے چڑھتے کھانا، پیو ہو جاتا ہو گا۔ انہوں نے اسے بری کر دیا۔
سانہ کا خیال آیا۔ نازی کا حال بھی کیا سانہ جیسا ہو گا؟ یہ لوگ سوچتے ہی نہیں۔ انسان کو شش تو کرتا ہے۔ یہاں تو کوشش نام کا کوئی پرندہ پر نہیں مار رہا۔ نیچے گھما گھسی جوں کی توں موجود۔ مہمان میزبان سب باتوں میں ملن۔ نہ جانے اس گھر میں کتنے لوگ رہائش پزیر تھے اور کتنے مہمان۔ ان کی نظریں سانہ کو تلاش کر رہی تھیں۔

پھر نظر آ ہی گئی۔ سوئی دھاگا لیے نہ جانے کیا سی رہی تھی۔ وہ برآمدے میں ڈٹ گئے اور لوگوں کی مصروفیت دیکھنے لگے۔ کوئی ادھر سے ادھر کوئی یہاں سے وہاں جاتا آتا نظر آ رہا تھا۔ بس پھر یوں ہی نظریں سانہ پر ٹک گئیں۔ سانہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی نظریں اسے سوال کا جواب مانگ رہی تھیں۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے۔ آپاٹے ہاں کر دی۔ کیسے بتائیں۔ خیر یاہر آئے گی تو بتا دیں گے۔ اس نے کاسنی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنا ہوا تھا۔ کاسنی دوپٹے کے ہالے میں چہرہ چمک رہا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ خاصی خوب صورت لگ رہی تھی۔ بغیر میک اپ کے سانہ بے ریا چہرہ۔ کل کے مقابلے میں آج زیادہ اچھی لگی۔ زنان سلائی کر رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ بہت مضبوط کروار کی بہادر لڑکی جو اپنے برے حالات میں بھی خوش رہتی ہے اور لوگوں کو خوش کرتی ہے۔

ثانی جان اس سے باتیں کر رہی تھیں "غالبا" نصیحتیں۔ ابھی اس کے باہر آنے کے امکان کم تھے۔ وہ نازی کے کمرے کی طرف آگئے۔ دستک دے کر اجازت طلب کر کے اندر آگئے۔ نازی جاگ رہی تھی۔ چہرہ ستا ہوا۔ رنگ اڑا ہوا۔ لاکھ برا بھلا کہتی رہی ہوگی مگر روٹی بھی ہوگی۔ کمزور لگ رہی تھی۔ رنگت تو زرد تھی ہی بیمار بیمار سی سوگوار حسینہ۔
"تم نے پھر کوشش کی؟ اپنے منگیتر کیا نام۔ اس سے بات ہوئی؟"

"ہاں کرتی رہی۔ بدذات نے فون بند کیا ہوا تھا۔ مردود آلو کا پٹھا، کبھی کہیں ملا تو منہ فون لوں گی۔ بلکہ اس کے گھر جا کر یا پھر یونیورسٹی جا کر اچھی طرح دور کر دیناؤں گی۔ پھر چین ملے گا۔ چین ملے یا نہ ملے مگر اس کے اسٹوڈنٹ بھی اس کا منہ کالا ہوتا دیکھیں۔ فلاسفی پڑھاتا ہے اور انگلش لٹریچر بھی۔ سب ٹانگ کے رستے انگلش میں فلاسفی لکھے گی۔ جب کالا پیٹ اس کے منہ پر اسپرے کروں گی۔ جیسا ایک دل چلے ویل نے دوسرے ویل کے منہ پر کیا تھا کالے پیٹ کا اسپرے۔"

وہ جل بھن کر کوئلہ بنی جا رہی تھی۔ جنید زبان کی روانی اور بے ساختگی پر منہ کھولے ہونے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کوئی شک نہیں پاکستانی نئی نسل کی لڑکیاں اپنی ذلت کا انتقام لینا خوب جانتی تھیں۔ مگر وہ پیٹ ملے گا کہاں تمہیں؟ انہوں نے اس مشکل مرحلے کی طرف اشارہ کیا۔

"کوشش کریں تو کیا ہو نہیں سکتا۔ مل جائے گا۔ میں نے رات اکرم کو فون کیا تھا۔ اس کے گھر پر پیٹ ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے ایک کمرے کو ڈاک روم بنایا ہے۔ اس میں کالا پیٹ ہو رہا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ پر رکھا ہے۔ لے لینا۔ اکرم فونو گرافر ہے۔ ہم لوگ اس کے اسٹوڈیو میں ہی فونو بنواتے ہیں۔ شادی مندی کے لیے اسے ہی بک کیا ہے۔"

تفصیل روانی اور غم و غصہ۔ باجی شاہدہ اندر آئیں نازی کو ڈانٹنے لگیں۔

"تم ابھی تک سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی ہو۔ اٹھو ناشا کرو۔ نما کر پڑے بدلو۔ غضب خدا کا دوسرے کا ایک بچے کو ہے اور جنید! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

جنید نے باہر نکلنے میں ان کی تقلید کی۔ "جی باجی! کہیں۔"

کمرے کی زینت بنے ہوئے قیمتی قالین، جگہ جگہ بلوری یا چمکی ڈیکوریشن کا سامان۔ لمبے نیلے گلداران کونوں میں نکلی خوب صورت پھولوں کو آغوش میں لیے بیٹھے تھے۔ باجی شاہدہ کی فیملی کی تصاویر سے بھی دیواریں۔ ہینڈ پر نکلی خوش رنگ بینڈ شیٹ تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"جنید! تم کو نازی سے ہمدردی تو ہے نا تب ہی اتنی فکر کر رہے ہو۔ میں اگر تم سے کہوں۔ آج مندی کا لیکن اسی طرح ہو جیسا کہ ہونا تھا۔ یعنی جیسا ملے تھا۔" زرا سرار انداز میں بولیں۔

"جی؟ کیسے؟ مگر کیا؟" وہ کچھ دیر پہلے نازی کی تقریر سن کر جس طرح ہونق بنے تھے۔ باجی شاہدہ کی بات پر اسی طرح ہکا بکا ہو گئے۔ کیا لڑکے والوں سے بات ہو گئی۔ سوچ کر رہ گئے۔

"ایسے کہ تم نازی سے شادی کر لو۔ نہ کسی سے کچھ کہنا پڑے گا نہ رسوائی نہ شرمندگی۔ امی بھی اس بات پر راضی ہیں اور خاندان میں تو ایسا ہو بھی جاتا ہے۔" (سانہ کے ساتھ ایسا کیوں نہ ہوا) مگر بول نہ سکے۔ منہ کھل کر رہ گئے۔ احمقوں کے سردار۔

"اس میں کوئی برائی نہیں۔ بلکہ بہتر ہی ہے۔ تمہیں بھی آخر کبھی شادی کرنی ہی ہے۔ اب امی رات بھر سوئے نہیں۔ تم ہو جوان کی فکر دور کر سکتے ہو۔ پلیز ایک بے قصور لڑکی کی زندگی کا سوال ہے۔ میں تم سے نازی کی خوشیوں کی بھیک مانگ رہی ہوں۔" رونے لگیں۔

"لیکن میں تو۔۔۔ آپاٹے۔۔۔ بولانہ گیا۔" میں آپاٹے بھی اجازت لے لوں گی۔ خاندان کی بدنامی کا سوچو۔"

وہ سانہ کو سوچ رہے تھے۔ ابھی اس سے اقرار کرنا تھا۔ آپاٹے اجازت اور یہ باجی شاہدہ۔

"آپاٹے! کیا وہاں سے کوئی خبر آئی ہے؟"

رسوائی۔ لڑکی کی زندگی۔ تم اپنی بات کرو۔" باجی! ایک بار ان لوگوں سے بات تو کر لیں۔ صرف کسی نامعلوم فون کلر۔ اتنا بڑا فیصلہ۔ پلیز ایک بار۔" گھٹھیلنے لگے۔ گونگے کا گڑ کھانے "ارے ان لوگوں کے صبح شام دس فون آتے تھے۔ صلاح مشورے یہ وہ۔ شرجیل کے کئی فون آتے تھے۔ اب کل سے سناٹا ہے۔ اس کا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے فون خراب ہو۔" (گونگے کا گڑ کھانے کے بعد شاید)

"تو سارے لوگوں کے فون خراب ہو گئے۔ اس سرجیل شرجیل کا فون کیوں بند ہے۔ تم بتاؤ! کیا تمہیں نازی پسند نہیں۔ دیکھو! مفت میں دلہن مل رہی ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ اس سے زیادہ حسین لڑکی کہاں ملے گی بھلا۔ سوچ لو۔"

"میں کیا کہوں۔" سانہ نگاہوں میں دل میں سما چکی ہے۔ روح میں بس گئی ہے۔ اس نے خود خواہش کیا کروں؟

"غور کر لو اچھی طرح۔ ورنہ پھر ایک رشتہ اور ہے میرا دیور جو پولیو کا مریض ہے۔ لنگڑا تا ہے بچارا۔ میرے میاں کا تقاضا ہے کہ آج اسی سے نکاح ہو جائے۔ نازی کی قسمت پھوٹ جائے گی اگر اس سے۔ تمہارے سوا اور کوئی ہے بھی نہیں۔ بس وہی لنگڑا ہے۔"

جنید میاں کے سر پر ہتھوڑا لگتا تو اتنی اذیت نہ ہوتی۔ نازی۔ وہ نازک پھولوں کی ڈالی لنگڑا۔ منہ سے سکاری سی نکالی۔

"ہاں۔" بہت غم ناک شکل بنا کر گردن نیچی کر کے بولیں۔ "ہاں پولیو کی وجہ سے لنگڑا تا ہے۔ لکڑی کے سہارے بیڑھا ٹیڑھا چلتا ہے۔ کوئی رشتہ ملتا ہی نہیں اسے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ میں نے تمہارا سوچا۔ امی اب اسے ذکر کیا۔ وہ مان گئے۔"

جنید ہکا بکا ان کی شکل دیکھنے لگے۔ اتنا کچھ ہو گیا۔ سب نے پروگرام بنا لیے اور وہ خود سانہ کے تصور میں گم رہے۔ انہوں نے نظریں گھما کر پورے کمرے کا

جائزہ لیا۔ قیمتی نہیں، بیش قیمت مسلمان سے آراستہ باجی شاہدہ خود۔ سونے کے زیورات میں بلکہ ڈائمنڈ کے سیٹ سے آراستہ۔ ان کے شوہر اعلا درجے کے سرکاری افسر۔ وہ پولیو زدہ بھائی کا علاج کیوں نہ کرا سکے۔ لکڑی کی مصنوعی ٹانگ ہی لگوا دیتے۔ اس بے چارے کو لکڑی کے سہارے نہ چلنا پڑتا۔ کیا یہاں لوگوں میں حقوق العباد، حقوق اللہ کا جذبہ ختم ہو گیا۔ اقربا پروری کی مثال باقی نہیں رہی۔ زندہ گویں میں اتنا فرق۔ ایسی پستی۔ ایسی بلندی۔

”یہ مہندی اب بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سب کچھ۔ نازی کی زندگی کا یہ غم تمہارے ہاں کہنے سے۔ خوشیوں میں بدل سکتا ہے۔“ وہ گردن نیچی کیے بولے جارہی تھیں۔

”نا۔ نازی سے۔ آپ نے پوچھا؟“ حلق بند ہوتا جارہا تھا جیسے۔

”اسے میں سنبھال لوں گی۔ وہ لنگڑے سے شادی پر۔ آمادہ تو نہیں ہوگی لیکن تمہارے انکار کے بعد۔ تو پھر یہی کرنا پڑے گا۔ زبردستی۔“

وہ نظریہ آنے والے دھاگے بستر سے نوچنے کی تھک دہ میں تھیں بظاہر۔ لوگ بلاوجہ دوسروں سے توقع وابستہ کر لیتے ہیں۔ وہ متاسف اور متامل تھے۔

”پھر۔ لبا سے کیا کہوں۔ نتیجے ہو اس لیے وہ راضی ہو گئے۔“ وہ پر امید نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

جنید کشمکش میں تھے۔ ایک طرف وہ چاہتے تھے کوئی شریل یا اس کے ماں باپ سے مل کر تصدیق تو کر لے۔ دوسری طرف سمانہ کی پر امید خواہش۔ جنید کے جواب پر اس کی زندگی کی خوشیوں کا دارودار تھا مگر وہ ایک مضبوط قوت ارادی والی باحوصلہ لڑکی ہے اور نہ جانے کتنی مایوسیوں سے نبرد آزما رہی لیکن باری نہیں تھکی نہیں۔

اور نازی۔۔۔ اس کی اتری ہوئی روئی ہوئی صورت معصوم ارادے انتقامی بھکانہ جذبہ بدنامی اور عرصہ دراز تک شادی نہ ہونے کا سمانہ کی طرح لندھوری

پھرنے کا خدشہ۔ نہ جانے سمانہ پر بارات واپس جاسے کیا گزری ہوگی جواب نازی کے ساتھ ہونے جارہا تھا۔ خوف ناک بلکہ خطرناک صورت حال تھی۔ نازی لڑکی کا نام پتا کچھ بتایا نہ تھا۔ وہ تو مندوں سے پیچھے چھوٹنے کی خوشی میں فوری رضامند ہو گئی تھیں۔ اور۔۔۔ اوہر نازی پھولوں کی ڈالی۔ لنگڑے کی لکڑی کا سہارا اور وہ خود۔۔۔

شرمناک صورت حال تھی۔ ان کا جذبہ ہمدردی۔ کسی کے کام آنے کی خواہش۔ وہ مجبور ہو گئے۔ باجی شاہدہ خوشی کا نغمہ لگا کر ان سے لیٹ گئیں۔ مبارکباد دی اور باہر بھاگ گئیں سب کو خوش خبری سنائے جنید کو محسوس ہوا وہ خالی ہاتھ رہ گئے۔ دل بھی خال ہو گیا۔ کوئی امنگ نہ خوشی۔ مجبوری ہمدردانہ مجبوری۔ تکان سی ہوئی۔ بستر پر ہی گر گئے۔ مٹلی نرم بستر۔ یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے والا ہے ان کے ساتھ نازی کے ساتھ زندگی کا تصور عجیب۔۔۔ وہ ان سے بھی خلاف مرضی کچھ ہونے پر انتقام لے سکتی ہے۔۔۔ ان کے منہ پر سیاہ پینٹ اسپرے کر سکتی ہے۔ اور۔۔۔ گھبرا کر اٹھے باہر آئے باجی سامنے سے چلی آ رہی تھیں اقبال بو خیزاں۔

”چلو اب تم کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر لیتا۔ شام سے مہندی کا ہنگامہ شروع ہوگا رات گئے تک آرام کا موقع نہیں ملے گا۔ کھانا شروع ہونے والا ہے۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ بے چارگی۔

”ہاں۔ ناشتا خاصا ہیوی تھا۔ چلو وہ سب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”تاناہ سکے۔ ناشتا کیا ہی کب تھا مگر۔ چونک گئے۔

”کو۔ کون ملنا چاہتے ہیں۔“

”ہمارے مرد رشتے دار۔ جو آئے ہوئے ہیں۔“

”میں سب سے مل چکا ہوں۔“ بے زاری۔

”اوہوئے رشتے“ نئے تعلق سے بھی۔ ”زبردستی“

اب نازی کے پاس جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

”نازی۔۔۔ سمانہ! میں اس وقت آپ کو جواب نہ دے سکتا۔ لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ صبح پہلا کام آپ کو اپنی رضامندی دے کر اپنی پسند کا اقرار کروں گا۔ تب مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ آپ کے کردار کی مضبوطی۔ ہمت اور مگر میں شاہدہ باجی کو۔ انکار نہ کر سکتا۔“

”کوئی بات نہیں۔ بہر حال مجھے یاد رہے گا کہ کسی نے مجھے پسند کیا تھا میری بری شہرت کے باوجود۔ میں بہت قاعدت پسند ہوں۔ اور میرا اللہ اور تقدیر پر پورا یقین ہے۔ ہر انسان کو اس کے طرف کے مطابق اعمال سے نوازا جاتا ہے۔ میں ابھی بھی تقدیر کی مہربانی کی منتظر ہوں۔ میں نہ سہی نازی سہی۔ میں تو تقدیر کے اس وار کو بہادری سے رہی ہوں۔ شاید نازی نہ پائی۔ سب کی لاڈلی جو ٹھہری نازک۔ آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ میرے دل میں آپ کی قدر اور بڑھ گئی۔ جو میرا نصیب ہو گا۔ کبھی نہ کبھی مل جائے گا۔ ناامید نہیں ہوں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے پسند کیا۔“

وہ روئی سے بول رہی تھی۔ جنید بڑے صبر سے سن رہے تھے۔ اس کی ایک اور خوبی سے آگئی ہوئی۔ اس کی آواز دلچسپ اس کے کہنے ہوئے الفاظ کی سچائی کے کواہ تھے۔ کہیں کوئی جھول نہ تھا۔ نہ رقت نہ کپکپاہٹ۔ وہ مڑکر لاؤنچ میں چلی گئی۔

جنید کی اپنی پلکیں نم ہو گئیں۔ ہمدرد اور حقیقت پسند لڑکی۔ ان کے دل میں اس کی قدر اور گہری ہو گئی۔ چپ چاپ اوپر کمرے میں آگئے۔ جو دراصل نوید کا

نہ جانے کیا سلوک کرے گی۔ کوئی چیز اٹھا کر دے ماری تو۔ لاؤنچ سے سمانہ نکلی۔ بے خیالی میں ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نرم نرم اداسی تھی۔

”آ۔ آپ نے۔ میں نے سنا ہے۔ آپ نازی سے۔ شادی پر۔ راضی ہیں۔“ کیجے میں پھاس چھپی تھی۔ دل سے ہوکا اٹھی۔

تھا۔ چچی جان کے بقول۔ ”نوید کے تو سونے کا کوئی ٹائم ہے۔ نہ کھانے پینے کا۔ نہ جاگنے کا۔ جب جہاں جگہ مل جاتی ہے سو جاتا ہے۔ جب بھوک لگی کچھ بھی کھا لیتا ہے۔ اس کی وجہ سے تم البتہ ڈسٹرب ہو جاؤ گے۔ اس لیے بہتر ہے آرام سے رہو۔“

اور حقیقت بھی یہی تھی۔ نوید بہن کی شادی کے ہر معاملے میں پیش پیش بے حد مصروف تھا۔ اسے تو کمرے میں آنے کی مہلت ملتی نہ تھی۔ بس کپڑوں کی تلاشی میں آتا تھا۔ جنید کو یہ تنہائی غنیمت لگی۔ وہ بستر پر لیٹ گئے۔ جسم و جاں میں عجب طرح کی سنسناہٹ تھی۔ سوچنے یا کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ ورنہ اپنے کپڑے ہی استری کر لیتے۔ جو ہمیشہ خود ہی کرتے تھے۔ چچی جان کے کہنے کے باوجود دنیا کو نہیں دیتے تھے۔ سمانہ کو اپنی پسند تادی۔ محبت کا اظہار نہ کر سکے۔ واقعی ان کے دل اندر کہیں گہرائی میں سمانہ بڑی شان سے براجمان تھی۔ مگر اب اسے یہ بتانا۔۔۔ وقت کا ضیاع ہی تھا۔

آیا سے اجازت لینے کے بعد سمانہ ان کے خواب میں شریک زندگی کے روپ میں نظر آئی۔ چند گھنٹے کی نیند اور چند منٹوں کے خواب۔ کاش۔۔۔ اوہ باجی شاہدہ کو بتا دیتے۔ لیکن نازی اور لکڑی کے سہارے لڑکھڑاتا پولیو زدہ۔۔۔ اوہ نو! گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

”بھائی جان جنید! آپ کو نیچے کھانے کے لیے بلا رہے ہیں۔“ ”نیا تھی۔“

”اوقوہ جو حالات ہوں۔ جیسا وقت ہو۔ کھانے پینے کا سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔“

ان کی تو بھوک اڑ چکی تھی۔ مگر نیچے والوں کو تو لب اطمینان ہو گیا تھا۔ نیچے آگئے۔ بھوک نہ ہونے کا عذر کیا مگر کسی نے مانا نہیں۔ زبردستی کھلایا گیا۔۔۔ لذیذ تھا شوق سے کھالیا۔ واہ بھی۔

پھر نوید ایک شلوار قمیص لے آیا۔ ”یہ آج شام کے فٹکشین میں تم پہنو گے۔ تمہارے پاس تو شلوار قمیص ہو گا نہیں۔ اور ہاں ذرا جلدی تیار ہو جانا۔“

کہہ کر سوٹ وہیں کرسی پر رکھ کر وہ مصروف ترین

صاحب فوراً کہیں چل پڑے۔ جنید نے اس پر عمل کیا۔ یعنی نہا کر لباس تبدیل کر کے نیچے آگئے۔ وہاں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ خواتین نے گلے لگایا۔ دعائیں دیں۔ اس قسم کی کہ وہ تازہ زندگی دودھ میں نہا میں اور اولاد کسی پھل کی صورت ملے۔ دودھ سے نہلانے کا تصور خاصا اندونماک تھا۔ یعنی کہ مسلسل چپ چپ وہی کی بو اور مکیوں کی یلغار۔ مکی ہونے لگی۔ نوید کہیں سے تھکا ہوا آیا تھا۔ پوچھنے پر کہنے لگا۔

”مارکیٹ۔۔۔ باجی شادی کے ساتھ۔ تمہارے لیے کل پہننے کا کرتا پا جامہ اور شیر وانی سینے کا آرڈر دے کر آئے ہیں۔ کل شام کو لینے جانا ہو گا۔ باجی کے ساتھ مارکیٹ جانا ایسا ہی تھکانے والا سفر ہوتا ہے کہ بندہ فوت ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔“

وہ بھی نہانے کے لیے چلا گیا مگر بہت جلدی نہا کر آ گیا۔

”چلو۔ اب لان میں ہی چلتے ہیں۔ اسٹیج تیار ہے۔ دیکھنا کیا بمبائٹنگ سجاوٹ کی ہے میں نے اور میرے دوست بچھنے۔“

دونوں لان میں آئے۔ واقعی لان کی تو شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ شامیانے قناتیں۔ گیندے اور گلاب کے پھولوں کے ہار جا بجا لٹکے ہوئے تھے۔ داخلے کے لیے بہت ہی خوب صورت آرائشی گیٹ جو سبز پتوں اور زرد پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر قطار در قطار پھولوں کی لڑیاں۔ سبز قالین پر سرخ صوفے۔ روشنیوں کی چکا چوند۔ یہ مندی کا اہتمام ہے تو شادی پر نہ جلنے کس طرح کی آرائش ہوگی۔ بلا ضرورت اخراجات۔۔۔ گیٹ سے اسٹیج تک لان میں تین لائنیں کرسیوں کی تھیں۔ تین تین کرسیوں کی قطار درمیان میں پیدل چلنے والوں کے لیے سرخ قالینوں کی روش۔

نوید واد طلب نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی محنت کی داوند دینا نا انصافی ہوتی۔ جنید نے شاباشی دی۔ دونوں اسٹیج پر جا بیٹھے۔ برقی قمقمے الگ رونق کا سبب تھے۔ گو کہ ابھی رات نہیں آئی تھی مگر لائٹیں

سب آن کر دی گئیں۔ پھر خواتین آنا شروع ہوئیں اور کرسیاں بھرنے لگیں۔ پھر گلے والی لڑکیاں ڈھولک لے کر آئیں اور اسٹیج کے سامنے جگہ بنائیں لگیں۔ ڈانس پارٹی نے بھی گلے والیوں کے مقابل جگہ بنائی۔ باجی شادی گھر کے اندر موجود خواتین اور چچی جان کے ہمراہ آرائشی گیٹ سے گزر کر اندر آئے لگیں

فونو گرافر۔ اکرم پارٹی سمیت آگیا۔ لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا۔

گلو مبارک باد ی مائی جم جم منت منت۔
میرے جنید کی شادی مائی جم جم منت منت۔
نیا کی آواز سب میں نمایاں تھی۔ سامنے۔ وہ کہیں نہ تھی۔ ڈانس پارٹی اپنی گرو سے ہدایات لے رہی تھی کب جھکنا ہے۔ کب مڑنا ہے۔ کب ہاتھ بلند کرنے ہیں۔

سامنے نظر آگئی۔ وہ سیدھے ہاتھ والی رو میں بیچھے بیٹھی تھی۔ خاموش، غمگین خزاں رسیدہ تے کی مانند مرجھائی ہوئی۔ اس نے پیلے اور سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ خزاں اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی شاید اس نے بھی جنید کے خواب دیکھے تھے۔

جنید انفرنگی سے اپنے ہاتھ کھول کر لکیریں دیکھنے لگے۔ لکیروں کا جال تھا۔ کیا تھا ان لکیروں میں؟ ایک بار کسی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔

”خوش قسمتی آپ سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ آپ من پسند زندگی گزاریں گے اپنی پسندیدہ ہستی کے ساتھ۔“

خوش قسمتی؟ یا بے چینی۔ وہ اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ جو تقدیر ان کے ساتھ کر رہی تھی۔ جو پسندیدہ ہستی تھی۔ وہ دور جاتی نظر آرہی تھی۔

اور نازی۔ جس کی شادی خانہ آبادی کی تقریبات میں شرکت کے لیے نوید نے انہیں روکا تھا۔ آج وہ اسی کے ساتھ شادی پر مجبور ہیں۔ کیا یہ تقدیر کا اشارہ ہے۔ کیا اس کے لیے وہ عین اسی موقع پر کینیڈا سے آئے تھے۔ بچے ہوئے اسٹیج پر براجمان۔ دولہا کے

دوب میں۔
باجی شادی اور چچی جان اسٹیج پر آکر جنید کو گلے لگا کر دعاؤں دے رہی تھیں۔ ان کی دعاؤں میں معذرت اور تشکر کے جذبات موجود تھے۔ جنید کو بہت شرم آئی جب چچی جان نے ان کا شکریہ ادا کیا بدنامی سے بچانے کا نوید نے جنید کے دائیں جانب والے صوفے پر چچی جان کو بٹھا دیا۔ نوید خود نہ چلے کس کس کو کیا کیا ہدایات دے رہا تھا۔ پھر آرائشی گیٹ پر فونو گرافر دوڑے۔ دلہن اپنی کزنز اور سہیلیوں کے جلو میں سرخ سبز زرد رنگ کے لباس میں ہولے ہولے گیٹ سے درمیان رو ش پر آئی۔ اس کی سہیلیاں ہولے ہولے کچھ گاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ادھر سامنے گلے والی پارٹی نے جوشیلے انداز میں گانا شروع کیا۔ ڈانس پارٹی نے حرکت کی۔ لڈی شروع ہو گئی۔ لڈی ہے جمالو۔

پھولوں سے ڈھکی چھڑیاں لڑکیوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر مخصوص آواز پیدا کر رہی تھیں۔ فونو گرافر اسٹیج پر چڑھ آئے دلہن کے ٹولے کی تصویریں لینے کے لیے۔ اور وہاں موجود جنید نوید اور چچی جان کو روشنی میں نہلانے لگے۔ دلہن کو نوید نے سہارا دے کر اوپر جنید کے برابر والے صوفے پر بٹھایا۔ سہیلیاں بڑھ چڑھ کر پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ نوید ہدایت دیتا رہا۔

”اکرم! ادھر سے امی کو کور کرو۔ ہاں اب نازی کا سائیڈ پوز۔ جنید اور نازی کا ساتھ ساتھ۔“ جنید نے جوہر نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ارم کا لایا ہوا کالے جینٹ کاؤبل نظر نہ آیا۔

نازی بے زاری تھی۔ ظاہر ہے وہ خوش تو نہیں ہو سکتی تھی۔

”نازی! اتم راضی ہوتا۔ خوش تو ہو؟“ موقع ملتے ہی جنید نے پوچھ لیا۔

نازی نے شاید دانت پیسے۔ کچکا کر بولی ”یہ تو بعد میں بتاؤں گی۔“

پھر باری باری لوگ اوپر آتے۔ دونوں کو پیار کر کے

دعاؤں کے ہار پہنتے۔ نوید نے کہا۔

”امی! باکہ رہے ہیں۔ جلدی سے رسم کر لو۔ کھانا تیار ہے۔ ٹائم پر کھالیا جائے تاکہ لوگ گھروں کو جائیں بارش کا امکان ہے۔“

رسم کے لیے لڑکیاں مندی کے بچے ہوئے تھال لے کر آئیں۔ مہکتی پانچنی گاتی بچیاں۔ موم بتیاں تھال کے اندر روشن تھیں۔ ان کی جھللاتی روشنی بچیوں کے معصوم چہروں کو گلزار بنا رہی تھی۔

چچی جان کو دعوت دی گئی۔ ناز و انداز سے مسکراتی ہوئی آئیں اور پھر فوراً بیٹھ گئیں۔

”ارے شادی کو بلاؤ۔ کہنا میرے کمرے سے میرا پرس تولے آئے۔ اے بھئی۔ اس میں میرا چشمہ ہے جس کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔ اس میں رقم کا لفافہ ہے۔ سلامی کے لیے۔ فیا! جا بھاگ کے میرا پرس لا۔“

گلے والیوں نے موقع کی مناسبت سے مصرعہ اٹھایا۔

”منندی تاں سجدی۔ نازی کی امی رنج دی۔“
لڈی ڈالنے والیاں تو اتر سے صحیح قدم اٹھاتی ڈنڈیاں ایک دوسرے پر مارتی گھوم رہی تھیں۔

جنید کی نظریں پچھلی رو میں سامنے کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر سامنے وہاں نہ تھی اور یک دم بے ہنگم سا شور ڈھول کی ڈھما ڈھم۔ یک لخت سب کی نظریں آرائشی گیٹ کی طرف جم گئیں۔ جہاں لڑکیوں معورتوں کا ہجوم آگے بڑھ رہا تھا مگر اس سے بھی آگے۔ پیلے لباس میں ڈھول والے ڈھول پیٹے بے ہنگم شور کے ساتھ آگے آرہے تھے۔ ڈھول والوں کے پیچھے ایک زرتار دوپٹے کی چھتری تھی ہوئی تھی۔

”ہائیں!“ نوید اسٹیج سے نیچے کودا۔ دوپٹے کو لڑکیوں نے سر سے اونچا کیا ہوا تھا۔ ان کی کلاٹیاں چوڑیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ ہتھیلیاں مندی سے رچی ہوئی اس دوپٹے کی چھتری کے نیچے ایک پیلے کرتے میں ہنستا مسکراتا باش نوجوان دونوں اطراف کی کرسی نشین خواتین کو ہاتھ سے سلام کرتا ہوا آگے آگے۔

فوٹو گرافر نے فوراً رخ تبدیل کر لیا۔ اب۔ آنے والے ہجوم پر روشنیاں تھیں۔ روشنی میں نہاتے وہ درمیان کی روش پر چل رہے تھے۔ عجیب صورت حال تھی۔ چچی جان کے ہاتھ سے پھولوں کا ہار نیچے گر گیا جو وہ جنید کو پہنانے کے لیے لا رہی تھیں۔

”شرجیل! توید نیچے سے چلایا۔“

”شرجیل! نازی ایک چیخ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ جنید اس سے پہلے ہی کھڑے ہو چکے تھے۔

”شرجیل! شاہدہ باجی نے چیخ کر کہا۔ ”ان کا فون سچ خراب تھا امی! اور شرجیل کا موبائل کموڈ میں گر گیا تھا۔“

”چھوٹوں کی نہیں جنید بھائی! فون آپ نے سنا تھا نا۔ جب تو فون ٹھیک تھا۔“

اس نے جنید پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی۔ جنید موقع کی نزاکت کو سمجھ کر ایک لمحہ پہلے ہی اسٹیج سے نیچے کود چکے تھے۔ نازی زخمی شیرینی کی مانند غرائی ہوئی ان کے پیچھے۔

”جاتے کہاں ہیں۔“

جنید نے خطرہ سر پر منڈلاتا دیکھا تو زقہ بھری۔ نازی نے لڈی ڈالتی ساکت کھڑی لڑکیوں کے ہاتھ سے دو ڈنڈیاں جھپٹیں اور دوڑی جنید کے پیچھے۔ اب چشم تماشا نے کیا نظارہ دیکھا۔

سامنے زر تار دوپٹے کے سائے تلے اصلی دولہا مسکراہٹیں بکھیرتا آ رہا ہے۔ دلہن ایک نوجوان کا تعاقب کرتی ہوئی دوڑ لگا رہی ہے۔ چیختی چلاتی۔ اصلی دولہا اور ان کا ٹولہ رک کر تماشا دیکھنے لگا۔ ان کو دھکا دیتا ہوا ایک شخص اس کے عقب میں دلہن بنی نازی۔ اصل دولہا کو ہاتھ کے اشارے سے ہٹاتی گیٹ کی جانب۔ مگر گیٹ آنے والیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ جگہ کمی نہ راستہ۔ اب جنید نے دوسری کرسیوں کے ساتھ والی روش پر دوڑ لگائی۔ ڈنڈیاں اچھالتی نازی۔ حواس باختہ نوجوان کے پیچھے اکرم کو پکارتی جاری تھی۔

”اکرم! وہ اسپرے لاؤ۔ جلدی۔“

اب جنید میاں نے خواتین کے اوپر جو چھلانگ لگائی تو قنات کے اوپر جا کرے۔ قنات کا بالٹس گلی کیاری میں ٹھونکا گیا تھا۔ ان کے حملے سے نیچے گرا۔ جنید میاں نے کیاری پھلانگی اور قناتوں کے پیچھے سے بکٹ دوڑ لگائی۔ مرکز کو دکھائی نہیں۔ باجی شاہدہ نے بروقت نازی کا راستہ روکا۔

اب وہ شرجیل کے ساتھ اسٹیج کی طرف آرہی تھی اکرم کی تیز روشنیوں کے ساتھ۔ شرجیل نے کبھی مار کر پوچھا۔

”کیا ہوا تھا۔ کس کے ساتھ ریس لگا رہی تھیں۔“

”وہ میں کل بتاؤں گی۔“ نازی اسٹیج پر چڑھ گئی۔

جہاں اس کی امی بھائی نوید اور ساری سہیلیاں قہقہے لگا رہی تھیں پھر یہ قہقہے ہر طرف سے اپنے لگے۔ لڈی ڈالنے والیاں پیٹ پکڑے لوٹن کیو تر ہو رہی تھیں۔ ایک نئی قسم کی لڈی نے سنسنی پھیلا دی۔ پھر کسی نے چلا کر کہا۔

”سانہ کو بلاؤ۔ وہ اس موقع پر پھر کتا ہوا گانا گائے گی۔“

سانہ۔ اندر کوٹھی کے برآمدے میں کرسی پر بندھال بیٹھی تھی۔ جب اس نے جنید میاں کو چشم پٹیمے ہونے حال سے بے حال آنے دیکھا۔ کپڑے گھاس اور مٹی سے بھرے ہوئے جوتے کچھڑے۔ سیدھے سانہ کی طرف آ رہے تھے۔ پچا جان جو کھانے کی نگرانی کے لیے پچھلے صحن میں تھے۔ دریافت حال کے لیے ادھر آئے۔ جنید کو دیکھا۔

”کہاں۔ کہاں جا رہے ہو بیٹا! کیا رسم ہو گئی؟“

”بائے خبرے اباجان۔“

”پچا جان! آپ سے ایک درخواست ہے۔“ ہانپ رہے تھے۔

”ہاں ہاں بیٹا کہو۔“ لڑکا جو بھتیجا تھا۔ محسن بھی تھا اور داماد بننے جا رہا تھا۔

”پچا جان! ادھر اصلی دولہا والے آگئے ہیں۔“

سانس لینے کو رکے۔

”پچا میاں! میں آپ سے سانہ کو۔ مطلب سانہ

سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے۔ سانہ کی اور میری مندی بھی نازی کے ساتھ ہو جائے۔ آپ خوشی سے اجازت دے دیں۔“

پچا جان ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔ وہ سب سے نیچے گرا۔ پلاسٹک کا تھا۔ سوچ رہا باورچیوں کے لیے پانی لینے آئے تھے۔ پھر کچھ غور کیا۔ لان سے آسمانوں کی آوازوں نے صحن تک رسائی حاصل کر لی۔ سانہ بھی اٹھ کر قریب آئی۔ جنید میاں کا حلیہ تو کوئی اور کہانی سنا رہا تھا۔ پھر ہنستے ہوئے نوید نے آکر بابا کو وہ خبر سنائی۔ جس کو سن کر اباجان نے بھی قہقہہ لگایا۔

”خوب! خوب! فون واقعی خراب تھا۔“

پھر انہوں نے جنید میاں کی درخواست اور ان کے حلیے پر غور کیا۔ سانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چلو بیٹی! آج تمہاری مندی بھی ہو جائے اور آج ہی نکاح بھی۔ نوید! جنید میاں اور سانہ کے نکاح کے لیے مولوی صاحب کو بلا لاؤ۔ آج ہی یہ فرض بھی ادا ہو جائے۔“

نوید منہ کھولے کھڑا تھا۔ لپک کر قریب آیا اور جنید کے گلے سے لپٹ گیا۔ ”زندہ باؤ۔“

پھر وہ باہر کو دوڑ گیا۔ مولوی کی تلاش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ آخر کل جو فون آیا وہ کس کا تھا؟

پچا جان جب ان دونوں کو لے کر مندی کے فیکشن میں پہنچے۔ رسم شروع ہو کر ختم کے قریب تھی۔ انہوں نے شاہدہ کو پکارا۔

”بیٹا شاہدہ! جنید میاں اور سانہ کی مندی بھی آج بنانا پھر نکاح ہو جائے گا۔“ بے شمار گردنیں اٹھیں۔ مڑیں اور ایک بار پھر قہقہے بکھر گئے۔

باجی شاہدہ نے جنید میاں کو اشارہ کیا۔ اوپر آئیں۔ سانہ کو پکڑ کر لائیں۔ پھر افسوس سے بولیں۔

”جنید! جوتے تو بدل لیتے۔ کچھ قالین گندا کر رہی تھی۔“

”باجی! دلہن بدل لی۔ یہ کافی نہیں؟“

اور باجی شاہدہ سوچ رہی تھیں۔ کل پہننے والے سوٹ اور سیر والی جوتے۔ اب ان کی۔ سیمنٹ کون

کرے گا۔ مہنگا سودا۔

شرجیل نازی سے پوچھ رہا تھا۔ ”آخر کل جو فون آیا۔ وہ کس کا تھا؟“

جنید میاں اب حواس میں آکر سوچ رہے تھے۔ ”کل جو فون میں نے سنا تھا۔ شرجیل کے گھر سے نہیں تھا۔ تو پھر کس کے گھر آج قیامت ٹوٹی ہوگی؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بساط دل	آمنہ دیاخ	500/-
دور موسم	راحت جبین	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار مدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار مدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
حیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فائزہ افکار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افکار	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افکار	250/-
یہ گلیاں یہ چوہا رہے	فائزہ افکار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جاگس خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو ضد تھی مسیحا سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماوس کا چاند	بٹری سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	500/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ایک خرچ 30/- روپے منگوانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اوپن بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361



”خدا پوچھے ان کم بخت ماریوں سے۔۔۔ لے کے سارا صحن برباد کر کے رکھ دیا۔۔۔ باندیوں کی طرح اچھل اچھل کے ٹانگ بھر زمین کھود ماری ہے جیسے بیروں میں جوتوں کے ساتھ کدالیں لگا رکھی ہوں۔“ ممتاز نے غصے سے با آواز بلند کہتے ہوئے خاصے جارجانے انداز میں پانی سے بھری بالٹی کچے آنگن میں اچھالی تھی۔

چھپاک سے پانی پڑتے ہی گرد اوپر کواٹھی۔ کنگھی سے بال سلجھاتی طاہرہ کوماں کا تینا بلا وجہ ہی لگا تھا۔ آخر کو شادی والے گھر میں ہر چیز ٹیٹ ہو ہی جاتی ہے۔ فیکشن توکل سے شروع ہوتا تھا۔ مگر رات میں خلاف توقع نوشہ امان اللہ کی چار عدد بہنیں۔ اپنے درجن بھر بچوں اور ایک عدد میراثی کے ہمراہ آدمکیں کہ ”جی ایک ہی تو بھالی ہے ہمارا۔ سوچا ذرا آپ کے ہاں بھی کھنٹل میلہ لگالیں۔“

اب یہ ویر کے دیاہ کی ہی اتنی چاہ تھی کہ میراثی کے حلق پھاڑ سرائیکی ماہیوں اور ٹیوں۔ وہ جتنا ڈانس پیش کیا کہ برسوں سے خوب جما جمایا کچا آنگن ایک ہی رات میں گھر دوڑ کامیدان لگنے لگا تھا۔

”ہم نے بھی اپنی شادی خوشیوں پہ جھومیں ڈالی ہیں۔ مگر انسانیت کے جامے میں رہ کر اگر یہ کسی ہرے بھرے گھیت میں اس طرح خوشی منانے پہ آجائیں تو اللہ قسم وہاں اگلے دس سال تک کوئی پتی نہ پھوٹے ہاں۔“ ممتاز کی لہجہ ترانیاں جاری تھیں۔

خالی بالٹی کھرے میں رکھ کر ٹوٹی کھول دی۔ ”رے اماں! بانی ڈالنے سے پہلے صحن میں مٹی

بھریج اچھال دیں۔ نل شدہ زمین کاشت کے لیے بالکل تیار ہے۔ ہر روز کی تازہ سبزیاں اور ساتھ میں سبزود ہریالی کا الگ منظر۔ واہ واہ۔“ جوتے پالش کرنے عمران نے اپنی بات سے خود ہی لطف لیا۔

”آپ خواجواہ پانی ضائع کر رہی ہیں۔ آخر وہ دھوا والے ہیں۔ انہوں نے ہی تو ناچنا گانا ہے۔“ حمیرا نے آگے بڑھ کر ٹوٹی بند کر دی۔ رائل بلیو جارجٹ کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس بالوں کی سادہ چوٹی بنائے وہ

بالکل تیار تھی۔ اسے طاہرہ کے ہمراہ ابھی کچھ دیر میں دو لہا والوں کے ہاں جا کر سمیرا کا کمرہ سیٹ کرنا تھا۔

”اب اگر شادی پہ اسی طرح ہڑونگے مار کر صحن کا ستیاناس کیا تو ڈیوڑھی میں روک دوں گی۔“ کیلے ہاتھ پوچھتے ہوئے ممتاز نے کہا تو حمیرا اور طاہرہ دونوں بیک وقت مسکرا دیں۔ وہ ماں کی نفاست پسندی سے بخوبی واقف تھیں۔ ذرا سی گرو بھی ان پہ گراں گزرتی۔ گھر میں چپل کھینٹ کر چلنا منع تھا۔ کئی بار عزیز علی کی توجہ صحن پختہ کرنے کی طرف مبذول کرانی تھی۔ مگر وہ ہر بار ایک ہی جواب دے کر خرچ سے صاف دامن بچا جاتے۔

بارشوں سے نہیں مہکتا کبھی مجھے پکا آنگن نہیں چاہیے سنہری پالش والا فرنیچر ابھی ابھی پہنچا تھا۔ وہ دونوں آئیں تو بہن کا کمرہ سیٹ کرنے تھیں مگر اماں کی بہنوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ بیڈ کھڑکی کے ساتھ ہی مناسب لگتا تھا۔ مگر حقیقتہً اور شاہدہ نے مل کر اسے

کونے میں شفٹ کر دیا۔ جس سے بیڈ کے کراؤن کی وجہ سے آؤمی شیٹ چھپ گئی تھی۔ لفافوں میں سلپتے سے بند جینز کے جوڑے نکال کر ڈنگروں میں لگائے ڈھیروں انہیں ٹھونکنے کے بعد کپڑے دیوار سے لٹکا دیے۔ جرسیاں، شالیں، صوفوں کی بیک اور بیڈ پہ پھیلا دیں۔ کراکری اور دیگر سامان ڈبوں سے نکال کر پورے کمرے میں پھیلا دیا۔ تاکہ آنے والے مسافروں کو جینز کا ہر آئٹم بغور دیکھنے کو ملے۔ حمیرا اور طاہرہ نے کئی بار خنیا کہ ان کے ہاں ایسی نمود و نمائش کا کوئی تصور نہیں ہے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

انہوں نے سامان کی پینٹنگ میں سارا دن لگایا تھا۔ اب ان چاروں نے ڈبوں کو چیر بھاڑ کر اپنے انداز میں

سجانے میں پانچ منٹ لگائے تھے۔ کمرہ کسی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا۔

”یہ اماں نے آپ بہنوں کی پستانیاں دی ہیں۔“ حمیرا نے پیک شدہ جوڑے اختر کی طرف بڑھائے۔ ”ہاہ! ہماری یہ پستانیاں ہیں تو پھر یہ کیا ہے۔“ اختر

نے تعجب سے کہتے ہوئے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ابھی سمیرا کے جوڑے لٹکائے گئے تھے۔

”جی! یہ تو جینز ہے باجی کا۔“ حمیرا ہلکا کر بولی۔ ”مجھیں نہیں۔ اختر ہی بہن کے کہنے کا مطلب

ہے ہم چاروں ہمیں اپنی بھابھی کے جینز میں سے اپنی پسند کا جوڑا لیں گے۔“ ذکیہ نے اس کی مشکل حل کر دی۔



وہ دونوں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”ہمارے ہاں تو رواج ہے۔ منڈے کی بھینس اپنی خوشی سے بھر جاتی کا جوڑا لیتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھر جاتی کے دل میں اپنی منڈوں کے لیے کتنی چاہ اور محبت ہے۔“ شاہدہ ان کی اتاری ہوئی شکلیں دیکھ کر بولی۔ پھر آرام سے جھلمل کر تارا نل بلیو جوڑا اتار لیا۔ جسے سمیرا نے بطور خاص ملتان سے منگوایا تھا۔

”واہ بھین (بھن) میری! خود تو اچھی چیز لے لی۔ یہ تا ہوا کہ پہلے بڑی بھن کو پسند کرنے دیتیں۔“ اختر نے شاہدہ کو طنز سے دیکھا تھا جو پُر شوق نگاہوں سے سوٹ خود سے لگائے کھڑی تھی۔

”ارے بی بی! کتنے سارے بھر جاتی کے جوڑے ہیں۔ کوئی دوسرا لے لو۔“ شاہدہ نے فراخ دلی سے آفر کی۔

ذکیہ اور حفیظہ بیک وقت پھرتی سے سرخ کا مدار کریب کے سوٹ کی طرف لپکیں۔ حفیظہ کا قد اونچا تھا، سو وہی کامیاب ٹھہری۔ اختر کو ابھی تک منتخب کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ سارے ہی کپڑے خوب صورت اور مہنگے تھے۔

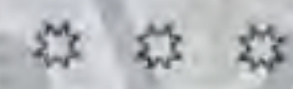
”آپ لوگوں کو چاہیے تھا، یا جی سمیرا کے آنے کے بعد ان کی اجازت سے سوٹ لیتیں۔“ باوجود ضبط کے حمیرا کا غصہ چھلک ہی پڑا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی تھی۔ ان کپڑوں، بلکہ جینز کی ہر چیز کے ساتھ اس کی بھن کے رنگین خواب جڑے تھے۔ کتنی مشکلوں سے اس کے اماں، اماں نے یہ سب کچھ اکٹھا کیا تھا۔ پورے جینز میں سے صرف کپڑوں کی خریداری میں ہی سمیرا نے وچسی لی تھی۔ باقی سب کچھ بھنوں کی پسند پر چھوڑ دیا تھا۔ اب جینز کے چار خوب صورت اور مہنگے جوڑے ان بے خس اور مطلبی خواتین کے قبضے میں دیکھ کر دل چاہا خوب کھری کھری سنائے۔ مگر مصلحتاً ”لب سی لے لے“ کہہ کر نیا نیا سبجوگ تھا۔

”ارے اجازت کی خوب کہی۔ بھلا بھابھوؤں سے کوئی اجازت لیتا ہے۔ منڈ بھابھی میں کوئی تیری میری نہیں ہوتی۔“ ذکیہ نے اپنی نوکیلی آواز میں حتمی کیا۔

”اور بعد میں لے کر کیا کرتے“ ہمارے ہاں تو بلی جوڑے شادی میں پہننے کا رواج ہے۔ تاکہ برادری کو جان چلے کہ ہماری اکلوتی بھر جاتی کیا کچھ لے کر آئی ہے۔ دوپٹا شانوں پہ پھیلاتے اختر جھوم کر بولی تھی۔

”چلو طاہرہ! کافی دیر ہو گئی ہے۔“ حمیرا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ سننا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ ”سمیرا باجی کو جب پتا چلے گا کہ ان کے فیورٹ جوڑے ان کی ندیدی منڈوں نے ہتھیالے ہیں تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔“ راستے میں چادر سے لپکی آنکھیں پونچھتے ہوئے حمیرا گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ بے حد جذباتی اور نادان۔

”اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ طاہرہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔



اور شادی کے تین دنوں میں ان چاروں بھنوں نے ممتاز کا وہ ضبط آزمایا کہ وہ اس گھڑی کو کون سے پر مجبور ہو گئیں جب انہوں نے اماں اللہ کی اچھی شہرت اور اکلوتے پن کو دیکھتے ہوئے سمیرا کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔

مندی کی رسم کے بعد اختر وغیرہ نے چند ایک مہمانوں کے ہاتھ پہ مٹھائی رکھی اور باقی ساری واپس گھر لے گئیں۔ سالن کی مقدار بڑھانے کے لیے دیگوں میں اپنی مرضی سے بالٹی بھر پانی اندیل دیا۔ نتیجتاً سوپ نما سالن میں روٹی بھگو کر کھانا پڑی۔ رخصتی سے قبل مہمانوں کی تواضع کے لیے دکی

گئی میں کے میووؤں والا سوچی کا حلوہ پیش کیا گیا۔ عین موقع پر بجلی دغا دے گئی۔ طاہرہ جب تک چار جنگ لائٹ کا انتظام کرتی اس وقت تک ذکیہ اینڈ کمپنی سارا حلوہ لفافوں میں بھر کر اپنے پرسوں میں ٹھونس چکی تھیں۔

خدا خدا کر کے بینڈ باجوں کے شور میں رخصتی عمل میں لائی گئی۔ پیا کے آنگن میں قدم دھرتے ہی سمیرا

کو رسا“ دلہن روک دیا گیا۔ اونچی ہیل کی وجہ سے بیروں میں ہلکا سا درد ہونے لگا تھا۔ بے تحاشا گرمی، گرامیک اپ زیورات اور بو جھل جوڑے میں جانے کب سے ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے کرا کر چکی تھی۔ کان پھاڑنا ڈھول۔ میراٹھ کی چٹنی آواز۔ بے چہرہ قہقہے اور تالیوں کا شور۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔

”بھابھی! جب تک اباجی سے کوئی بڑی فرمائش نہ پوری کروالینا۔ اندر نہ جانا۔ آخر کو اباجی گھر کے سربراہ ہیں۔ شاہدہ اس کے پاس آکر چیخی تھی۔

”صرف میری سزا معاف کر دو۔ مجھے اندر تک کر بیٹھنے دو۔“ اس کے دل نے التجا کی تھی۔

”بھر جاتی! تو ابے سے بھوری سبج مانگ۔ صبح شام پانچ گھنٹہ دیتی ہے۔ ساری زندگی تو اس کا دودھ پیتی رہنا۔“ ذکیہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”ارے بھوری تو بوڑھی ہو چکی ہے۔ سال دو سال بعد تک جلتی ہے۔ تو کالا کٹا مانگ۔ بیچ کر ہزاروں کماؤ گے۔“ اختر نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھا تھا۔

”جیب کرو، ساری کم عقل ہو۔“ غلام فرید نے جوت کر کہا۔

”میری اکواک نوں (ہو) ہے۔ پورے گھر کی مالک ہے، ہر چیز اس کی ہے۔“ بڑی محبت سے کہتے ہوئے غلام فرید نے کرتے کی جیب سے پانچ سو نکال کر سمیرا کے حتمی ہاتھ میں دبا دیے۔

اور پھر کلمہ شکر پڑھتے ہوئے اس نے اندر کمرے میں باؤں رکھ دیا تھا۔



”بھئی پھلے بخیر و عافیت سر انجام پانے والی شادی کے آثار تقریباً“ مٹ چکے تھے، مگر اعزہ و اقارب کی گھر میں آمد جاری تھی۔ پورے گھر میں خوشی کے جھلنے لہانے کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

”آخر میرے چچا کو کیا ہوا تھا؟“ سعیدہ نے برقع

اتارتے ہوئے ذکیہ سے پوچھا تھا۔

”بس کیا بتائیں۔ اچھے بھلے بنتے مسکراتے اباجی، صبح سینے میں درد اٹھا۔ اتنا ظالم درد تھا کہ ڈاکٹر نے بڑے ہسپتال لے جانے کو کہہ دیا۔ ابھی تک کچھ بتا نہیں۔“ اختر نے کہتے ہوئے منہ پر دوشہ رکھ لیا اور سسکنے لگی۔

”موصول رکھو۔ چاچا خیر سے واپس آجائیں گے۔“ سعیدہ نے آگے بڑھ کر گلے لگایا اور تسلی دینے لگی۔

”سمیرا بھلا چنگا اباجی۔ شادی پر ایسی جھومر ڈالی کہ سب حیران رہ گئے۔ پتا نہیں کس کم بخت کی نظر لگ گئی ہمارے بٹے کٹے پیو کو۔“ شاہدہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

سہ پہر کو اماں اللہ نے فون پہ غلام فرید کی طبیعت سنبھالنے کی اطلاع دی تو بے قرار دلوں کو ذرا سکون ملا تھا۔

”اری حفیظہ! یہ تیرا بیٹا ہے نا۔ بڑے والا۔“ چاچی و سالی نے تنگ جینز پہ ٹائٹ سرخ شرٹ پہنے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ہاں چاچی! یہ میرا دلدار ہے۔ گھرو جوان۔ پورا شاہ رخ خان لگتا ہے۔“ حفیظہ نے بڑی محبت اور خرس اپنے سپوت کو دیکھا تھا جو اپنے بالوں کے سپائیکس بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ٹھیک کہا تو نے بہت ہکلاتا ہے۔ کیا تو نے بیٹے کا علاج نہیں کروایا تھا۔“ چچا زاد و لشاد نے مصنوعی تفلر سے پوچھا تھا۔ اختر و لشاد کی بات پہ مسکرانے لگی تھی۔ حفیظہ کو و لشاد کی بات سے زیادہ بھن کی مسکراہٹ نے آگ لگادی۔

”نہ خدا خواستہ ہکلائے کیوں لگا۔ اچھا بھلا روائی سے بھائی کو ڈانٹ رہا ہے تو سن تو رہی ہے۔“ حفیظہ نے ترخ کر جواب دیا۔

”وے و لشاد! تو بخول نہ کر۔ میرا بھانجا اصلی نہیں تو نفلی شاہ رخ خان ضرور لگتا ہے۔“ اختر ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

حفیظہ نے دانت کچکچا کر اختر کو دیکھا تھا۔ جب سے اس کی بیٹی لینے سے انکار کیا تھا اس وقت سے اختر اس کے بیٹے کے پیچھے بڑی ہوئی تھی۔ سخت طیش کے

عالم میں پیر پختی سمیرا کے لمبے میں آگئی۔
 ”ارے بھرجانی! تو کیوں ایسے منہ دھو کے بیٹھی ہے۔ نویں کنوار (دلہن) ہے۔ ہماری طرف کا کوئی شوخ جوڑا پس۔ اپنے جیز میں تو سارے پھیکے بے رنگوں والے جوڑے لائی ہے تو۔ تھوڑا میک اپ بھی کر لے۔“ وہ دھپ سے صوفے پہ نیم دراز ہو گئی اور سمیرا کا نقدانہ جائزہ لیا۔
 ”ارے نہیں باجی! اچھا نہیں لگتا۔ اباجی خیر سے گھر واپس آجائیں تو سچ سنو رلوں گی۔“ سمیرا حفیظہ کے تند انداز اور جانتی نظروں سے گھبرا کر بولی۔
 ”ناں تو ہمارے ابا خدا خواستہ کوئی اثاثہ تو نہیں ہو گئے جو تو سوگ کی تیاری میں ہے۔“ شاہدہ نے اندر آتے ہوئے سمیرا کی بات سن لی اور چہختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہم چاروں اپنے اپنے کی لاڈلی دھیاں (بیٹیاں) ہیں۔ ہم نے بھی تو حوصلہ رکھا ہوا ہے تو نئی نویلی دلہن ہے۔ گھر پر اداری سے بھر رہا ہے۔ تجھے یوں منہ دھلا، مسلے ہوئے کپڑوں میں دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ تو نے امان اللہ کو پسند نہیں کیا یا تو اس کے دل میں نہیں اتر سکی۔ اٹھ کر یہ آگئی گلابی جوڑا پس لے۔“

ذکیہ کی آخری بات یہ گھبرا کے اس نے فوراً ”جوڑا تمام لیا تھا۔ اس کی بری کے سارے جوڑے ایسے ہی تھے۔ تیز رنگوں والے شوخ بھڑکیے، گھٹیا نگوں اور نوکیلے ستاروں سے مزین، جنہوں نے سمیرا کے بازوؤں اور گردن پہ لاتعداد خراشیں ڈال دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا کسی بھی قسم کا انکار نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوگا، سوچ چاہ ان کی ہدایات پر عمل کیے گئی۔

”اور یہ پلنگ پر سوتی چادر کیوں پچھی ہوئی ہے۔ وہ ریشمی کیا ہوئی۔“ شاہدہ کی نظر بیڑ پہ اب پڑی تھی۔
 ”گرمی کی وجہ سے چادر بدل دی ہے۔“

شاہدہ نے اس کی وضاحت ان سنی کرتے ہوئے سوتی چادر لپیٹ کر رہی پھولدار چادر بچھا دی۔ آخر بھی

پٹی سے سالن نکال کر سجانے میں مدد کرنے لگی۔
 ”دیکھا۔ کیسے کمرہ بھرا بھرا لگنے لگا ہے۔“ شاہدہ مسرت سے گھوم کر دیکھا تھا۔
 ”ہماری چاچی اور یوانے تمہیں کتنی سلامی دی ہے؟“ اختر نے سرگوشی انداز میں اس سے پوچھا۔
 ”جی بچاس روپے۔“ وہ سادگی سے بولی۔
 ”کیا صرف بچاس روپے؟“ تینوں بہنیں ایک ساتھ زور سے چہچہاں تھیں۔

”بس اتنی خوشی ہے ان کو ہمارے اکلوتے بھائی کی شادی کی۔ تین دن ٹھونس کر کھایا ڈیگ کے ساتھ جم کر بیٹھیں۔ اپنی مرضی سے بوٹیاں نکلوائیں، پر دل لگا چھوٹا؟“ شاہدہ نے نفرت سے ہونٹ سیکیڑے۔
 ”اور ہماری بھولی بھرجانی کو دیکھو، ان کے سامنے خاطر کے لیے سوڑے کی بوتلیں رکھ رہی ہیں۔ ڈیڑھ سو کی بوتل اور سلامی صرف بچاس روپے۔ نرا اپنا نقصان۔“ ذکیہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

”تم ایسا کرو آئندہ مہمانوں کے آگے مہندی اور نکاح کی مٹھائی رکھ دینا۔“ اختر نے مشورہ دیا۔
 وہ جواباً خاموش رہی۔ کیا بتاتی نمک پارے اور میٹھی بوندی تو منہ میں رکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ جی مسئلہ لگتا تھا۔ البتہ ریوڑیاں اپنے اصلی ڈالنے میں موجود تھیں۔

کھڑکی سے چند ہسائیاں گھر میں آتی دکھائی دیں تو وہ سب باہر گھن میں آگئیں۔
 اسے یوں سجا سنورا دیکھ کر چند ایک بزرگ خواتین نے اچنبھے سے انگلی ٹھوڑیوں پہ رکھ لی تھی۔ اسے بے حد شرمندگی ہوئی، مگر ان چاروں کو تو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

اپنی ہی باتوں میں مگن مجمع اس وقت ساکت رہ گیا جب غلام فرید کو دل کا دورہ پڑنے کی اطلاع آئی تھی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے تھے۔

”دیکھ منوں! ابے کے بعد اب تو ہی تو اماں کا سہارا

ہے، تیری شادی اس لیے نہیں کی کہ تو بیوہ ماں کی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کے زال (بیوی) کے گوڈے سے لگا رہے، ہم نہیں اپنے گھر کے بکھیرے سمیٹیں یا اور پرکے (پکے) کی خبر لیں۔“
 لبا کے سوئم اور عزیت کے لیے آنے والوں کا رش کم ہوا تو آج چاروں بہنیں اسے گھیر کر بیٹھی تھیں۔
 حالانکہ مینے کے اندر اندر سمیرا نے سارے گھر کا کام سنبھال لیا تھا۔ ساس کا بھی مقدور بھر خیال رکھتی تھیں، بنوں کے ماتھے کے بل ہی کم نہ ہو پاتے۔
 ”میں تو اماں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔“ امان اللہ اختر کے تند لہجے پر گھبرا کر بولا۔

”خوب خدمت کر رہے ہو تم دونوں۔ صاف نظر آ رہا ہے۔“ ذکیہ نے طنزیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔
 ”خود تو مزے سے کوکر لگا کر ٹھنڈے کمرے میں سوتے ہو اور میری بوڑھی ماں تپتے کمرے میں جھلکتی رہتی ہے۔ بھرجانی تو پرانی دھی ہے تو تو اپنا پتر ہے تو ہی خیال رکھا کر۔“ شاہدہ کہتے ہوئے آبدیدہ سی ہو گئی۔
 ”میں نے اماں سے بہت کہا کہ دوپہر کو ہمارے کمرے میں آجایا کریں۔ رات کو ویسے بھی سب باہر گھن میں اکٹھے سوتے ہیں۔“ امان نے بوکھلا کر وضاحت دی۔ بنوں کی تند خوئی سے ویسے ہی اس کی جان جاتی تھی۔

”اماں! بتائیں ناں انہیں ہم نے کتنی بار کہا ہے۔ آپ سے کہ آپ ہمارے ساتھ سویا کریں۔“ ساتھ ہی لبا سے بھی تائید چاہی تھی۔
 ”ہیں۔ میں اپنا کمرہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارے لبا کے ساتھ ساری زندگی اسی کمرے میں گزار دی۔ مجھے ان کی خوشبو آتی ہے اس کی دیواروں سے۔“ امان افسردگی سے بولیں۔

”ہاں تو اماں کیوں کمرہ چھوڑیں۔ یہ تم خود ہی کولر اماں کے کمرے میں لے آئیں۔ جوان خون ہے گرمی برداشت کر لیں گے۔“ حفیظہ نے آرام سے مشورہ دیا تھا۔

سمیرا کو اس کے اماں لبا نے موسم کی مناسبت سے

جیز میں روم کولر بھی دیا تھا۔ جسے اس نے آتے ہی سیٹ کر دیا تھا۔
 اسی وقت چاروں بہنیں انھیں اور اس سے اجازت لیے بغیر کولر ماں کے کمرے میں شفٹ کر آئیں۔

”ابے کی جدائی کا غم اور ہر وقت رونے سے اماں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔“ اختر نے ماں کے کندھے دباتے ہوئے تاکید کی۔

”گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ لوگوں کا میکہ ہے۔ آپ کو تو سب پتا ہے۔“ امان بنوں کو وضاحت دیتے دیتے آگیا چکا تھا تب ہی چڑ کر بولا۔

”وہ میرا! ہمیں سب پتا ہے کہ ہمارے پوپے کے گھر کتنی خوش حالی ہے۔ آخر غلام فرید مال دار کا گھر ہے۔ کی بھلا کیوں ہوگی، مگر اب ابنا (جا) چکا ہے۔ تو کوئی چھڑا کنوارا منوں تو نہیں ہے اب۔ اس لیے فکر رہتی ہے۔“ شاہدہ مصنوعی فکر مندی سے بولی۔

امان کے چہرے پہ ناراضی کی سرخی لہرائی تھی۔ اس نے ایک نظر سر جھکا کر بھنڈیاں کاٹی سمیرا کو دیکھا جس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔

”بیوی کم عمر ہو۔ چہرے پہ بھولہن ہو تو یونہی مرد کی مست ماری جاتی ہے۔“ اختر کا مخاطب نجانے کون تھا۔
 اماں نے کہا تھا سسرال میں تمہاری تعلیم اور میری دی ہوئی تربیت کی آزمائش ہوگی۔ اللہ تمہیں سرخرو کرے۔ مگر یہاں تو اس کے ضبط اور برداشت کو آزمایا جاتا تھا۔

وہ سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن میں آگئی۔ طنزیہ نظروں تو کیلے فقروں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

طویل لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اماں روم کولر کی سہولت سے خاطر خواہ استفادہ حاصل نہ کر پا رہی تھیں۔

”خواہ مخواہ بہو رانی کا احسان لیا۔“ انہوں نے افسوس کا برملا اظہار بیٹیوں کے سامنے کیا۔
”تو امان! تم یو پی ایس یا جنریٹر کا انتظام کرلو۔“ شاہدہ کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا۔

”بی بی! آپ جانتی تو ہیں! پہلے شادی پھر ابے کی بیماری اور فوتگی پہ سارا جمع جتھا خرچ ہو گیا۔ میری جیب میں تو اس وقت پھولی کوڑی بھی نہیں۔“ امان نے اسی وقت جیب الٹ کے دکھا بھی دی۔

”باجی! کہیں سے آرہی ہیں یا جارہی ہیں۔“ سمیرا نے اختر سے پوچھا۔ جو اس وقت تیز سیرخ بناری کے تنگ ٹنگ والے جوڑے میں ملبوس تھی۔ سرخ لپ اسٹک، سرخ ستے سے نفلی زیورات کے ساتھ کس کے جوڑا بنایا گیا تھا۔ جوڑے پہ اکا دکا ستارے بھی ٹنگے تھے۔ سمیرا نے خاصی دلچسپی سے اختر کی تیاری ملاحظہ کی تھی۔

”نہیں! ابھی امین کے میرے بھائی کا ولیمہ بھگتا کر آرہے ہیں۔ بچ بڑے ہی قدر دان لوگ ہیں۔ بہت کہا۔ میرا ابا فوت ہو گیا ہے۔ میں نہیں آسکتی مگر میرے بغیر تو انہیں شادی پھینکی لگ رہی تھی۔“ اختر نے سخی بگھارتے ہوئے کہا۔

سمیرا ہلکے سے مسکرا دی۔ ”معا“ اختر کو احساس ہوا کہ اہم بات تو بچ میں ہی رہ گئی ہے۔
”وے امان! تو نے بتایا نہیں۔ لوڈ شیڈنگ کا کیا حل نکالے گا؟“

”کمال کرتی ہوئی بی! اتنا بڑا مسئلہ حکومت حل نہیں کر پاتی تو میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”مذاق نہ کر۔ بس تو کہیں سے یو پی ایس یا جنریٹر کا بندوبست کر۔“ وہی حاکمانہ انداز۔ امان سوچ میں پڑ گیا۔

”ان شاء اللہ اگلے سال میں سب سیٹ کر لوں گا۔“

”ہاں۔ اگلے سال تو نے امان کی زندگی کی گارنٹی لی ہے نا! طنزیہ لہجے میں بولی۔

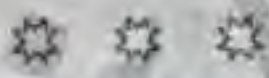
”چھاپھر کسی دوست سے قرض وغیرہ لیتا ہوں۔“

”قرض کیوں۔ بھر جائی کو جو اتنی سلا می ملی ہے۔ چمک کر یاد دہانی کرائی گئی۔
امان ایک لمبی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ یہ اکلوتا ہوا بھی کتنی بڑی آزمائش ہے۔ فرماں برداری پہ بچی مہر کوئی جائے انکار نہیں۔

”میں نے بھی تو شادی کے فوراً“ بعد اپنی سلا می سے امین کا قرض اتارا تھا۔“ اختر کی گھر کے لیے دی جانے والی پہلی پہلی قربانی!

سمیرا خاموشی سے اندر گئی اور سارے پیسے لا کر امان کے ہاتھوں میں دے دیے۔

امان نے ایک نظربوی کے چہرے پہ ڈالی جہاں طمانیت اور سکون کے رنگ واضح تھے۔



عید قرباں کی آمد آمد تھی۔

ہر دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی گھر کا پلا پلایا جانور راہ خدا پہ قربان ہونے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ بھوری بکری کا بہت خیال رکھتی۔ مندی کا پیالہ گھول کر کھال کے سفید حصوں پہ لپائی کر دی۔

”دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ آپ نے عید کا جوڑا ابھی تک نہیں لیا۔“ وہ امان کے قریب چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”نہیں سمیرا! ابا کے بغیر یہ عید، عید نہیں لگ رہی۔ میں اور ابا ایک ہی تھان سے کپڑا کٹواتے تھے جوتے تک ایک جیسے لیتے تھے۔ لوگ ہم کو بڑا چھوٹا بھائی کہہ کر نکارتے۔“ امان افسردگی سے بولا۔ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بزرگ گھر کی رونق ہوتے ہیں، مگر سنت ابراہیمی کے بھی اپنے تقاضے ہیں۔ آپ کا اتنے بڑے مذہبی تہوار میں دلچسپی نہ لیتا، اللہ کی ناراضی کا موجب بن سکتا ہے۔ اماں جی تو عدت میں ہیں۔ مگر آپ کو تو اہتمام کرنا چاہیے۔“ وہ نرمی سے قائل کرتے ہوئے بولی۔

دس ذی الحج کا سورج ابھی پوری طرح بھی نہ نکلا تھا

یا صہ

نہ

ا

کہ اس پاس کے تمام عزیز واقارب کے گھروں سے
ناشتا آگیا۔ ستیاں سوچی ٹیک رس اور چائے کے
لا تعداد تھراس۔

”آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا چاچی! میں خود ناشتا
بنانے والی تھی۔“ اس نے چاچی فاطمہ سے کہا۔ پہلے تو
چاچی فاطمہ اس کے رسم و رواج سے ناواقف ہونے پہ
ذرا سی حیران ہو میں پھر سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”دلسن! یہ تو یہاں کی ریت ہے۔ بھائی فرید کی پہلی
عید ہے۔ تو برادری اسی طرح غم بھانتی ہے۔“

وہ کندھے اچکاٹی اندر آگئی جہاں امان کمرے کے
وسط میں کھڑا چہرے پہ ڈھیروں الجھن لیے کھونٹی پہ ٹنگے
تین چار استری شدہ جوڑوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے
جارج رہا تھا۔

”کیا ہوا۔ ان میں سے کوئی سا بھی پن لیں۔“ وہ
قریب آئی۔

”نہیں سب نئے اور اچھی حالت میں ہیں۔ تم ایسا
کرو یہ والا قنات استری کرو۔“ وہ الماری کھول کے
خوب چھانٹ کر ایک بہت پرانا اڑے رنگوں والا
براون جوڑا نکال لایا۔

نہ شیونائی نہ بال خوشبو تک سے پرہیز۔
”سمجھا کرو۔ اماں ابے کو یاد کر کے رو رہی ہے میں
یوں بن سنور کر اچھا لگوں گا۔“ وہ اس کی ناراضی
محسوس کر کے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

نہادھو کر اس نے گلابی کڑھائی والا سوٹ زیب تن
کیا۔ جس پر گلابی و سرخ سوتی دھاگے سے نیپس
کڑھائی کی گئی تھی۔ کہیں کہیں شیشے بھی بہار دکھا
رہے تھے۔ لمبے گھنے نم بال سلجھا کر پیچھے چھوڑ دیے۔

آنکھوں میں کاجل کی لکیر ڈال کے گدازلیوں پہ پنک
لپ اسٹک لگائی۔ دائیں ہاتھ کی کلائی میں سرخ کالج کی
جوڑیاں ڈال لیں۔

وہ مکمل تیار ہو کے امان کو عید مبارک کہنا چاہتی
تھی کیونکہ اس کی اماں بھی ایسا ہی کیا کرتی تھیں۔
داوی کی تاکید کے مطابق ہر بیاہتا کو سنے سنورے رہنا
چاہیے اس لیے اسے اماں کی کلائیاں کبھی سونی نظر نہ

آئیں، مگر عید کے دن تو خصوصی تیاری ہوتی۔ خوب
دنداسہ رگڑ رگڑ کر ہونٹوں کو لال کرتیں۔ ہاتھوں
پیروں پہ گھر کی مہندی کالیپ لگاتیں۔ دونوں ہاتھوں
میں پارے والی جوڑیاں بنایا جوڑا۔ وہ تینوں بہنیں بھی
خوش فوٹی میں ماں کا ہر تو تھیں۔ غرض عید اپنے پورے
لوازمات کے ساتھ منائی جاتی تھی۔

سسرال میں اس کی پہلی عید تھی، مگر اس عید کا
رنگ گزشتہ منائی گئی تمام عیدوں سے یکسر مختلف تھا۔
”ہائے اماں! ہمارا ابا ہمیں یتیم کر کے چلا گیا۔“
حفیظہ آتے ہی ماں کے گلے لگ کر زور زور سے
رونے لگی۔

آخر شبہ اور ذکیہ بھی تھوڑی دیر بعد آگئیں۔ ذرا
سا آنسو بہانے باپ کو یاد کرنے کے بعد اب ناشتے
سے خوب انصاف کیا جا رہا تھا۔

”عید مبارک بابی!“ ہلکا سا پر فوم اسپرے کیے
ٹکھری ٹکھری سی قریب آ کر خوش دلی سے بولی تھی۔
چاروں کی نظر اٹھی تو کرنٹ کھا کر رہ گئیں۔ ذکیہ
کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلکا اور گرم چائے دائیں
پاؤں پہ گری تو وہ ہلکا کر رہ گئی۔

”کوئی ماں! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ بھر جائی نے
نواں جوڑا پن لیا؟“ آخر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے
اس کا تروتازہ سراپا دیکھا تھا۔

”جی آج عید ہے نا۔ میری پہلی عید“ آپ لوگوں
کے ساتھ۔“ وہ مسکرا کے بولی۔

”اور تو شاید بھول گئی ہے کہ یہ میرے مرحوم ابا کی
بھی پہلی عید ہے۔“ حفیظہ غصے سے اسے گھورتے
ہوئے بولی۔

”ناں بھر جائی! تیرا دل ذرا نہ کلنیا۔ ہم سو گوار ہیں۔
عمر بڑی ہے سنے سنورے کو۔ اگر اتنی ہی چاہ چڑھی تھی
تو کل بار سنگھار کر لیتیں، مگر آج ایسے ہی رہیں۔ ابھی
کچھ دیر میں ساری برادری والے عید ملنے آئیں
گے۔ کیا سوچیں گے کہ اکلوتی نوں کو ذرا بھی غم نہیں
ہے سوہرے کے جانے کا۔ آجائے امان اللہ۔ ذرا اس
سے پوچھتی ہوں۔ بیوی کو کنٹرول کرنا نہیں جانتا۔“

آخر نے دانت کچکپاتے ہوئے کہا۔
”دیکھیں بھئی! اباجی کے جانے کا ہم سب کو غم
ہے۔ ان کو رخصت ہوئے دو ماہ ہونے کو آگئے ہیں۔
آج عید کا دن ہے۔ خوشیوں و مسرتوں کا دن۔ اللہ تعالیٰ
نے عیدین کے شہوار ہم مسلمانوں کو خوشی منانے کے
لیے دیے ہیں نہ کہ رونے دھونے اور غم منانے کے
لیے۔“ وہ قہقہے سے بولی۔

”ہمیں برحانے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگوں کے
ہاں رواج ہوگا“ اپنے جانے والوں کو بھلا دینے کا۔
حفیظہ نے تپتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا
کہ وہ اسی وقت سمیرا کی تیاری کا حشر نشر کر دے جو
بجائے ان کے غم میں شریک ہونے کے بن ٹھن کر
ٹکھری ہوئی تھی۔

”معاف کیجئے گا یہ میلے کچیلے“ ملے اور بدبودار
کپڑے پن کر، الجھے بکھرے بالوں کے ساتھ غم
منانے کا کون سا طریقہ ہے۔ اگر صفائی ستھرائی سے اتنا
ہی پرہیز کیا ہے تو آخر بابی اس وقت بھی آپ کو بننے
سورنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جب آپ کے
سسرال میں کوئی شادی کا فنکشن منعقد ہوا تھا۔ اس
وقت اباجی کو گئے صرف ایک ماہ ہی تو ہوا تھا۔“

صاف گوئی سے بولتے ہوئے اس نے کچھ عرصہ
پہلے کی بات آخر کو یاد دلانی۔ بجائے شرمندہ ہونے کے
آخر تو کھول کر رہ گئی۔

رفتہ رفتہ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اس نے
بے حد سلتے اور پھرتی سے مہمانوں کو چائے اور سوٹ
ڈش پیش کی۔ کیونکہ قربانی کا گوشت آنے میں کافی
وقت پڑا تھا۔

سب ہی کی نظروں میں سمیرا کے لیے پسندیدگی اور
ستائش تھی۔ کسی نے کڑھائی کی تعریف کی تو کوئی لمبے
کٹے بالوں کا نوٹکہ پوچھنے لگی۔ وہ دھیسے سے مسکرا کر
بانٹیں کرتی رہی۔

چاروں بہنوں کو چار پائی پہ بیٹھے بیٹھے عجیب سی بے
چینی لالچ ہونے لگی تھی۔

ذکیہ کا تو اس وقت منہ لنگ گیا جب اماں نے ہاتھ

سے اسے پرے کیا۔

”ذکی! ذرا ادھر کو ہٹو۔ تمہارے پسینے کی بدبو سے
میرا دل غ پھٹا جا رہا ہے۔“

”اماں جی! آپ اٹھ کر کپڑے بدل لیں۔ میں نے
ازار بند ڈال کر غسل خانے میں لٹکا دیا ہے۔“ وہ قریب
آ کر نرمی اور محبت سے بولی۔ اماں جی نے سر ہلایا پھر
نیچے چھپکلی تلاش کرنے لگیں۔

”جاؤ گرنی نہ ہو تو۔ میری اچھی بھلی ماں کی بھی
مت مار دی۔“ آخر نے غصے سے دانت پیٹتے ہوئے
سمیرا کو دیکھا جو اس وقت چاچی صابرہ اور ان کی بہو سے
ہنس کر عید مل رہی تھی۔ اماں جی بھی کپڑے بدل کر
آگئیں۔ نئے کپڑوں نے شخصیت کو وقار بخش دیا تھا۔
حفیظہ نے غصہ بھر کر سارا منظر ایک لمحے کو دیکھا
پھر گریبان میں ہاتھ ڈال کر چائنا کا سرخ موبائل نکالا۔

”ہاں طاہر! میرا جامنی کاٹن کا سوٹ ٹرنک میں رکھا
ہے۔ وہ لے کر نائی کے گھر آجاؤ۔ میں یہیں استری
کر لوں گی۔“

”آخر بابی! آپ کا لیسن کلر کا جوڑا آپ پر بہت بجا
ہے، جو آپ نے میری مہندی پر پہنا تھا۔“ وہ لمبے میں
محبت سموتے ہوئے اپنائیت سے بولی۔

”صرف لیسن کیا مجھ پہ تو ہر رنگ بجا ہے۔“ بے
نیازی سے جواب دیا گیا۔

”میں ابھی گا جری رنگ کا جوڑا منگوا کر پہنتی ہوں۔
پھر دیکھنا، کیسا اٹھتا ہے یہ رنگ مجھ پہ۔“ وہ مسکراتے
ہوئے ہٹ گئی۔

”یہ ناخواندہ جذباتی اور فرسودہ روایتوں پہ اڑے
لوگ۔ اگر ان سے ان ہی جیسا طرز عمل اپناؤں گی تو
زندگی مشکل نہیں، مشکل تر ہو جائے گی۔“ مگر محبت
نرم خوئی، ہمدردی، اپنائیت اور صبر و تحمل ایسے اوصاف
ہیں جو دلوں اور ذہنوں کو بدلنے میں جاوٹی اثر رکھتے
ہیں۔“

سمیرا دل میں سوچتی طمانیت سے کچن کی طرف بڑھ
گئی۔

پہلی آنکھ کھل کر

مکمل ٹاول



چھوٹا سا صحن تھا اس میں ایک طرف واشنگ مشین میں کپڑے گھوم رہے تھے اس کے ساتھ ہی بیلے کپڑوں کی الگ الگ ڈھیریاں لگا کر رکھی گئی تھیں 'مرزا'، 'زنانہ'، 'سایہ'، 'رنگین چادریں'، 'بنیان'، 'رومال' تو کیے 'جراثیں' ہر قسم کا میلا کپڑا دھکنے کے لیے موجود تھا۔

"کتنے مہینے بعد مشین لگائی ہے؟" تائی اماں کی جھٹے کے پیچھے سے گھورتی نگاہیں اچھے بھلے بندے کو کڑبڑاتی تھیں مگر وہ تو ناہید نور الہی تھی ان سے تو کیا لڑی ہوئی! الٹا انہیں ہی چیبہ کرا دیتی تھی۔

"نکل تو آئی ہے مشین، ٹھیک ہو کر دو مہینے سے خراب پڑی تھی، میرے بھائی تو چلو چھوٹے ہیں ابھی، کچھ کچھ بھی ہیں امی! اب کے لاڈ پیار میں بگڑے آپ کا یہ بچہ کچھ کم نہیں ہے، اٹے سیدھے مشورے تو حاضر رہتے ہیں یہ نہ ہوا کہ مکینک کو بلا لایا مشین اب اسے جانا دو مہینے نکال دیے آج کل، آج کل کڑتے ہوئے، اتنی تیز رفتار مشین بھی نہیں تھی

جتنی ناہید کی زبان۔ اک ذرا چھیڑنے کی دیر ہوتی اور۔۔۔ "خیر، اب بھی اسی نے ہی ٹھیک کروائی ہے تمہارے آبا بھائی تو اپنے مشغلوں سے فارغ ہی نہیں ہوتے۔"

تائی اماں کو اپنے بیٹے کی شان میں یہ معمولی گستاخی کچھ بھائی نہیں سوختا دیا۔

"ہاں تو میرے آبا بھائی کو اپنے کام بہت طارق کی طرح فارغ ہوتے تو یہ بھی کر لیتے۔" ناہید کہاں ادھار رکھنے کی قائل تھی۔

"اے ہے دودھ ابل گیا۔" تائی اماں کی ناک تک دودھ کی خوشبو پہنچ گئی۔ وہ لپک کر کچن میں پہنچیں مگر دیر ہو چکی تھی دودھ ابل ابل کر گر رہا تھا۔ چو لہے برنر دونوں کا ستیاناس ہو چکا تھا۔

"اپنے حال کی خبر نہیں، دوسروں کی خبر گیری کا بہت شوق ہے۔" ناہید بریدوائی۔ اس کا موڈ پہلے سے خراب ہی تھا۔ تائی اماں کی نفی میں نے سونے یہ سہاگے کا کام کیا۔ دھیلے ہاتھوں سے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر بالشی میں

ڈالتی جارہی تھی جب طارق کی آمد ہوئی۔

”اف میں نہیں دیکھ سکتا یہ۔“ اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر ایکٹنگ کی۔ ناہید نے کہا کچھ نہیں مگر جن نظروں سے اسے دیکھا اس کا مطالبہ تھا کہ ”آگے تو نکلی!“

”میری نازک سی پرفسز اور کہاں یہ محنت مشقت میری اگاتھا کرشی کی مخروطی انگلیوں میں صرف قلم چٹا ہے۔ یہ کپڑے صابن سرف پانی یہ تمہارے ستیان شان نہیں سچ کہوں میرے نازک سے دل پر چھریاں چل جاتی ہیں۔“

”کچھ ڈانٹا گز میرے لکھنے کے لیے بھی چھوڑ دو“ سارے تم ہی بول لو گے؟“ ناہید نے جیکسی چتونوں سے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

”لاؤ میں پیلپ کروں۔“ طارق آگے بڑھا۔ ”بس بس تھنک یو دیری میچ“ کیوں مجھے تائی اماں سے باتیں سنواؤ گے۔“ ناہید نے ڈپٹ کر اسے روکا۔ ”ویسے اکثر میں اپنی امی کے ساتھ بھی کپڑے دھو آتا ہوں جیسا کہ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔“

”جیسا کہ تم نے کہا وہ میں نے دیکھا تو ہے مگر تمہیں بھی یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ تمہاری ماں ہیں۔“ ناہید نے اسی کی ٹون میں جواب دیا۔ ”اور تم؟“ سوال بے ساختہ تھا۔

”آف کورس میں تمہاری کچھ بھی ہو سکتی ہوں“ سوائے ماں کے۔“ ناہید کا جواب بھی فوراً آیا۔

”تمہاری اس بات سے میری نوک زبان پہ ایک جملہ چل رہا ہے مگر تمہاری عادت سے ڈر لگتا ہے۔“ غصے میں تمہارے ہاتھ جو آئے کھینچ مارتی ہو۔“

”تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموش رہو۔“ ناہید نے کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھائی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

”لاؤ میں اوپر لے جاتا ہوں۔“ غیر متوقع طور پر وہ کچھ سنجیدگی سے بولا۔

”رہے دو ہمارا بوجھ ہے ہم خود اٹھائیں گے۔“

ناہید کی شان بے نیازی اپنے عروج پر تھی۔

”میں دل و جان سے تمہارا ہر بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں۔“

”آگے پیچھے دیکھ کر ڈانٹا لگ مارا کرو۔“ وہ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

طارق نے بے ساختہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تائی امی کھڑی خونخوار نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

”ہزار بار سمجھایا ہے لڑکیوں سے الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کر تیرے باپ کو بتا چل گیا تو خبر لیں گے تیری۔“ وہ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں مگر طارق کا دل تو لڑکیوں میں اٹکا ہوا تھا۔

”لڑکیوں سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ تڑپ کر بولا۔

”مہنا کے پیچھے نہیں پڑا تھا؟ ہر وقت ہنسی مذاق محول قاتل تو باتیں کرتا وہ تو اچھا ہوا اس کی شادی ہو گئی میری جان چھوٹی۔“

”وہ تو ہمارا ہنسی مذاق کا رشتہ تھا اور تو کوئی بات نہیں تھی۔“

”ہنسی ہنسی میں ہی پھنسی ہو جاتی ہے۔ ان ماں بیٹی کو تو خوش فہمی ہو گئی تھی کہ میں تیرا رشتہ لے کر وہاں جاؤں گی وہ تو ایک روز میں نے ہی صاف صاف بتلادیا تھا کہ طارق کی شادی اس کے ننھیال میں ہوگی تب کہیں جا کر اس نے بیٹی کی چٹ منگنی بٹ بیاہ کیا۔“

”اوہ تو یہ آپ تھیں جس کی وجہ سے اس نے راستہ بدلا۔“ طارق نے انکشاف کرتی اماں کو بغور دیکھا۔

”پھر تو نے شاہینہ کو لارے میں رکھا آئے دن وہ تتلی کی طرح منڈلاتی رہتی تھی یہاں۔ اس کا چٹا صاف کیا بڑی مشکل سے۔“

”آہ تو وہ آپ تھیں اماں ظالم سماج ہائے وہ لڑکھن بلکہ بچپن کی تختیتیں۔ مگر یہ تو میرا سچا اور پکا عشق ہے۔“ طارق کے دل نے وہائیاں دیں۔

”اللہ نے اچھی شکل کیا دے دی ہر جگہ راجہ اندر بچا پھرتا ہے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے اگر اللہ نے اچھی پرستائی دی ہے۔ اس لیے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہوں۔“ آخری بات طارق نے اپنے دل میں کہی۔ امی سے کچھ بعید نہ تھا وہ منٹ میں اس کی اوقات یاد دلادیتیں۔

”باب کی دوائیاں لے آئے تھے؟“ ان کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ بے اختیار گڑبڑا گیا بروقت کوئی بہانہ بھی نہ سوچا۔

”میرا سون رات سے بتایا ہوا ہے دل غٹھکانے پر ہو تو کچھ یاد رہے۔ اب شام میں وہ آجائیں گے پھر ان کی سنو بیٹے کے کتھے پن اور نالائقی کی ساری ذمہ داری مجھ پر آجائے گی کہ ماں کے لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے۔“ حالانکہ وہ لاڈلا بنا بتایا باپ پر گیا ہے۔

طارق نے تصدیق طلب نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ ”ہاں تو اور کیا ان کی حرکتیں کیا کم تھیں شادی سے پہلے سب جانتی ہوں میں۔“ وہ بے خیالی میں بولتے ہوئے اک پیم جو نکلیں۔

”میں تجھے ڈانٹ کیوں رہی تھی بھلا؟“ انہوں نے اپنے دل پر زور دیا ان کی یادداشت کلیہ حال بھی خوب تھا چند منٹ پہلے کی کوئی بات بھول جاتیں۔

”آپ دوائیاں لانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔“ ”ہاں میری دراز میں سے لے لینا پیسے اور ہاں بات من۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”ہزار کانٹ لینے کی ضرورت نہیں پانچ سو کا لینا اور ستر روپے پچیس گے وہ۔“ ”وہ میں لے لوں؟“

”فودھ لے آنا ہر سوے میں سے رقم مارتا ہے لپٹا حصہ پہلے چاہیے جیسے ملازم ہو اس گھر کا۔“ وہ اسے لٹاؤنی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”کاش ملازم ہی ہوتا اس گھر کا تنخواہ تو ملتی۔ اتنے ڈھیر بول ڈھیر کام کرتا ہوں کوئی تنخواہ کوئی چھٹی نہیں فقط پانچ سو سننے کو ملتی ہیں اماں بلاؤ کی۔“ کاش میں بیٹے کے بجائے ان لوگوں کی بیٹی ہوتا کیسے عیش ہوتے

میرے آئے دن شاہنگ کرتا“ نئے نئے فیشن کے ڈھیروں ڈھیر ملبوسات بناتا“ آکس کریم بزرگ پڑا چٹ“ حلیم جو دل چاہے بازار سے منگوا کر کھاتا اور ڈٹ کر کھاتا۔ کالج یونیورسٹی آنے جانے کی کوئی ٹینشن نہیں دل چاہا تو پڑھ لیا اور نہ گھر پر بیٹھ کر عیش کرتا۔“

اپنے خیالات میں گم اسے علم ہی نہ ہوا کہ ناہید کب سے آخری سیڑھی پہ کھڑی اس کے چہرے کے بننے بگڑنے زاویوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”پہلے تو مجھے صرف شک تھا مگر آج یقین ہو گیا۔“

”ہیں۔ یہ کب آگئی!“ وہ گڑبڑا گیا۔

”گٹھنٹوں گٹھڑے ہو کر خلا میں تکتے رہنا منہ ہی منہ میں بڑبڑانا کبھی مسکراتا کبھی غرانا تم کچھ ایب نارمل سے نہیں ہوتے جارہے؟“ ناہید مشین میں سے کپڑے نکال کر ٹب میں ڈالتی جارہی تھی۔

”غیر معمولی باصلاحیت اور ذہین افراد کو یہ دنیا اسی طرح ٹریٹ کرتی ہے پانگل دیوانہ اور ایب نارمل کہہ کر حالانکہ اصل ایب نارمل دوسرے لوگ ہوتے ہیں ہم جیسے نہیں۔ زمین پہ رینگنے والے کپڑے مکوڑے میری ذہانت کے ماؤنٹ ایورسٹ تک نہیں پہنچ سکتے۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا سیکندوں میں خود کو سنبھال کر پھر شروع ہو گیا۔

”یہ جو لفظ تم اکثر استعمال کرتے ہو اپنے بارے میں ذہین“ اس کے جے آتے ہیں؟“ ناہید کا لہجہ سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔

”تم میری بے عزتی کر رہی ہو۔“ اس نے خشکوک نگاہوں سے ناہید کو گھورا۔

”نہیں بے عزتی تو ان کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔“ ناہید کا اطمینان قابل رشک تھا۔

”میری محبت کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔“

”بے فکر ہو میں کوئی جائز فائدہ بھی نہیں اٹھاؤں گی فی الحال تو تم بڑے ابو کی دوائیاں لے آؤ۔ ورنہ ان کے شور شرابے کی آوازیں ہمارے پورشن تک آتی ہیں باقی محلہ تو سنتا ہی ہے۔“

”یہ لڑکا ہونا بھی بہت بڑی برائی ہے۔“

”ہاں اگر تم جیسا ہو تو۔“
”جیسا بھی ہوں اب تو تمہارا ہوں۔“
”کتنے عرصے کے لیے؟“
”پوری زندگی کے لیے۔“

”اتنا عرصہ کون جھیلے گا تمہیں مجھ میں قوت برداشت ویسے ہی کم ہے۔“
”طارق!“ اس کے منہ کھولنے سے بیشتر تائی اماں کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”دوائی کے لیے پیسے لیے یا نہیں؟“

”جی ابھی آ رہا ہوں۔“ وہ بوکھلا کر اندر کی طرف بھاگا۔

”جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔“ ناہید نے پٹ کی۔
”ڈرنا مرنے سے بہتر ہے۔“ وہ جاتے جاتے بھی جواب دے کر گیا۔

حاضر جوابی اس گھرانے کا طرہ امتیاز تھی۔ ہر بڑے چھوٹے میں یہ وصف موجود تھا ہاں لیکن شینہ شاید کچھ مختلف تھی پتا نہیں تھی یا صرف مختلف لگتی ہی تھی وہ ناہید کی چھوٹی بہن تھی زیادہ چھوٹی نہیں بس ڈیڑھ دو سال چھوٹی دھیمہ مزاج کم گو گھریلو کام کی شو قین اور پھر تکی اس معاملے میں بھی وہ ناہید کی الٹ تھی۔

ناہید نے سارے کپڑے دھو کر پھیلا دیے تھے اب مشین دھو کر صحن کافرش خشک کر رہی تھی۔

”تم کپڑے دھوتی ہو انہیں نچوڑتی نہیں ہو۔“ تائی امی اوپر سے ہو کر آئی تھیں اور جو کچھ دیکھ کر آئی تھیں وہ ان کا بلڈ پریشر بانی کرنے کے لیے کافی تھا۔

”پوری چھت پر پانی پانی ہو رہا ہے کوئی دو تین بالٹی پانی نکالا ہے کپڑوں میں سے نچوڑ کر پھیلا دیتیں تو کیا حرج تھا؟“ انہوں نے کچھ سج اور کچھ مبالغے سے کام لیا۔

”کیلے کپڑے رسی پہ پھیلا دو تو جلد یا بدیر پانی نکل ہی جاتا ہے۔ اب دھونے میں بھی محنت کرو اور نچوڑنے

میں بھی طاقت لگاؤ۔ اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“ ناہید نے حسب عادت اور حسب توقع ان کے اعتراض کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کھٹاک سے ہنسل دیا۔

اور وہ واپس مقررہ جگہ پر رکھ کر اندر چلی گئی۔ تائی اماں حیران حق دق اسے جاتا دیکھتی رہیں حالانکہ وہ تو سب سے ہی اسی طرح بات کرتی تھی مگر تائی ہریاریوں حیران ہوتیں جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہیں۔

”یا اللہ کیا کرے گی یہ لڑکی سسرال جا کر“ انہوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائیں۔

یہ سوال بڑی پچھوٹے کیا تھا اپنے مخصوص طرز انداز میں وہ بھی ناہید کے ”متاثرین“ میں شامل تھیں اور اکثریت کی طرح اس سے خار کھاتی تھیں۔

”سب کو نیکیل ڈال کر رکھوں گی مشرقی عورت بن کر ظلم و زیادتی کسی کی نہیں برداشت کروں گی۔“ ناہید نے تن فرن کرتے ہوئے جواب سے نوازا تھا۔

تائی امی کو وہ جواب یاد آ گیا تھا وہ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے اندر کی جانب بڑھیں۔

”اب اندر کیا کرنے گئی ہے“ برآمدے سے وہ اندر کمرے میں پچھیں۔

ناہید فریج کھولے اندر کا معائنہ کر رہی تھی۔ ”میں نے سنا تھا کہ آپ نے آلو بخارے کی چٹنی

بنائی ہے۔“ ناہید کا منہ بدستور فریج میں ہی گھسا ہوا تھا۔

”کون کرتا ہے میرے گھر کی جاسوسی؟“ تائی امی مشتعل ہوئیں۔

”گھر کا بھیدی لٹکا ڈھائے۔“ ناہید نے مختصر لفظوں میں مکمل بات کی۔

”آنے دو اس طارق کے بچے کو بیاتی ہوں اسے۔“ وہ دل ہی دل میں تیج و تاب کھا رہی تھیں۔

ویسے وہ اتنی کمزور اور بے بس تو نہ تھیں کہ کوئی بھی یوں دھڑلے سے ان کے گھر پکچن اور فریج میں گھس جائے مگر بات دراصل یہ تھی کہ ناہید لاڈلی تھی اپنے

نمایاں نہ اپنی اس بچی جان چھڑکتے تھے اگر وہ جھوٹے من بھی لیا سے قربانیش کر دیتی تو تائی کو وہ خاص افس چٹنی بنا کر دیتا پڑتی کہ وہ چٹنی بھی نور اور اور تیز تھیں نمایاں اپنی جگہ بڑے دنگ تھے اور پھر جہاں تک انصاف کی بات ہے تو ناہید بھی اکثر ان کے لیے کچھ نہ کچھ لے ہی آتی اور پر سے یہ اور بات کہ تائی اس میں دو چار نقص نکالتیں پھر کھاتیں اور کھلاتیں مگر اس وقت تو معاملہ اپنی طرف کا تھا۔

”یہ ناخلف اولاد!“ انہوں نے دل ہی دل میں دو چار کالیاں اپنے صاحبزادے کو دیں پھر ناہید سے مخاطب ہوئیں۔

”بہنو میں نکالوں۔“ انہوں نے آگے کی کچھ چیزیں تھوڑی سرکار کچھ سے بوتل برآمد کی اور اس میں سے ایک بالی چٹنی نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھمائی۔

اتنی مسکی چٹنی یوں بٹنے میں ہی چلی جاتی ہے ابھی بڑی چھوٹی بندیں آئیں گی کھائیں گی بھی باندھ کر بھی لے جائیں گی مگر خیرہ اعتراض کرنے والی کون۔ محنت ان کی تھی مگر لاگت شوہر کی اور وہ شاہ خرچ تھے۔ بیگم نے ایک کلو آلو بخارے کسے وہ دو ڈھائی کلو لے آئے تاکہ دوسرے لوگ بھی کھالیں۔

ناہید ان کا شکریہ ادا کر کے اوپر آگئی۔ اچھا خاصا کھلا پورٹن تھا چار کمروں پر مشتمل۔ برآمدہ تھا پکچن یا تھوڑا دم اسٹور سب کشادہ لیکن پھر بھی کبھی چھوٹا لگنے لگا جبکہ تنگ رہ جاتی کہ افرادہ ہی ماشاء اللہ اتنے تھے

ای ”ایا“ تین بچیں چار بھائی ”داوی“ شادی شدہ بڑی آپا اپنے چار بچوں سمیت آجائیں تو گھر کی رونق اور آبادی میں مزید اضافہ ہو جاتا اور یہ رونق اور آبادی کا اضافہ آئے دن کا معمول تھا کہ آپا کا گھر زیادہ دور نہ تھا

پھر سسرال سے الگ رہتی تھیں لہذا وہ اکثر بیس پائی جاتی تھیں۔

ناہید نے چٹنی کی پالی فوراً فریج میں رکھی مگر ”داوی“ کی تنگ گئی عقلی نگہوں نے اسے دیکھ ہی لیا۔

”کیا لالی ہے؟“

”آلو بخارے کا سالن ہے۔“

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی بوتلیں کامرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے ایک

بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے آڈر بھیج

کرر جڑ پادسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے سنی آڈر اس

حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لیے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لیے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے گئے لئے ہمارا ہنہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، یکینڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، یکینڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

”ساجدہ کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچتا پکانے کو جب دیکھو آلو پیٹنگن، پیٹنگن کا بھرتا، پیٹنگن کے کباب، پیٹنگن کے پکوڑے اس کا دل ہی نہیں بھرتا اس سبزی سے۔ میرے بیٹے نے اس کا نام ساجدہ پیٹنگن رکھا ہے۔“ داوی کو ہینگنوں سے سخت چڑھتی اور مائی واقعی یہ سبزی کچھ زیادہ ہی پکاتی تھیں مگر اس وقت تو۔۔۔

”کل پرسوں کا بچا ہوا سالن فریج میں رکھا تھا میں نے آئی۔ چاولوں کے ساتھ کھالوں کی وہ تو ایک آدھ دن بعد پھینک دیتیں۔“ ناہید نے لاپرواہی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”کچھ مسالا وغیرہ رنگ روپ بھی ہے یا بس نرے پیٹنگن ہی ہیں۔“

”جب آپ کو پیٹنگن پسند نہیں کھانا نہیں تو بے کار کے سوال جواب کیوں کر رہی ہیں۔“ ناہید جھنجھلا کر کمرے میں گھس گئی۔

”توبہ ہے اس لڑکی کی زبان؟“ داوی بے بسی سے اس کی پشت دیکھ کر رہ گئیں۔

کم تو خیر وہ بھی نہیں تھیں۔ کسی زمانے میں جب ان کا سکہ گھر میں چلتا تھا بمبوں کو بیٹوں کو انہوں نے خوب اپنی مٹھی میں دبا کر رکھا بڑے شاندار معرکے ہوا کرتے تھے۔ پوتے پوتوں کے ساتھ اب بھی کبھی ٹکراؤ ہو جاتا تھا مگر اب تو ان کی راجدھانی محض اپنے ایک پٹنگ اور ایک کرسی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے جاننے والے اور کہنے والے کہتے کہ ناہید صورت اور سیرت دونوں اپنی داوی سے بے حد مشابہ تھی گو کہ داوی اس بات سے انکار کرتی تھیں اور ناہید کچھ بن کر پوچھتی ”کیا واقعی؟“

ناہید کمرے میں تھسی جانے کیا تلاش کر رہی تھی درازیں کھول کھول کر دیکھ لیں، تکیے الٹ پلٹ کیے پھر ٹینے کو آواز لگائی۔

”وہ کتاب کہاں ہے جو میں ساحر بھائی سے لائی

تھی۔“

”کون سی؟ پائیو کو نیلو کی؟“

”ہاں؟“ لیکسٹ کی بات کر رہی ہوں تم سے ختم کر لیا نہیں؟“

”میں نے تو ختم کر لی تھی وہ الماس لے گئی ہے ذرا۔“

”ذرا؟ اس کا کیا مطلب؟ پوری سالم کتاب ہی لے کر گئی ہوگی نا؟ قیمت معلوم ہے اس کی؟ اور الماس کی حرکتیں، حشر لگا رہتی ہے وہ کتاب کا میں نے پہلے بھی منع کیا تھا نا کہ میری لائی ہوئی کتابیں اسے مت دیا کرو میرے پاس فالتو دولت نہیں ہے ڈنڈ بھرنے کے لیے اب فوراً“ منگوالو کتاب میں واپس کرنے جاری ہوں۔“ ناہید زور زور سے چیخ رہی تھی۔

”کس سے منگواؤں؟ خود ہی جانا پڑے گا۔“

ٹینے تن فن کرتی سیڑھیاں اترنے لگی اور پانچ منٹ بعد ہی کتاب لا کر اس کے ہاتھ میں تھما لی۔

”آئی! میں بڑی داوی کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ داوی کی بڑی، بہن تھیں بڑی داوی کہلاتی تھیں اور ان کا کنبہ پڑوس میں ہی آباد تھا۔

کتاب ہاتھ میں لیے وہ سیدھی ساحر کے کمرے میں جا پہنچی۔

”جناب ساحر صاحب! آداب۔“

”وعلیکم آداب!“ وہ بیٹھے بیٹھے ہی ذرا جھک کر کورنش بجالائے۔

”یہ آپ کی امانت۔“ ناہید نے کتاب میز پر رکھی۔

”بڑی جلدی پڑھ لی۔“

”پرانی عادت ہے۔“ ناہید نے کندھے اچکائے

”یہ جو مطالعہ ہوتا ہے نا؟ یہ کھانے کی طرح ہوتا ہے کھانے کو آہستہ آہستہ آرام آرام سے خوب چا چبا کر کھایا جانا چاہیے تم لوگ جلدی جلدی لکھتے ہو۔“

”اتنا وقت کس کے پاس ہے زندگی مختصر حالات خراب، حال کشیدہ، مستقبل نامعلوم، جو لکھ پڑھ لو

قیمت“ ناہید کی فلاسفی ذرا الگ ہی تھی اور ساحر اس سے بحث نہیں کرتے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ حالات غیر یقینی ہیں اس لیے سچ کے نشتے کے ساتھ ہی سچ اور ڈنڈ بھی کر لیا جائے“ ساحر کا انداز حسب عادت کچھ ٹیکھا ہو گیا۔

”میں لڑنے نہیں آئی آپ سے۔“

”خیر یہ کام تو تم دوسروں کے ساتھ بخوبی کر لیتی

آپ کی طنز باتوں سے بوریٹ ہوتی ہے مجھے۔“

ناہید نے میز کی سب سے اوپر والی دراز کھولی۔

”بھلا میری مجال جو میں تم پر طنز کروں ویسے بھی میں نے حقیقت بیان کی ہے، طنز نہیں کیا۔“ ساحر نے صفائی پیش کی یہ اور بات کہ لبوں پہ مسکراہٹ بڑی شرارتی تھی۔

”وہ حقیقت جو انسان کو ناگوار گزرے اسے ہی طنز کہتے ہیں۔“ ناہید نے دراز کی تلاشی لیتے ہوئے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ایسے ناگوار کام کرتی کیوں ہو؟“ ساحر نے اسے غور دیکھا۔

”شاید عادتاً“ یا شاید فطرتاً۔“ ناہید نے دراز میں سے ایک چاکلیٹ برآمد کر ہی لی، سپر کھول کر منہ میں ڈالی اور لطف اندوز ہونے لگی۔

”اچھا چلو، یہ بتاؤ کتاب کیسی لگی؟“

”اچھی ہے بلکہ بہت اچھی۔“ ناہید شروع ہو گئی

”میں ساحر بھی لقمے دیتے رہے۔ پھر ہمیشہ کی طرح بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ ملکی، غیر ملکی ادب، ادیب، جاننے کس کس کو کھنا لیا۔ ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی، ٹولستو، پتھی۔ وہاں سے قرۃ العین اور انتظار حسین کے ناولز، ابوالفضل صدیقی کے افسانے، منٹو، کرشن، نیردی، عصمت چغتائی، زبیر بخت آئے اور پھر اوہنری ایڈرا پاؤنڈ اور رابرٹ لوئیس اسٹیونس پر شروعات ہی ہوئی تھی کہ ناہید اک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے ساتھ باتیں کرنے میں یہی تو ایک

مصیبت ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ بہت ضروری کام تھا گھر پر آئی ڈنڈ لہا تھا میں نے انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اچھا تم کام بھی کرتی ہو؟“

”اتنا بڑا ڈھیر دھویا ہے آج کپڑوں کا“ اس نے جتایا۔

”اوہ!“ ساحر نے ہونٹ سکواڑے۔ ”مجھے دلی ہمدردی ہے تم سے۔“

”اچھا ایک بات سنو یہ بتاؤ تمہارا اتنا اچھا مطالعہ ہے دوران گفتگو ذہنی سطح بھی کافی کشادہ اور بلند نظر آتی ہے پھر تم اپنی تحریروں میں چیخ کیوں نہیں لاتیں؟ کب تک مخصوص قسم کے ہیرو، مخصوص قسم کی ہیروئن اور وہ فینٹھسی قسم کا ماحول تم پر نہیں ہونے میں یہ سب لکھ لکھ کر؟“ ساحر بہت صاف گوئی سے اس کی تحریروں پر تنقید کرتے تھے اور اس پر ناہید سے بھی چوڑی بحث ہوتی تھی مگر اس وقت وہ جلدی میں تھی۔

”بہت سے بڑھنے والوں کو ایسی ہی تحریروں پسند ہیں۔ لوگ جو سرائتے ہیں فرمائش کرتے ہیں میں وہی لکھتی ہوں۔“

”لوگوں کے لیے لکھتی ہو یا اپنے لیے؟“

”میں تو صرف پیسوں کے لیے لکھتی ہوں، تھوڑی بہت شہرت اور لوگوں کی پسندیدگی، یہ اضافی بونس ہے اور رہی بات کتھار کس وغیرہ کی تو اندر کی بھڑاس نکالنے کے لیے میری زبان کلنی ہے اس کے لیے میں اپنے قلم کو زحمت نہیں دیتی۔“ ناہید سنجیدگی سے بولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”یہ لڑکی بھی بس عجیب سی ہے اتنی صاف گوئی بھی اچھی نہیں، خصوصاً لڑکیوں کے لیے۔“ ساحر جو پہلے مسکرا رہے تھے کچھ سوچ کر سنجیدہ ہو گئے۔ اپنی اسٹک کے سہارے کمرے سے باہر آتے ہوئے ان کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

کمرے میں عدالت لگی ہوئی تھی۔ داوی کو اگلے

روز بتا چلا تھا کہ ناہید کے ہاتھ میں جو پالی تھی اس میں آلو بیگن نہیں بلکہ آلو بخارے کی چٹنی تھی۔ تائی نے اپنی ساس کا حصہ بھیج دیا تھا۔ اب وہ ناہید کے لئے رہی تھیں۔

”انتا جھوٹ‘ فریب وہ بھی وادی سے۔ تیرے باپ کی ماں ہوں میں۔ میں ہی رہ گئی تھی چال بازی دکھانے کو۔“

شدت جذبات میں وہ اتنے زور سے چیخیں کہ کھانسی آگئی اور ایسی آئی کہ وہ کھانسی کھانسی کر رہی ہو گئیں۔ ناہید نے ان کو پانی پلایا، دیر تک کمر سلانی اور کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ کچھ پونے کے قابل ہوئیں تو ایک بار پھر وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

”ذرا سی چیز کی کیا اوقات ہے پیٹ میں گئی مٹی ہو گئی‘ ارے میں کیا ساری کھا جاتی اگر سچ بول دیتی تو؟ بڑھ لکھ کر یہی سیکھا ہے۔ دھوکا دینا مکاری دکھانا‘ کیسی صفائی سے جھوٹ بولا۔ میں بھلا کتنے روز کی مہمان ہوں جو میرے ساتھ یہ پھل بل کھیلا۔“ وادی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی لغت میں سے الفاظ نکال رہی تھیں جن کے ذریعے پوتی کو شرمندہ کیا جاسکے۔ مگر ناہید ان لوگوں میں سے کہاں وہ تو کچھ اور ہی شے تھی۔

”وادی! اب میں کچھ کہوں‘ آپ کو میری بات بری تو لگے گی مگر آپ ہی کی پوتی ہوں‘ گئے بغیر یہ بھی نہیں سکتی۔ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے تھے مگر مجھے یاد ہے ہمارے بچن میں اور جب گھر میں فریج آتا تب دونوں میں تالا لگا کر رکھتی تھیں آپ اپنی نگرانی میں ناشا‘ کھانا پکواتی تھیں اور آپ کے سامنے ہی دسترخوان بچھتا تھا آپ کی راشن بندی میں آپ کی ہوس میں یا ان کے بچے کتنا پیٹ بھرتے تھے۔ کتنا نہیں‘ ہم بھی اسی ماحول میں بل کر بڑے ہوئے ہیں۔ ایک امڈا‘ ایک پالہ دودھ‘ ایک پلیٹ چاول یا کسی بھی اچھی بری چیز کے لیے نہ ہم ایثار کر سکتے ہیں نہ قربانی دے سکتے ہیں۔“ ناہید بولتی جا رہی تھی اور وادی کی آنکھیں حیرانی کے باعث حلقوں سے ابلنے کو تھیں۔

”کوئی ماں‘ تیری میاں نے کتنا زہر گھول رکھا ہے اپنی

اولاد کے دماغوں میں‘ ارے کیا ظلم کے برابر توڑنے سے تم لوگوں پر‘ کم آمدنی تھی۔ اتنا بڑا کنبہ‘ مٹن کی چھٹی کو ارڈر گھر چلانا بھی تھا‘ بنانا بھی تھا‘ کفایت شعار سے کام لیا تو گھر بنانا سب کھا چاٹ کر برابر کر دیے تو اس کو فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوتے تم سب۔“ وادی نے اپنے احسان گنوائے بھی‘ جتائے بھی۔

ای ویں بیٹھی تھیں‘ مسلمان مشین سنبھالے‘ چاری مرغخان مرغ سی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد ان پر نہیں گئی تھی۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں دھوپ کو چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔

”گھر تو بن ہی جاتا‘ پانچ سال پہلے نہیں تو پانچ سال بعد ہی سہی۔ اس کے لیے فاتحے کروانے ضروری تھے؟“

ناہید نے ماں کی آنکھوں کا اشارہ دیکھ بھی لیا اور سمجھ بھی لیا‘ مگر افسانہ زبان‘ قابو میں رہتی تو بات ہی کی تھی۔

”کس کو کروائے ہیں فاتحے‘ ارے کون بھوکا رہا میرے دور میں‘ میں نے کیا مکھن ملائی سے روٹی کھائی اور تم لوگوں کو سوکھا کلزا پکڑا دیا؟ کوئی مجھے بتائے تو۔“ وادی بلبلا رہی تھیں‘ غصے کے مارے منہ سے جھاگ نکلنے کو تھیں۔

”تمہیں بھی مرض ہے بولنے کا؟ ابھی شور شراباں کر نیچے سے تائی آجائیں گی برابر سے بڑی وادی بھلاوے کا تماشا گھر اٹھو جائے گا۔“ خیمہ نے خود سے ڈیرھ سل بڑی۔ بن کو گھورا۔

”سچ تو کسی سے برداشت ہی نہیں ہوتا۔“ ناہید بڑبڑاتی ہوئی منظر سے غائب ہو گئی‘ جتنی دیر وہ وہاں رہتی اتنی دیر حالات مزید خراب ہونے کا امکان تھا۔ وہ غصے میں کانڈ قلم سنبھال کر بیٹھ گئی‘ تھوڑا سا کھانا پھر کتنی ہی دیر صفحے کو گھورتی رہی‘ ذہن ماؤف ہو رہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھے۔ بے زار ہو کر اس نے قلم بھی ایک طرف پھینک دیا اور سیدھی ساحر کے پاس جا پہنچی۔

”لوگ آخر اپنے بارے میں سچ سننا برداشت کیوں

نہیں کرتے؟“

”سچ کروا ہوتا ہے اور کروا ہٹ سب ہی کو‘ اور گزرتی ہے پانی داوے ہوا کیا ہے؟“

”لڑائی۔“

”ایسا کوئی ہے جس سے تمہاری لڑائی نہ ہوئی ہو؟“

ساحر نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو ابھی تک غصے سے تھمارا ہوا تھا۔

”ہاں‘ آپ ہیں نا۔“ ناہید نے ترنت جواب دیا۔

”ساحر سی وجہ ہے کہ میں تمہیں ”برداشت“ کر لیتا ہوں اس لیے اب تک میرے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“ ساحر بہت آرام سے کہہ رہے تھے۔ ناہید کے چہرے کی تھمارا ہٹ جو کم ہو رہی تھی اک دم ہی بڑھ گئی۔

”آپ کو میں نے ایسا کیا کہا جو برداشت کرنے کا لہجہ دے رہے ہیں؟“ ناہید کا انداز ٹیکھا ہو گیا۔

”تمہیں شاید پتا نہیں چلنا مگر کئی بار تم میرے گھر والوں کے متعلق ایسے تبصرے کر جاتی ہو کہ کوئی اور سن کر تو برا زبردست جھگڑا ہو۔“

”اچھا۔“ وہ ناہید سے فوری طور پر کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا کہ وہ اکثر چھوٹی وادی اور ان کی فیملی کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتی تھی اور ساحر ہنس کر ٹال جاتے تھے۔

”اب تو آپ بھی برا ماننے ہیں‘ لگتا تو نہیں ہے اتنے دھمے اور نرم مزاج ہیں‘ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ میں ”مانڈ“ کرنے والی حس موجود ہی نہیں۔“ کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔

”جب مانڈ ہے تو مانڈ بھی کریں گے بس بات سرف اتنی سی ہے کہ جذبہ کوئی بھی ہو آپ سے باہر نہیں ہوتے۔“ ساحر مسکرائے۔

”جیسے کہ میں؟“ ناہید نے تصدیق چاہی۔

”بالکل جیسے کہ تم۔“

”دیے کم تو آپ بھی نہیں ہیں‘ مخمل میں لیٹ کر میاں سی جو تا تو مار دیتے ہیں‘ شوگر کوڈ کو مین کا ذخیرہ آپ کے پاس بھی ہے۔“ ناہید نے انہیں گھور کے دیکھا۔

”تھوڑی سی تم لے لو‘ ضروری نہیں کہ ہر ایک پر ڈائریکٹ سنگ باری ہی کی جائے‘ کبھی شوگر کوڈ کو مین بھی استعمال کر لیا کرو۔“ انہوں نے فراخ دلی سے پیش کش کرتے ہوئے اسے نصیحت بھی کی۔

”بعض لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں یا تو جو تا کھینچ کر مارا جائے یا پتھر۔“ ناہید کا انداز بے لچک تھا۔

”چھا بھی جیسے تمہاری مرضی‘ اب میں نے ہی تو ٹھیکہ نہیں لیا ہونا تمہیں سدھارنے کا۔“ ساحر کی بے نیازی اور لاپرواہی کے پیچھے کسی قدر خفگی چھپی ہوئی تھی جو بظاہر محسوس نہیں ہوتی تھی مگر احساس رکھنے والا ”دل“ شاید سمجھ لے۔

”کیا آپ مجھ سے ناراض ہو رہے ہیں؟“ ناہید کو شک ہوا‘ احساس پتا نہیں ہوا کہ نہیں۔

”تم تو خود اکثریت سے ناراض رہتی ہو‘ تمہیں کسی کی ناراضی کی کیا پروا۔“

”یہ تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“ ناہید جھٹ سے کہنے لگی۔ ”میں اکثر یہ بات سوچتی ہوں پوری دنیا میں واحد‘ آپ ہی ہیں جو سب سے زیادہ مجھے جانتے اور سمجھتے ہیں۔“

”عزت افزائی کا شکریہ۔“

”دیکھا‘ آپ سے کچھ دیر باتیں کیں تو میرا سارا غصہ غائب ہو گیا اور موڈ بھی اک دم فریش۔“ ناہید چمکی۔

”اس لیے کہ جو کچھ تم اپنے ساتھ لائی تھیں وہ سب یہاں آ گیا ہے۔“ ساحر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”پھر وہی مخمل کا جو تا۔“ ناہید خلاف توقع ہنس پڑی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اجازت ہے؟“

”اگر نہ کہوں گا تو نہیں جاؤ گی؟“

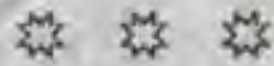
”جانا تو ہے مجھے۔ آپ کے کہنے سے رکوں گی تھوڑی۔“ ناہید کی صاف گوئی پھر عود کر آئی۔

”پھر پوچھا کیوں؟“

”یونہی آپ کو عزت دے رہی تھی۔“ وہ جواب

نے بغیر چھپاک سے باہر نکل گئی۔

”عزیزت؟“ ساحر کامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انہیں یاد کیوں نہیں رہا، بھلا اس لڑکی سے کوئی جیت سکتا ہے؟



ابو کو چائے بنا کر دی، امی کو ان کی دوائی دی۔ وہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھیں، گھر کی سویوں پہ ایک عجلت بھری نگاہ ڈال کر وہ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”ثمنینہ! رات کا کھانا تم پکا لیتا آج۔ مجھے اپنی کہانی مکمل کرنی ہے۔“

”تقریباً“ روزانہ میں ہی پکاتی ہوں۔“ ڈائجسٹ میں غرق ثمنینہ نے نظر اٹھائے بغیر اسے جتایا۔

”کیوں پُرسوں روٹیاں میں نے نہیں پکائی تھیں۔“ ناہید نے چمک کر کہا۔

”مہینے میں چار دن روٹیاں پکالیں تو کیا ہوا“ باقی کے چھ بیس دن تو میں ہی کام کرتی ہوں۔“

”تو میں بھی کوئی فارغ نہیں بیٹھی رہتی نہ تمہاری طرح فی وی کے آگے ڈٹی رہتی ہوں، کتنی قلم کی مزدوری کرتی ہوں، جو چار پیسے آتے ہیں وہ گھر میں ہی خرچ ہوتے ہیں تم سب پر۔“ ناہید نے بغیر کسی لحاظ کے اسے سنا دیں۔

”ہاں تمہاری کمائی سے تو گھر چل رہا ہے، کنبہ چل رہا ہے، ابو صبح سے شام تک جو محنت کرتے ہیں وہ آمدنی جانے کہاں خرچ کرتے ہیں۔ امی کو سلائی کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ شاید اپنے کسی خفیہ اکاؤنٹ میں ڈال دیتی ہیں۔“ ثمنینہ بھڑک اٹھی۔ بسن نے طعنہ ہی ایسا دیا تھا۔ ڈائجسٹ ایک طرف رکھ، وہ ناہید کو سبق سکھانے کے دیے ہو گئی۔

”مجھے اپنی تحریر مکمل نہ کرنی ہوتی تو بتاتی۔“ خلاف توقع ناہید نے میدان چھوڑ کر پسائی اختیار کی۔

اس کا قلم تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ خیالات کی ایک رو تھی جو روانی سے بہتی چلی آرہی تھی۔ نیچے

سے شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں بلکہ آواز کہاں فقط ایک ہی آواز تھی، نائی اماں کی یقیناً ”کھانا“ کی شامت آتی ہوگی، اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں جو اور اماں دونوں سے سناتا تھا۔

”اف یہ لوگ۔“ ناہید نے اپنے دکھتے ہوئے ہاتھ جھٹکا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

تحریر اختتامی مراحل میں تھی جب کوئی اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ناہید نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر دیکھا، ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بدستور اپنے کام میں منہمک رہی۔ اس کی تحریر مکمل ہو ہی گئی۔ آنے والے کو دس منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

”کیا ہوا“ آج کی مار پڑ گئی کیا؟“ ناہید نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر قلم ہاتھ سے رکھا۔

”تنگ آگیا ہوں میں اس روز کی کل کل سے۔“ طارق کا چہرہ جانے غصے سے سرخ ہو رہا تھا یا خفت سے۔

”ظاہر ہے جب محلے والے روز کے اس تماشے سے تنگ آئے ہوئے ہیں تو تم تو پھر ”متاثرہ فرد“ ہو۔“

ناہید نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

”ابا کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے اچھی بھلی گزر رہی تھی شادی کا بھوت سوار ہو گیا ہے سر پر۔“

”اچنی؟“ ناہید اچھل پڑی۔

”اچنی نہیں، ”میری“ بے وقوف۔“ طارق نے برا سامنہ بنا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اللہ رحم کرے، کس بے چاری کا برا وقت آیا ہے۔“ ناہید زیر لب برسرِ طلی۔

”دونوں میاں بیوی ایک کر کے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ کوئی اور بہتر نوکری تلاش کروں، جس میں تنخواہ زیادہ ہو تاکہ ان کا بھولانے کا ارادہ پورا ہو سکے۔“

طارق اپنی دھن میں مگن اسے بتا رہا تھا۔

”اب میں راتوں رات زیادہ تنخواہ والی نوکری کہاں سے تلاش کر لوں موجودہ جاب ہی اتنی مشکلوں سے لی ہے، تنگ کے کرتار ہوں گا تو تنخواہ بھی بڑھ ہی جائے

گی ہے نا؟

”ہوں صورت حال گمبیر ہے۔“ ناہید نے اپنی پیشانی کو مسلا۔

”یار! تو ایک بات سن میری۔“ طارق نے اسے مخاطب کیا۔

”ہاں!“ ناہید نے سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔

”ایسا کرتے ہیں ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ کچھ تو اپنا لکھنے بڑھنے سے کمالے گی کچھ میں کمالوں گا“ دونوں مل جل کر گزارا کر لیں گے۔“ طارق کی تجویز پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”وہ جو تمہاری ایک سو ایک محبوبائیں ہیں وہ کس دن کام آئیں گی؟“

”ساری کی ساری نکمی اور فضول میں نے ہری جھنڈی دکھادی۔“ طارق نے سچائی سے کام لیا۔

”اسی لیے جھٹ یہاں پہنچ گئے میرے پاس! میرے پاس بھی یہی جھنڈی ہے تمہیں دکھانے کے لیے۔“

ناہید نے سر دھری سے جواب دیا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا سیریس ہوں۔“

”اور میں تم سے زیادہ سیریس ہوں سمجھ۔“ ناہید نے شہادت کی انگلی اٹھائی۔

”تم مجھے لالباہی نکمایا فضول قسم کا انسان سمجھتی ہو ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ تم مجھے جو چاہو سمجھو میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کرو مگر یہ حقیقت ہے میں سچ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔“

طارق بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”اف! کیا وقت آگیا ہے مجھ پر تم جیسے باگز بلے سے یہ ڈانٹ لاگ سننے پڑ رہے ہیں۔“ ناہید نے جیسے خود پر ترس کھایا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے تمہارا یہ ڈانٹ لاگ سن کر میں موسم کی طرح پھل جاؤں گی۔“

”کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی سے تو شادی کرے گی نا۔“ طارق بحث پر اتر آیا۔ ”تو مجھ سے کر لے کیا حرج ہے؟“

”لوہوں نہ میں تمہاری عزت کر سکتی ہوں نہ

محبت۔ دن میں بیس بار تو ہمارا آپس میں ٹاکرا ہوتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟“ ناہید نے نفی میں سر ہلایا۔

”تمہاری کہانیوں میں تو شادی ہو جاتی ہے نہ؟“

تک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں پھر لپٹا کر ایک دن انکشاف ہوتا ہے کہ سارے جھگڑنے کے پیچھے محبت چھپی ہوئی ہے۔“ طارق کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

”کہانیوں میں سب کچھ حقیقت نہیں ہوتا۔“

”خواب ہوتے ہیں کچھ خیال کچھ تصورات کچھ خواہشات اگر خالی خالی زندگی کے حقائق بیان کرنا شروع کر دیں تو کوئی بھی قبول نہ کرے۔ اصل زندگی میں اور افسانوں کی دنیا میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔“

ناہید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کہانیوں میں وہی سب ہوتا ہے جو زندگی میں ہوتا ہے بلکہ کبھی تو کہانیوں میں بھی اتنے موڑ اور تہذیبیال نہیں ہوتیں جتنی اصل زندگی میں ہوتی ہیں۔“ طارق نے اس سے اختلاف کیا۔

”تم بلاوجہ کی بحث کر رہے ہو۔ بہت سے معاملات ہوتے ہیں جو دیکھنے پڑتے ہیں بالفرض یہ شادی ہو بھی گئی تو تالی کے ساتھ میری نہیں بنے گی روز کے فیصلے ہوں گے پہلے ان کے ساتھ پھر تمہارے ساتھ۔“

”سناں بہو کے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے جھونپڑی سے لے کر شاہی محل تک ہر جگہ ہیں۔“

”اف!“ ناہید نے سر پکڑ لیا۔ ”تمہاری یہی حالت مجھے زیر لگتی ہے اپنی بات منوانے کے لیے بلاوجہ کی بحث تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہاری باتوں سے قائل ہو کر ہاں کہہ دوں گی؟“ ناہید نے محل کا چولا اتار پھینکا اور اپنے فطری رنگ میں آکر بے حد اکھڑپن سے بولی۔

طارق کچھ دیر لب بھینچے اسے گھورتا رہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے یہ بات لکھ کر رکھ لے کہ میرے علاوہ دنیا

میں کوئی اور شخص نہیں ہے جس سے تیری ”بن“

”وہ تجویز سے باہر نکل گیا۔“

”جل نکلا گئیں گا۔“

تایا لبا کی تھن گرج گھر کے دروازے پر کیا پورا محلہ سن رہا تھا۔ موضوع وہی تھا صاحبزادے کی شادی۔ اب تو محلے کے لوگوں نے بھی آتے جاتے صاحبزادے سے پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

”مگر بھی رشتہ طے ہوا کہیں؟“ نینجیٹا صاحبزادے گھر اور باہر دونوں جگہ بھٹائے ہوئے پھر رہے تھے پھر تایا کی ایک اور فرمائش سن کر طارق تو خاموش ہو گیا اور تالی کی بڑبڑاہٹ شروع۔

”نینجی ہے لاڈلی ہے اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ چھوٹیوں بھرا کباب اپنے دسترخوان پہ سجایا جائے“

مگر وہ بھی بس اپنے بچوں کے سامنے ہی بڑبڑاتی رہیں۔ شوہر کے آگے تو دھماکے کی بجائے نہیں تھیں۔

”ایسا کو جتا دیجیے گا کہ ناہید انکار کرے گی کوئی فائدہ نہیں بچا سے بات کرنے کا۔“ طارق نے ماں کو آگاہ کیا۔

”جیسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ منع کر دے گی تو نے کچھ

کہا تھا اس سے؟“ تالی نے مشکوک نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

”تب بال کی کھال مت نکالیں جو کہا ہے وہ اب تک پینکوس بس۔“ طارق جھنجھلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔

ابا تک بات پہنچ گئی وہ کچھ دیر تک بیوی کی بات پر غور کرتے رہے پھر فیصلہ کن انداز میں بیوی سے گویا ہوئے۔

”میں نورالہی سے بات کرتا ہوں۔“

”گلب کیا بات کریں گے؟“

”دونوں لڑکیوں میں سے کوئی بھی دے دیں ناہید کو یا نینجی کو۔“

”بہت رہی ہیں کوئی بھی دے دیں ہمیں گھسیں گے بھلائی بھانج کے گھر۔ دنیا میں لڑکیاں ختم ہو گئی

ہیں۔“ بیوی بڑبڑائیں مگر ظاہر ہے کہ ان کی بڑبڑاہٹ اتنی ہی تک محدود رہنا تھی۔

تایا نے اپنے بھائی بھانج سے اور اماں سے بات کی۔

”وہ نواسیاں بھی تمہیں طارق کے جوڑی ان میں سے کسی کی ہو جاتی تو۔“ انہوں نے سوچا۔

تایا کو جو کہنا تھا وہ کہہ دیا بھائی بھانج نے کہا کہ وہ آپس میں مشاورت کر کے جواب دیں گے۔

ناہید نے سنا تو دنگ رہ گئی۔

”نینجی کی کر دیں۔“ اس نے بے نیازی سے ماں سے کہا۔

”بڑی تو تم ہو پہلے تمہاری ہونی چاہیے۔“ وہ ہچکچائی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ ہنوز اسی لاپرواہ انداز میں گویا ہوئی۔

”لوگ کیا کہیں گے بڑی سے پہلے چھوٹی کا رشتہ طے کر دیا۔“ امی نے بے چارگی سے اپنی اس اکھڑپن کی جی کو دکھا۔

”جو کوئی اس طرح کی بات آپ سے کرے اس سے کہہ دیجیے گا کہ چھوٹی کا رشتہ آیا ہم نے کر دیا۔ اب بڑی کا تم لاؤ۔“ ناہید نے بہت آرام سے حل بتایا۔

امی جل کر رہ گئیں۔

”تمہارے ابو سے کیا کہوں؟“

”کہہ دیجیے گا کہ میں نے انکار کر دیا ہے۔“

”طارق بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”ہاں ہاں میں گلب کہہ رہی ہوں کہ برا لڑکا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ بے شک اسے اپنا داماد بنالیں اب وہ بڑا داماد ہو یا چھوٹا کیا فرق پڑتا ہے۔“

امی مایوس ہو کر اٹھ گئیں ان ٹکوں میں تیل نہیں تھا۔

ای، ابو نے شہینہ اور طارق کے رشتے کے لیے ہاں بھری تھی، دونوں گھرانوں میں ممکن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تاہم نے ان ہی مصروف دنوں میں ایک دن طارق کو جا پکڑا۔

”مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری بہن سے شادی کر رہے ہو؟“

”انکار تم نے کیا ہے، بدلہ لیتا ہو گا تو تم سے لوں گا اس بے چاری سے کس بات کا بدلہ لوں گا۔“ طارق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بانی داوے یہ کس قسم کی محبت ہے کہ جس سے چاہت کا دعوا کرو اس کی چھوٹی بہن سے شادی کر لو۔“ وہ طنز کے بغیر نہ رہ سکی۔

”یہ فیصلہ میرے ابا کا ہے، میرا نہیں، ابا کے آگے کوئی کچھ بول سکتا ہے؟“ طارق چڑچڑے پن سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس رشتے میں تمہاری مرضی شامل نہیں؟“

”اب مجھے ایسا افلاطونی عشق بھی نہیں ہے کہ تمہارے فراق میں صحراؤں کی خاک چھانے بیٹھ جاؤں یا بن باس کیے جنگلوں میں نکل جاؤں اب جب رشتہ ہو ہی رہا ہے تو میری مرضی شامل ہوتے کتنی دیر لگے گی۔“ طارق نے یکایک پینتر ابدلا۔

”اوہ، ناک ابھی ابھی اوپن ہی ہے۔“ ناہید نے لب سکڑے۔

”کیوں نہ ہو، کسی عام انسان کی ناک نہیں ہے، ویسے تم سچ بتاؤ اس رشتے سے جیلس تو نہیں ہو رہیں؟“ طارق نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

”جیلس ہوتی ہے میری جوتی میں نے تو خود اس رشتے سے منع کیا ہے، اب تمہاری شادی میری بہن سے ہو یا میری کسی دشمن سے مجھے کیا۔“ وہ تپ گئی۔

”جب کوئی مطلب نہیں ہے تو اس تفتیش کا کیا مطلب؟“ طارق نے بغور اسے دیکھا۔

”کیا ہم پہلے باتیں نہیں کرتے تھے؟“ پہلے کی بات اور تھی۔“ طارق لمبے لمبے ڈگ

بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

لکھتے لکھتے وہ اچانک ہی آکٹا سی گئی۔ قلم ہاتھ سے رکھ کر کچھ دیر جانے کیا سوچتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”امی! میں بڑی دادی کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ درست کرتے وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

”اس کے بڑے چکر لگتے ہیں پڑوس میں۔“ وہ نے جاتی ہوئی پوتی کو دیکھ کر سوچا۔ ”پتا نہیں ہاں کی بیٹیوں کا رشتہ کیسے ہوا کہ نہیں، کئی روز سے تو وہ بھی نہیں۔“ وہ اپنی بیٹیوں اور نواسیوں کے متعلق سوچنے لگیں جب سے شہینہ اور طارق کی ممکن ہوئی تھی انہیں اپنی نواسیوں کی فکر لگ گئی تھی۔

ساحر اپنے کمرے میں بیٹھے حسب معمول مطالعے میں مگن تھے۔

”او بھئی۔ کہاں تمہیں اتنے دنوں سے؟“ ساحر نے بے شاشت سے کہتے ہوئے کتاب ہاتھ سے رکھ دی۔

”شہینہ کی انجینئرنگ تھی تائیں اسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے ہم سب۔“ ناہید اس کی رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر جائزہ لینے لگی۔

”ہاں بھئی۔ مٹھائی کھائی تھی ہم نے، بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔“

”جس کی ممکن ہوئی ہے، اسے جا کر مبارک باد دیں۔ مجھے تب دیجیے گا جب میری ہو۔“ ناہید نے کتاب کے ورق پلٹتے ہوئے کھٹاک سے جواب دیا۔

”سوچا تو تھا جانے کا، مبارک باد بھی دے آنا تم سے ملاقات بھی ہو جاتی مگر بس۔“ ساحر نے بات ادھوری چھوڑی۔

”زیادہ دن تو نہیں ہوئے مجھے، ایک ہفتہ ہی نہیں آئی شاید۔“ ناہید نے بغور انہیں دیکھا۔

”عادت بڑ گئی ہے، ہر دو سرے تیسرے دن چکر لگاتی ہوتا، کی محسوس ہو رہی تھی تمہاری۔“

”تو کمر آ جاتے۔“ ناہید کمرے میں رکھی بہت سی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی، یہ کمرہ دراصل سالن

کی کوچنگ سینٹر تھا جہاں وہ میٹرک سے گریجویشن تک کے اسٹوڈنٹس کو پڑھاتے تھے۔ یہی ان کا پیرینہ آمدنی تھا اور اس میں ٹھیک ٹھاک آمدنی ہو جاتی تھی۔

انہوں نے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا تھا۔ اور ماسٹر کے بعد سب سے زیادہ باذوق، ذہین اور بامروت ساحر کی زندگی میں ایک نیا موڑ تب آیا جب آج سے تین سال پہلے ایک حادثے میں ان کی دائیں ٹانگ کی پٹھائی ہوئی اس طرح چور ہوئی کہ آئندہ کے لیے وہ اسٹک کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ بہت برا حادثہ تھا، طویل علاج کے بعد وہ وہیل چیئر چھوڑ کر اسٹک کے سہارے پر آ گئے، پہلے سال وہ بہت اداس اور فرسٹریشن کا شکار رہے مگر پھر سب نے دلجوئی کی، کچھ انہوں نے خود اپنے آپ کو سمجھایا، بہر حال آہستہ آہستہ وہ کسی حد تک اپنی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس چھڑی کے سہارے سے اپنے قدموں پر چل پھر سکتے ہو، کسی دوسرے انسان کے محتاج نہیں، کون سمجھاتا تھیں اور کب تک؟“

باب نے سمجھایا، پھر انہوں نے ہی گھر میں کوچنگ سینٹر کھولنے کی صلاح دی۔ اپنی محدود بچت پہلے ہی میٹھے کے علاج پر لگا چکے تھے پھر بھی کچھ جوڑ توڑ کر کے گھر کے آدھے حصے کو ایک بڑے ہال نما کمرے کی شکل دی، ضروری ساز و سامان ڈلوایا اس سے متصل ساحر کا کمرہ تھا۔ ہر ممکن آسائش اور سہولت سے مزین گھر کو وہ اپنا بیشتر وقت اسی ہال نما کمرے میں ہی گزارتے تھے جہاں شاپنگ میں سچی کتابیں ان کا قیمتی سرمایہ بھی تھیں اور ساتھی بھی۔

ناہید کو بھی شروع سے ہی کتابوں سے شغف تھا پھر جب سے اس نے کہانیاں، افسانے ناول وغیرہ لکھنے شروع کیے، مطالعہ اس کی ضرورت بھی بن گیا گو کہ ساحر جیسا وسیع مطالعہ نہیں تھا اس کا مگر پھر بھی ٹھیک ٹھاک مطالعہ اور اچھا ذوق دونوں میں مشترک تھا، ادب کے علاوہ بھی دنیا جہاں کے موضوعات پر دونوں باتیں کرنے پر تے تو کرتے ہی چلے جاتے۔ ناہید اپنے

بچپن سے اس گھر میں آنے کی عادی تھی۔ شعور آیا کتابوں کا شوق ہوا تو سا کی چھوٹی سی لائبریری سے بڑی مدد ملی اور اب تک مل رہی تھی۔ ساحر باقاعدگی سے اس کا لکھا ہوا پڑھتے تھے اور بصرہ بھی کرتے تھے مشورے بھی دیتے یہ اور بات کہ ناہید ان تبصروں، مشوروں کو ایک کان سے سنتی، دوسرے کان سے نکال دیتی۔

”اب تک تو یہ کتاب آپ کو حفظ ہو چکی ہوگی۔“ ناہید ”آپ گم“ کے صفحہ بدستور پلٹ رہی تھی۔

”پتا نہیں کیا بات ہے ایک مشتاق احمد یوسفی اور دوسرے مختار مسعود میں ان کا لکھا ایک ایک لفظ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، بار بار پڑھتا ہوں، مگر دل نہیں بھرتا، آکٹا ہٹ نہیں ہوتی، جتنی بار پڑھو معانی و مطالب کا ایک نیا دور وا ہوتا چلا جاتا ہے، غالب کی شاعری کی طرح۔“ ساحر ہمیشہ کی طرح پر جوش انداز میں شروع ہو گئے۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی مصنف اور اس کی تصنیف سے انسان کو اتنا لگاؤ اتنی انسیت ہو جائے کہ وہ محبت کا دعوا کرنے لگے۔“ ناہید نے سوال اٹھایا۔

”بالکل ہو سکتا ہے، کیوں نہیں ہو سکتا، لوگ فنکاروں، ہنرمندوں اور کھلاڑیوں وغیرہ سے لگاؤ رکھتے ہیں، محبت کرتے ہیں تو لفظوں کی بنت کاری کرنے والوں، قلم کا جادو چلانے والوں کا سحر کیونکر طاری نہیں ہو سکتا۔“

”جن شعبوں کی آپ نے مثالیں دی ہیں، یہاں سب چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں جو شخص آج کامیاب ہے، مقبول ہے اپنے مقام سے نیچے ہوا اور لوگوں کے ذہنوں سے دور گیا پھر یہ محبت تو نہ ہوئی۔ انسیت بھی نہیں۔“ ناہید نے اختلاف کیا۔

”چلو ان کو چھوڑو مگر الفاظ کا جادو تو کبھی پرانا نہیں ہوتا، نہ اس کے لکھنے والے ذہنوں سے اترتے ہیں، کتنے ہی نقش ہیں جو آج بھی اتنے ہی پائیدار ہیں جتنے آج سے پچاس سو یا ڈیڑھ سو سال پہلے تھے۔“

”ہم لوگ جذباتی قوم ہیں، آپ بھی اسی قوم کا حصہ

ہیں جلدی ہی ہر کسی کو سر آنکھوں پر بھی بٹھالیتے ہیں اور فوراً ہی اتار بھی دیتے ہیں۔ دل کے پیچھے چلتے ہیں عقل سے کام نہیں لیتے۔ "ناہید جھنجھلائی۔"

"دل کے پیچھے چلنے میں کیا خرابی ہے؟ ہمارے اقبال بھی تو دل کو عقل پہ ترجیح دیتے ہیں۔" ساحر مسکرائے۔

"عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پہ اعمال کی بنیاد رکھ۔"

"یہ تو محبت کے سب سے اعلا درجے کا معاملہ ہے وقتی اور سستی جذباتی وابستگی کا اس سے کیا مقابلہ۔"

ناہید آہستہ سے بولی۔

"ہوں یہ سچ ہے کہ ہمارے پیارے علامہ جس دل اور عشق کی بات کرتے ہیں وہ ہر کھوٹ اور آلائش سے پاک نہایت افضل درجے کا ہے مگر یہ جذباتی وابستگی سستی اور وقتی نہیں ہوتی اسے تو آپ تسلیم کریں۔"

"کیا بات ہے کچھ ابھی ابھی سی لگ رہی ہو؟"

ساحر نے ناہید کی خاموشی پر اسے غور سے دیکھا۔

"طارق نے مجھے پروپوز کیا تھا۔" وہ اچانک ہی بولی۔

"اچھا! ساحر چونکے۔ "پھر؟"

"میں نے منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

"میں نے اس سے کہا کہ نہ میں تم سے محبت کر سکتی ہوں نہ تمہاری عزت ہماری گاڑی زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔" ناہید بتانے لگی۔

"عزت اور محبت صرف انسانوں سے مشروط نہیں ہوتی رشتوں سے بھی ہوتی ہے۔ جب کوئی رشتہ قائم ہوتا ہے تو اس کے حوالے سے عزت اور محبت بھی خود بخود دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔" ساحر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"پتا نہیں مجھے تو جو محسوس ہوتا تھا میں نے اس سے وہی کہہ دیا۔" ناہید نے کندھے اچکائے۔

"اور بات سنو تمہاری پچھلے ماہ کی تحریر میں مرکزی

خیال بہت اچھا تھا مگر اس کے کیریکٹر؟ پھر وہی سید حسین لڑکی بہت ہنڈ سم اسٹارٹ لڑکا کیا عام لوگوں کی محبت نہیں ہو سکتی کسی سے؟"

"ہوتی ہوگی مگر مجھے اسی طرح کے کیریکٹر کو کبھی اچھا لگتا ہے روایتی ہیرو ہیروئن بہت پیاری بھالی کمسن خوش ادال لڑکی اور لوٹ کر چاہنے والا شہر ہنڈ سم سالڑکا مجھے نہیں پتا افلیکچور مل کس کی ہیروئن اور نہایت بردبار سنجیدہ مزاج ہیرو۔" ناہید منہ بنایا۔

"بھئی۔ ہمیں تو پسند ہیں۔"

"ایک رائٹر جو کچھ لکھتا ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق لکھتا ہے۔ کسی کے مشوروں کے مطابق نہیں۔"

"بعض مشورے اپنی مرضی تھوپنے کے لیے نہیں بلکہ بستری اور اصلاح کے لیے ہوتے ہیں ان پر تو غور کر لیتا جاوے۔"

"ٹھیک ہے کبھی وقت ملا تو غور کر لیں گے۔" ناہید نے ہاتھ ہلایا۔

"پتا ہے انسان کی تحریر میں اس کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے اس کا اپنا آپ کہیں نہ کہیں جھلکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" ناہید نے ان کی بات سے مطمئن اتفاق کیا۔

"تمہاری تحریروں سے لگتا ہے کسی بہت حساس خواب پرست لڑکی نے یہ کہانیاں لکھی ہیں۔" ساحر نے اس کے بارے میں تجزیہ کیا۔

"غلط لگتا ہے میں ایسی نہیں ہوں۔" ناہید نے ان کی بات کی فوراً نفی کی۔

"یہی سوچ کر تو حیران ہوتا ہوں تمہاری تحریروں میں تمہارا اپنا آپ نظر کیوں نہیں آتا؟"

وہ بے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی تحریر سے مختلف ہوتا ہے ضروری نہیں کہ اس کے لکھے ہوئے میں اس کا اپنا آپ بھی کہیں نظر آئے انسان تھوڑا بہت عیاں ہو سکتا ہے۔ سو فیصد نہیں۔" ناہید نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"جس بات پہ اڑ جاتی ہو بس وہی حرف آخر۔"

ساحر چلے گئے۔

"اور آپ اتنی آسانی سے سرنڈر کیوں کر دیتے ہیں؟"

"سرنڈر نہیں کرتا بس دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے چپ ہو جاتا ہوں اور جو میری رائے ہوتی ہے اس پر قائم رہتا ہوں۔"

"دوسرے کو قائل تو نہ کر سکے نا۔" ناہید نے ہنسی بھری۔

"محبت سول کو قائل کر چکا ہوں سوائے ایک بی بی کے کہ جب بولنے پر آتی ہیں تو فقط اپنی ہی کہتی ہیں اٹکے کی سنتی ہی نہیں۔" ساحر شگفتہ لہجے میں بولے۔

"آگے کا ڈانٹا لگ بھی تو کیسے سنتی ہیں تو سمجھتی نہیں سمجھ بھی جاتی ہیں تو قائل نہیں ہوتیں اور قائل ہو جائیں تو اقرار نہیں کرتیں۔" ناہید نے چمک کر ساحر کی بات دہرائی۔

"تمہیں میری باتیں یاد رہتی ہیں؟" وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"اپنے بارے میں اتنی بارسن چکی ہوں اب تو حفظ ہو گیا ہے۔" وہ ہنسی۔

"آپ کے اسٹوڈنٹس آنے والے ہیں۔" ناہید نے دوبارہ گھڑی کی جانب دیکھا۔ "میں چلتی ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ناہید کے رشتے کے لیے سر توڑ کوششیں جاری تھیں مگر اب تک کہیں بات نہ بنی تھی۔ سر توڑ کوششوں کی ضرورت اس لیے پڑی کہ تایا طارق کی شادی جلد کرنے کے لیے زور دے رہے تھے اپنے بھائی بھائی کو انہوں نے اپنے انداز میں الٹی میٹم دے دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے جوڑے خرچوں کی۔ بس شہرت کے پالے لے نکاح کر دیں۔

سوائی ابو کا خیال تھا کہ ناہید کا بھی کہیں رشتہ ہو جاتا تو دونوں کی ساتھ کر دیتے۔ ابو پیسوں کے جوڑ توڑ میں

مصروف تھے بے چارے کیا کرتے سفید پوش گھرانہ کمر توڑ مہنگائی اور فضول اور لالچ یعنی رسم و رواج سب ہی مل کر کمر توڑنے کو تیار تھے۔

"دو شادیوں میں کیا کم خرچا ہوتا ہے دونوں کو برابر کا ساز و سامان چاہیے ایک ذرا کھانے کے خرچے میں کچھ فرق پڑتا ہے پھر بھی دو بار اتوں کا انتظام اتنے مہمان عزت کے تیرے چھوٹے اور نکمے اکیلے تو کیا کیا کرے گا بس ایک کور خست کر کے فارغ ہو۔" وادی نے بیٹے کو صلا ح دی۔ اوہر ناہید بھی ایک ساتھ شادی کے حق میں نہیں تھی۔

"ہم تو ایک دوسرے کی شادی انجوائے کر رہی نہیں سکتے۔ دونوں کی شادی الگ الگ ہونی چاہیے۔" ناہید نے زور دیا۔

شہینہ کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں وہ دن جو بہت دور لگ رہے تھے یوں قریب آگئے جیسے کبھی دور تھے ہی نہیں پھر وہ مبارک اور بر رونق ساعت بھی آئی جب شہینہ پیاسنگ رخصت ہو گئی گو کہ رخصتی کا یہ سفر کچھ زیادہ لمبا نہیں تھا اوپر کے پورشن سے نیچے کے پورشن میں ہی آتا تھا مگر پھر بھی سب گھر والوں کی آنکھیں نم اور دل اداس تھے۔

شادی کے ابتدائی دن تھے وہ طارق کی سنگت میں خوش تھی دن بھر میں ایک چکر اوپر کا ضرور لگاتی اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی دمک اس کی خوشی کے غماز تھے۔

لیکن خوشیوں بھرے لمحات بالآخر ختم ہوئے تو عملی زندگی میں قدم رکھنا ہی پڑا۔

اس دن بھی ایر کنڈیشن کی پر لطف ٹھنڈ میں وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی جب کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

"کیا مصیبت ہے؟" شہینہ بھٹائی۔

"تمہیں الارم کی آواز نہیں آتی میں نہاد ہو کر تیار بھی ہو گیا اور تمہاری اب تک آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

طارق اس پر جھکا غرا رہا تھا۔
”کیا کروں آنکھیں کھول کر؟“

”نہا تم دیکھو آنکھیں کھول کر، ناشتا بناؤ فٹ میں لیٹ ہو رہا ہوں پوری رات بجلی کی آنکھ پھولی میں گزر جاتی ہے اب ذرا جا کر کیس نیند آئی ہے تو تمہارا باجا بجتے لگا ہے۔“ شیمہ کو یوں اٹھائے جانے پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔

”اس آنکھ پھولی میں میری بھی نیند خراب ہوئی ہے، تم تو دن میں پھر بھی اپنی نیند پوری کر لیتی ہو، ہم تو سارا دن کام پر ہوتے ہیں سونے کا تو کیا بیچ منٹ آرام کا بھی وقت نہیں ملتا۔ بھی یہ احساس کیا شوہر کا“ طارق نے اسے بتایا۔

”سونے دو بھی، بڑی اچھی نیند آ رہی ہے۔“ شیمہ نے پھر آنکھیں موندیں۔

”تم کوئی کبھی سچی نہیں ہو جو تمہیں ہر بار سمجھانا پڑے اب صبح کا ناشتا تمہاری ذمہ داری ہے تو بلا وجہ ڈرامے کیوں کرتی ہو، نا تم سے اٹھ کر اپنا کام کیا کرو۔“ طارق کا لہجہ درشت تھا شادی کے نئے نئے دنوں کا خمیر آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا، عملی زندگی کے حقائق سامنے آرہے تھے، پھر طارق تھا بھی غصے کا تیز۔ اس میں ویسے بھی برواشت کی کمی تھی، مگر برواشت تو شیمہ کو بھی نہیں تھی اس بات کا طارق کو اب اندازہ ہو رہا تھا۔

”صبح کا ناشتا ہی کیوں، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا“ جھاڑو برتن، صفائی، کپڑے دھونا سب ہی کچھ میری ذمہ داری بنا دیا ہے۔ لوگوں کو گھر کے کاموں کے لیے مایوسیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہولے آتے ہیں بغیر تنخواہ بغیر چھٹی کی ملازمہ، بچو میں گھنٹے کی مفت سروس۔“

شیمہ پچھلے دو ہفتوں سے بھری ہوئی تھی، آج پھٹ پڑی۔ بے نقط طارق کو سنا دیں۔ وہ جیسے شاگ کے عالم میں چند لمحے اسے دیکھا رہا پھر یکایک اس کے چہرے کے نقوش تن گئے، رگیں پھوٹنے لگیں، غصے سے سرخ چہرہ لیے وہ جس طرح پاؤں پٹختے ہوئے کمرے

سے نکلا تھا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ کس قدر غصے میں تھا۔

”ہونہ، میں ہی رہ گئی ہوں سب کے غصے اٹھانے کے لیے۔“ شیمہ نے ایک اونہ کر کے کمرے کی پیدلی اور پھر سے آنکھیں موند لیں، کتنی اچھی نیند آ رہی تھی۔

معاملہ تیا، تائی تک پہنچ گیا تھا۔ طارق نے باپ کو بتایا تھا کہ ان کی پسند کردہ ہو کیا خیالات رکھتا ہے۔

تیا تو غصے کے تیز تھے پھر بھی انہوں نے قلم کا کام لیا۔ ہو کو بھیجی سمجھ کر بڑی نرمی اور پیار سے ازدواجی اور سسرالی زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی، عمل اور برواشت کا درس دیا ان کا ایک گھنٹے کا لیکچر شیمہ نے بڑے صبر اور سکون سے سنا اور خاموش ہی رہی۔

تائی امی نے ساس کا کردار نبھایا، وہ فوراً اپنے باپ اور دیورانی تک اپنی شکایات پہنچا کر آئیں۔ ”جو ہو سے سو کر اٹھتی ہے، گھر کے کاموں میں دیکھتی نہیں لیتی۔ بس زبردستی جیسے بھگتا تی ہے آگے سے مجھے جواب بھی دے دیتی ہے، کبھی ساس کو، کبھی شوہر کو، دونوں میاں بیوی نے قلم سے ان کی شکایات سنیں اور خندہ پیشانی سے وعدہ کیا شیمہ کو سمجھانے کا۔ انہوں نے یہ وعدہ پورا بھی کیا اور دو گھنٹے کا لیکچر سن دیا۔ بیٹی نے جواب میں کچھ کہا تو نہیں، مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ ساری باتوں کا ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہی ہے۔“

”کیا بات ہے بڑے دنوں میں آئیں؟“
”بس یونہی گھر میں ذرا ٹینشن چل رہی تھی، دل ہی نہیں چاہا کہیں جانے کو۔“ کاٹن کے سالن سوٹ میں ملبوس ناہید کچھ تھکی تھکی سی بھی لگ رہی تھی اور پریشان بھی۔

”خیریت تو ہے نا؟“ ساحر نے فکر مندی سے لہ لہا۔

”ہاں اب تو خیریت ہی ہے۔“ ناہید کا جواب مبہم تھا۔

”میرا مطلب؟“
”بس چھوڑیں مطلب و مطلب کو، میرا معاملہ تھوڑی ہے، جس کا معاملہ ہے وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”بہب تمہارا معاملہ نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو؟“

”اے بی، دل غ خراب ہے نا میرا۔“ وہ جھنجھلائی۔
”وہ شیمہ علم ہو گیا اس بات کا؟“ ساحر نے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”شیمہ اور طارق دونوں نے پریشان کر کے رکھ دیا ہے سب کو۔“ ناہید نے ان کے مذاق کا خاطر خواہ نوٹس نہ لیتے ہوئے بالآخر اصل بات اگل ہی دی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی بھی اہم معاملہ ساحر سے دسکس نہ کرتی۔

”ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

”بچوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ وہ بھی فضول باتوں پر، تائی امی شکایتیں لے لے کر اوپر آتی رہتی ہیں امی ابو کے پاس۔“

”ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے تو جھگڑے بھی کم ہو جائیں گے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو بہت زیادہ اخلت سے بھی معاملات بگڑ جاتے ہیں۔“ ساحر نے ذرا اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”ایک ہی گھر میں بچپن سے رہ رہے ہیں اور اب شادی کے بعد یوں بی ہو کر رہے ہیں جیسے پہلی بار ایک دوسرے سے ملے ہیں، میری تو سمجھ سے باہر ہے تو کبھی۔“ ناہید کا منہ بنا ہوا تھا۔

”گزنز کی حیثیت سے ایک ہی گھر میں رہنا اور بات ہے اور میاں بیوی کے رشتے سے رہنا اور بات، رشتہ کوئی سا بھی ہو، گزنز کا دوستی کا یا محبت کا ان رشتوں میں بہت سی باتیں انسان برواشت بھی کر لیتا ہے، نظر

انداز بھی، میاں بیوی کا رشتہ بالکل الگ نوعیت کا ہوتا ہے، برواشت کرنا، نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا، پھر جب دونوں فریق ہی ایک جیسے مل جائیں تو گاڑی آگے چلنا مشکل ہو جاتی ہے، مگر تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ ساحر نے رساں سے سمجھایا۔
”نہ بھی ہوں، میری بلا سے مجھے کیا۔“ ناہید کی فطری تنگ مزاجی عود کر آئی۔

”اچھا خیر چھوڑو تم نے پڑھا، تمہارے پچھلے ناول پہ اس بار بہت تنقید آئی ہے۔“

”جی، آپ کے تودل کی مراد پوری ہو گئی، جو کام آپ اکثر کرتے رہتے ہیں وہ قارئین نے کر دیا۔“ ”کچھ غلط بھی نہیں کہا پڑھنے والوں نے تمہارے کردار بھی تو کتنے غیر معمولی ہیں، کوئی صرف اچھائیوں کا پیکر ہے، کوئی فقط برائیوں کا مجموعہ، تمہارے بعض کردار تو سیدھے آسمان سے اترے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“ ساحر کا تجزیہ بے لاگ تھا۔

”زندگی بہت تلخ ہے، فلموں، ڈراموں اور کہانیوں کی دنیا میں ہم جاتے ہیں تو تھوڑی سی فینٹسی تھوڑی سی آسودگی چاہتے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ میرا قاری میری تحریر پڑھ کر اٹھے تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں کوئی خواب ہو نہ کہ دل پہ ایک بوجھ۔“ ناہید نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

”مگر اب تو تمہارے قارئین بھی تمہاری اس ”تھیوری“ پہ بہت تنقید کرنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار ”فینٹسی“ کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔“ انہوں نے چڑایا۔

”تنقید کرنے میں کیا ہے؟ دنیا کا سب سے آسان کام، اے لوگوں سے اگر کہیں ناکہ کاغذ، قلم پکڑ کر کوئی کہانی لکھیں، چھوٹی سی ہی سہی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگیں۔“ ناہید کا ضبط بس اب جواب دینے لگا تھا۔

”ارے ہاں چھوٹی کہانیوں سے یاد آیا میرے پاس اوہنری کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے، میری اسٹوڈنٹ

دے گئی تھی، اپنے لبا کی لائبریری سے نکال کر لائی ہے تمہارے لیے سنبھال کر رکھی ہے لے جانا۔
”آپ کے اسٹوڈنٹس بھی آپ کے ہم ذوق ہیں۔“

”سارے نہیں، فقط دو چار ہیں ہم ذوق بھی ہم مزاج بھی۔“

”جنیوں کے ہجوم میں ایک دو شناسا چہرے بھی دل کو تقویت پہنچاتے ہیں۔“ ناہید نے فلسفہ بیان کیا۔
”بھئی ہمیں تو اجنبیوں سے کوئی خاص پر خاش نہیں ہے، ایک مسکراہٹ اوہرے یا اوہرے پھر ساری اجنبیت دور۔“

”بھئی کبھی بہت قریب کے لوگ بھی اجنبی سے بہت دور سے لگتے ہیں نا۔“

”لگنے میں اور ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ بس ساری بات فیلنگز کی ہے، ویسے کبھی کبھی انسان کو خود اپنا آپ بھی اجنبی لگتا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولے۔
”لامیں اوہری کی کتاب دے دیں مجھے میں اب چلتی ہوں۔“

ناہید اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی، پتا نہیں کیوں بیٹھے بیٹھے یا کچھ کرتے کرتے اک دم ہی اس کا دل اچٹ ہو جاتا، ابھی بھی یہی ہوا۔

کل تین مہمان آئے تھے لڑکے کی والدہ، بڑی بہن اور سب سے بڑی بہن، بہن بہن کو ہی ایک ساتھ مہمان خصوصی کا پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ ان کے سامنے میز پر اشیائے خورد و نوش سجی ہوئی تھیں۔ ناہید کی لاکھ مخالف اور ناراضی کے باوجود بھی ای نے میز بھرنے کا انتظام کر لیا تھا، وہی بھلے، فروٹ چاٹ، کباب، مسوسے، گلاب جامن، نمکوں۔

آنے والی خواتین نے ای کا دل نہیں توڑا تھا، وہ ان کے اہتمام و انتظام سے خوب انصاف کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ناہید سے انٹرویو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جو اتنا طویل ہو رہا تھا کہ بے زاری، ناہید کے چہرے سے

ہی نہیں لہجے سے چھلکنے لگی تھی۔
”سنا ہے آپ کہانیاں بھی لکھتی ہیں؟“ انٹرویو کا دو سراسر شروع ہوا۔

”جی۔“
”کسے لکھ لیتی ہیں؟“
”قلم سے۔“

”نہیں، میرا مطلب ہے، بھی بڑا دلچسپ ہے۔“
بڑی بہن ایک لمحے کو رکیں۔ ”کہانیوں میں تو عشق و محبت کی باتیں بھی ہوتی ہیں ہے نا؟“
انہوں نے تصدیق چاہی۔ ناہید چپ رہی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چائے کا کپ اٹھا کر ان کے سر پر دے مارے۔

”اپنی طرف سے گھر گھر کے عشقیہ ڈانڈا لگ لکھنے میں بڑی محنت ہوتی ہوگی؟“

”اپنی طرف سے گھڑنے کی کیا ضرورت ہے، میرے پاس بہت تجربہ ہے۔ ایک سو ایک محبتیں کر چکی ہوں اب تک۔“ ناہید کے ضبط نے جواب دے دیا تھا اور اب وہ خود آپے سے باہر تھی۔

سب حق ذوق اسے دیکھ رہے تھے لڑکے کی والدہ نے دانٹوں میں انگلی دبالی۔
”آہ۔ ہائے۔ اتنی بد زبان۔“

”میں بد زبان ہی نہیں، بد لحاظ بھی ہوں، اپنی خیریت چاہیے تو فوراً“ سے پشتر یہاں سے روانہ ہو جائیں آپ لوگ۔“ ناہید تن فن کرتی اندر چلی گئی۔ ای کا وہ حال کہ کانٹو بدن میں اسی نہیں۔ دادی کی پیشانی بھی عرق آلود۔ مہمان خواتین میں سے ایک نے ہاتھ میں پکڑا آدھا مسوسہ واپس پلیٹ میں رکھا۔ دوسری نے چائے کا کپ واپس میز پر رکھا اور تینوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غیر متوقع طور پر وہ بغیر کسی غصے اور بصرے کے تیزی کے ساتھ بیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔

”یہ کیا ہے ہوگی کبھی مہمانوں سے بھی بات کرنے کی تمیز کھودی۔ بڑھ لکھ کر بھاڑ جھونکا اور کیا کیا۔“ دادی نے مہمانوں کی رخصتی کے فوراً بعد پوٹی کو آڑے ہاتھ لیا۔ ”رشتے کے لیے آئی تھیں۔ ایسے

مہمانوں سے تو اور بھی سنبھل کر بات کرنی پڑتی ہے۔“
”جی، دیر تک سنبھل کر ہی بات کر رہی تھی میں، ان کے سوالات نے تھے آپ نے؟ کون سے کلج سے پڑھا ہے، ویمن یا کوانٹو کیشن، دو سال یونیورسٹی میں پڑھا، وہاں تو لڑکے بھی ہوتے ہیں یونیورسٹی کا ماحول تو بہت خراب ہوتا ہے اور پھر کہانیاں لکھنا؟ عشق و محبت کی باتیں ہوتی ہیں اس میں، آئندہ کسی کو بلانے سے پہلے تھوڑی چھان بین کروالیا کریں کہ وہ لوگ ذاتی طور پر بیمار تو نہیں ہیں۔“ ناہید کی زبان کے آگے کون فہر سکتا تھا۔ دادی کانٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئیں۔

کتنی دیر سے وہ اپنی بلیو شرٹ تلاش کر رہا تھا، مگر ہنوز ناکامی کا منہ دکھنا پڑ رہا تھا۔ ایک تو سارے کپڑے بغیر استری کے اٹے سیدھے گول مول حالت میں الماری میں پڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کے سر اور پروازت کی حد ختم ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، وہ دھاڑا۔“
”کیا آفت آئی؟“ وہ کچن میں روٹی پکا رہی تھی، طارق کی دھاڑ سن کر جھٹکی ہوئی آئی۔
”میری بلیو شرٹ کہاں ہے؟“
”اسی میں ہوگی۔“

”نہیں ہے، اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، مجھے تو ملی نہیں، اب تم دیکھ لو، کپڑے ہی ماشاء اللہ ایسے رکھے ہوئے ہیں کہ دو گھنٹے ڈھونڈنے پر بھی مطلوبہ چیز نہ ملے اور تم سارا دن کرتی کیا رہتی ہو، استری تو تم سے ہوتی نہیں، کم از کم تمہارے ہی رکھ دیا کرو کپڑوں کو، تاکہ نکلنے میں تو آسانی ہو، استری تو خیر مجھے خود ہی کرنی ہے۔“ طارق طنز لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”فادرغ نہیں بیٹھی رہتی سارا دن تمہاری امی کی طرح، اکیلی سارے کام کرتی ہوں۔ انسان ہوں، تھک جاتی ہوں جب فرصت ملے گی الماری تھیک کر دوں

گی۔“ شیمینہ ناخن پر سے آٹا چھڑاتے ہوئے بولی۔
”میرے کاموں کے لیے تو کبھی ٹائم ملے گا ہی نہیں تمہیں۔“

طارق نے پھر طنز سے کہا۔ وہ فطرتاً ”نفاست پسند تھا“ بے ترتیبی اور بدسلوکی سے اسے چڑھ گئی اور شادی کے بعد اس کا بیڈ روم اور الماری ہر وقت بکھرے ہی رہتے۔ شیمینہ نہ جانے سارا دن گھر کے کون سے کاموں میں مصروف رہتی تھی کہ اپنے اور شوہر کے ذاتی کاموں میں منظر میں چلے جاتے۔ طارق کی جان جل کر رہ جاتی تھی۔

”کیوں تمہارے کام میں نہیں کرتی تو اور کون کرتا ہے؟ بڑے احسان فراموش ہو۔ سارا دن میں اپنی جان کھپاتی رہتی ہوں، ذرا سی کوئی کمی رہ جائے تو طعنے دینے لگتے ہو، آخر ہونا اپنے ماں باپ کی اولاد، جیسی ان کی زبان میں ویسی تمہاری ہے۔“ شیمینہ تڑخ کر بولی۔

”ہم سب کی زبان میں ملا کر بھی تم سے کم ہی ہیں تم تو اپنی بہن سے بھی چار ہاتھ آگے ہو، شادی سے پہلے تو بڑی بھگی بلی بنی رہتی تھیں، بے زبان بے چاری۔“ طارق نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

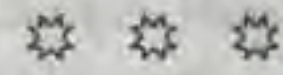
”کسی کی خوشامد نہیں کی تھی میں نے شادی کے لیے۔“ شیمینہ نے الماری کے کھلے خانے سے اس کی نیلی شرٹ برآمد کی۔ ”یہ رہی تمہاری شرٹ۔“
”بٹن لگا دیا تھا اس کا؟“ طارق کی یادداشت شیمینہ کے مقابلے میں تیز تھی۔

”نہیں۔ رکھ دو، ابھی روٹی پکا کر لگا دوں گی۔“
”بتایا بھی تھا ضروری کام سے جانا ہے، ویسے ہی اتنا لیٹ ہو چکا ہوں۔“ طارق شرٹ اٹھا کر دروازے کی طرف لپکا۔
”اب کیا ایک بٹن لگوانے درزی کے پاس جا رہے ہو؟“

”درزی کے پاس کیوں تمہاری بہن سے لگواؤں گا۔ ذمہ دار تو وہی ہے، نہ وہ انکار کرتی نہ یہ عذاب میرے گلے پڑتا۔“ طارق تو غصے میں بولتا ہوا باہر نکل گیا اور شیمینہ سن ہوتے دلخ کے ساتھ وہیں کھڑی کی

کھڑی رہ گئی۔

”نہ وہ انکار کرتی نہ یہ عذاب میرے گلے بڑا۔“
بار بار یہی بازگشت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔



بڑی پھپھو نے اپنے لائق سپوت کے لیے ناہید کا ہاتھ مانگا تھا۔ بڑی غیر متوقع خبر تھی۔ سب لوگ تو حیران تھے ہی، خود ناہید بھی پہلے حیران پھر پریشان ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بڑی پھپھو نے اس کی ستر گز لمبی زبان پر ہمیشہ اعتراض کیا تھا۔

یہ بھی طے تھا کہ اس سارے معاملے میں ان کے فرزند ارجمند کا بھی کوئی عمل دخل نہیں تھا کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے رشتہ بھیجا ہو۔ یہ تو سراسر پھپھو کا اپنا فیصلہ تھا۔

”جیسی بھی ہے جتنی ہے“ میرا خون ہے اپنوں کو ہم نہیں پوچھیں گے تو اور کون پوچھے گا۔“ انہوں نے بھائی بھانج کے سامنے بانگ دال تبصرہ کیا۔

ناہید کی سوئی تو ”جیسی بھی ہے“ پر اٹک رہی تھی، بڑی مشکل سے اس نے خود کو مدخلت سے باز رکھا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے ضرور پوچھے کہ ”جیسی بھی ہے“ سے کیا مراد ہے؟

بہر حال وہ رشتہ ڈال کر چلی گئیں کہ بھائی بھانج نے رسمی طور پر ایک ہفتے کا ٹائم تو مانگا تھا جواب کے لیے ”جھے کیا

سو جھی حمزہ کے لیے ناہید کو لینے کی۔ گز بھر کی لمبی زبان ہے اپنی بھانجیاں نظر نہیں آئیں جھے۔“

”عمو کی بیٹیاں کون سی نیک بیویں ہیں۔ ہیں تو میری بھانجیاں۔ مگر سچ کہوں تو ان کی زبانیں اور مزاج کون سے کم ہیں۔ ناہید کو مانگا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی مانگا ہے۔“ پھوپھی کا لہجہ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

”کیا سوچا، کیا سمجھا، ہمیں بھی تو کچھ پتا چلے۔ آخر تو اس فتنی کے پیچھے کیوں دیوانی ہو رہی ہے۔“ داوی نے طنزیہ انداز اپنایا۔

”دیوانی کی بات نہیں اماں۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ دو سو میں لا چکی ہوں۔ زبان دراز تو وہ بھی ہیں۔ ان کے خرے اور خرچے ساتھ رہیں تو جنجال الگ کروں تو بھی مصیبت احمد کے لیے میں نے سوچ رکھا تھا کہ کوئی ملازمت پیشہ لڑکی دیکھوں گی۔ اب ناہید تو پھر بھی لاکھ درجے بہتر ہے۔ گھر بیٹھے آگاہی ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اپنی کمائی کسی پہ خرچ کرے نہ کہ اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر تو کر ہی لے گی۔“

پھپھو بڑی دور کی کوڑی لائی تھیں۔ داوی نے کھولے حیرت سے بیٹی کو تک رہی تھیں۔

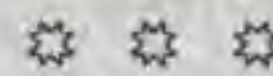
”اوہ تو یہ بات تھی؟“ اسٹور میں موجود ناہید کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ چمکی۔ وہ پھپھو کی آمد کے کچھ دیر بعد یہاں آئی تھی۔ ماکہ داوی اور پھپھو کی باتیں سن سکے۔

”ویسے دماغ تو آپ کا بھی خوب چلتا ہے پھپھو! اس نے دل ہی دل میں انہیں داوی اور ماں سے رات میں بات کی۔ انہیں پوری بات بتا کر اس نے اپنا فیصلہ سنا ڈالا۔

”یہ کون سی ایسی خاص بات ہے۔ انہیں خود تو کوئی لالچ نہیں ہے نا تمہاری کمائی کا۔ رہی بات شوہر اور اولاد پہ خرچ کرنے کی تو اس میں کیا حرج ہے؟“ اسی نے بڑی سادگی اور آرام سے اس کے انکار کو رد کیا۔

”آپ کے لیے خاص بات نہیں ہوگی۔ مگر میرے لیے تو ہے۔“ ہلے طارق کو منع کر دیا۔ اب اس میں بھی کیڑے نکل گئے۔ شادی نہیں کرنی ہے کیا؟

”کرنی ہے شادی کرنی ہے سودے بازی نہیں۔“ ناہید کے لہجے میں قطعیت تھی۔ جو اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر اٹل ہے۔



ثمنینہ اپنی قیص کاٹ رہی تھی۔ ناہید بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ امی بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

”تم نے پھپھو کو کیوں منع کر دیا۔ اچھے بھلے تو ہیں حمزہ بھائی۔“ ثمنینہ نے انجان بن کر ناہید کو کریدا۔

”جہیں نہیں معلوم“ میں نے کیوں منع کیا تھا۔ امی نے ساری رام کمائی سنائی تو تھی تمہیں۔“ ناہید نے جھکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”سنائی تو تھی کمائی مگر سمجھ میں نہیں آئی۔ معمولی سی بات کو جواز بنا کر جھٹ سے منع کر دیتا۔ مجھے تو حیرت ہو رہی تھی۔“ ناہید نے کندھے اچکائے۔ لہجہ میں طنز کی پھوار تھی جو ناہید کو فوراً ہی محسوس ہو گئی۔

”یہ معمولی بات نہیں تھی۔ کم از کم میرے لیے۔“ ناہید نے ایک ایک لفظ زور دے کر کہا۔

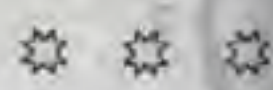
”اور طارق کو انکار کرنے کا کیا جواز تھا تمہارے پاس؟“ ثمنینہ کی نظریں ہی نہیں لہجہ بھی چبھتا ہوا تھا۔

ناہید کا سبزی بنا تا ہاتھ اک دم ہی تھما تھا۔ امی نے بھی دونوں کو باری باری بے بسی سے دیکھا۔

”ہمارا ایک ساتھ گزارا نہیں ہوتا۔ لڑائی جھگڑے ہوتے۔“ ناہید نے اگلے ہی بل خود کو سنبھال کر اپنے نظریں اٹھا کر کے ساتھ جواب دیا۔

”لڑائی جھگڑے تو اب بھی ہوتے ہیں۔“ ”تمہارا شوہر ہے تمہاری لائف ہے۔ تمہیں خود ہی سنٹل کرنا چاہیے۔“ ناہید نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

”نہ شوہر میرا ہے۔ نہ لائف میری ہے۔ ہم تو کسی اور کی زندگی جی رہے ہیں اور دوسروں کے غلط فیصلوں کا ٹاؤن بھر رہے ہیں۔“ ثمنینہ زہر آلود لہجے میں پھنکار رہی تھی۔ امی کا چہرہ لپٹ تھا اس کی باتیں سن کر۔ ناہید نے غلاف تو فحش خاموشی سے لب بچھینچ لیے۔ مگر اس کا چہرہ کوئی دے رہا تھا کہ وہ ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی ہے۔



کتنے دن گزر گئے تھے وہ ساحر کے پاس نہیں جاسکی تھی۔ کبھی موڈ نہیں ہوا، کبھی فرصت نہیں ملی۔

”کمال ہو؟“ ساحر کا میسج ملا۔

”ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔“ ناہید نے جواب لکھا۔

”ہاں تو میں بھی ہوں پھر کیا خیال ہے؟“ ”بے خبری بھی ایک نعمت ہے۔ بہت زیادہ جانتا بھی بعض اوقات مشکلات کا سبب بن جاتا ہے۔“

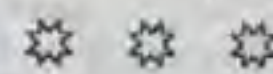
”خوب صورت لڑکیاں فلسفہ بگھارتے وقت بالکل ایسی لگتی ہیں جیسے آم کے درخت پر کریلے لنگ رہے ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ آپ نے مجھے خوب صورت کہا؟“

”میں نے تمہارے فلسفے کو کرٹا کہا ہے۔“

”بس۔ اب تو میری بولتی بند ہو گئی ہے۔ کل آؤں گی پھر بات کریں گے۔“

ناہید نے جوابی پیغام لکھ کر موبائل آف کر دیا۔



بات کوئی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ بس دونوں فریقین کی لمبی زبانوں نے معاملے کو بڑا کر دیا تھا۔

تائی امی نے بڑے شوق سے بیسن کی روٹی پکوائی تھی۔ بہونے مارے باندھے روٹی تو پکا دی۔ مگر چٹنی گرا سنڈر میں پیس کر ان کے آگے کھانا رکھ دیا۔

گرا سنڈر کی پسلی پانی سی چٹنی، لال مرچ کے بیج، زہرے اور لہسن کے چھوٹے چھوٹے سے ٹکڑے، چٹنی کے پانی میں غوطہ لگا رہے تھے۔ پھر اس میں بگھار بھی نہ تھا۔

”یہ چٹنی ہے؟“ وہ دیکھتے ہی چراغیا ہو گئیں۔ اس عمر میں بھی چٹنی کو فتنے اور کباب کا قیمہ رسل پرستی تھیں۔ شوہر اور بیٹے سب کے خروں کی وجہ سے اور بہو صاحبہ کو تو کسی کا کوئی لحاظ نہ تھا۔

ساس نے دو چار باتیں سنا دیں۔ گھڑاپے، سلیقے اور پھرتی سے کام کرنے، بہونے آگے بڑھ بڑھ کے وہ

جواب دیے کہ الامان و الحفیظ بڑے زوروں کا معرکہ ہوا۔ ثمنینہ لڑ لڑا کر اوپر میکے چلی گئی۔ شام میں تائی امی نے شوہر اور بیٹے کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔

باپ سے پہلے بیٹے کا پارہ چڑھ گیا۔

”آپ نے ہی کہا تھا کہ وہ اپنی بہن سے الگ ہے۔ مختلف ہے۔ سیدھی سادھی بالوب، تمیز دار دیکھ لیں اب تمیز دار اور سیدھی سادھی ہو کو۔“

”ارے تو مجھے کیا پتا تھا ایسی چھپی رستم نکلتے گی۔ یہ تو ناہید سے بھی چار ہاتھ آگے نکلی۔ ذرا ذرا سے کام سے دم نکلتا ہے۔ غصہ ناک پہ اور جواب زبان کی نوک پہ دھرا رہتا ہے۔ بل بھر میں مزاج آسمان پہ پہنچ جاتا ہے۔ اب دیکھو ذرا میسر حیاں دھڑ دھڑ کرتی اوپر چلی گئی۔ یہ کوئی طور طریقے ہیں۔ ہوؤں کے۔“

”تائی کی سانس پھول گئی بولتے بولتے۔“

”جاتی ہے تو جائے۔ کوئی نہیں جائے گا یہاں سے۔“

اسے منانے اور خوشامدیں کرنے۔ ”طارق بھڑک اٹھا۔“

”اب شادی ہو گئی ہے تمہاری، جوش سے نہیں ہوش سے کام لو، نہ تمہارے اندر سنجیدگی و بروہاری آئی نہ تمہاری بیوی کے اندر۔“

باپ نے آزدگی سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ غصہ و ضرورت تھے۔ مگر وضع دار انسان تھے۔ ثمنہ کی وجہ سے اپنے بھائی، بھانج کو اپنے سامنے شرمندہ پاتے تو خود بھی شرمندگی کا شکار ہو جاتے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی کون سا کم تھا۔ غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا تھا۔ طنز کرنے اور طعنے دینے سے وہ بھی نہیں چوکتا تھا۔ ان دونوں کے آئے دن کے لڑائی جھگڑوں میں وہ بھی بہر حال کسی نہ کسی حد تک قصور وار تھا۔ مگر بس چونکہ معاشرے کا عمومی رویہ یہی ہے کہ مردوں سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے اور عورت کو ہی صبر برداشت اور تحمل کے اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ اس لیے طارق کو سمجھانے کے بجائے ہر کوئی ثمنہ کو ہی سمجھاتا رہتا تھا۔ ادھر امی بھی ثمنہ کو ہی سمجھا رہی تھیں۔

”تائی بھی ہیں۔ ساس بھی ہیں۔ بڑی ہیں تم سے۔ اتنے سارے رشتے ہیں۔ کچھ سخت کہہ دیں تو درگزر کر دیا کرو۔“

”بس میں ہی درگزر کرتی رہوں۔ کبھی تائی کی زبان کو، کبھی شوہر کی زبان کو، کبھی تیا ابو کو۔ میں کچھ بول

دون تو قیامت آجاتی ہے۔“ ثمنہ بھڑک اٹھی۔

”سسرال۔ سسرال ہوتی ہے۔ چاہے سسرال کی غلہ گھری کیوں نہ ہو۔ برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

تب ہی بنتے ہیں۔ ”امی آہستہ سے بولیں۔“

”مجھے نہیں بنانا گھر و رہا، جب گھر والا ہی میرا نہیں گھر بنا کر کیا کروں گی۔“ ثمنہ بے دھڑک بولی۔

”اری تو پھر جتا تو سہی، چاہتی کیا ہے؟“ دادی نے خشکیں نظروں سے اسے گھورا۔

”سکون اور صرف سکون، جو یہاں بھی ملنا مشکل ہے۔“ ثمنہ نے بروہاتے ہوئے منہ تک چادر تکی لی۔

شام میں تیا اوپر آکر اسے سمجھا بھجا کر اپنے ساتھ نیچے لے آئے۔ وہ اتنی مگر پھولے ہوئے منہ کے ساتھ۔ طارق کا رویہ اکھڑا کھڑا تھا۔ تائی کا موڈ البتہ کچھ بہتر تھا۔ تیا نے سمجھایا تھا یا دھمکایا تھا۔ بہر حال نارمل ہو کر ملیں اس سے۔

وہ کمرے میں آئی تو طارق ٹی وی کھولے بیٹھا تھا۔ چہرے پر تولفت کا بورڈ سجا ہوا تھا۔ اس نے بات چیت میں پہل کی نہ ثمنہ نے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔ ثمنہ موبائل پہ نیم لگا کر بیٹھ گئی۔ جب کھیل کھیل کر دل بھر گیا اور سر میں درد ہونے لگا۔ اس نے موبائل آف کیا اور کروٹ لے کر سو گئی۔ طارق کب سویا اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔

ناہید کے لیے رشتے کی تلاش کا کام ہنوز جاری تھا۔ دو چار بار مہمان آئے بھی۔ مگر بات نہیں بنی۔ بھی آنے والے منع کر دیتے۔ کبھی ناہید انکار کر دیتی۔ پھر اس نے ایک رشتے کو منع کیا جو سب کی نظر میں اچھا بھلا تھا۔ تو امی بھی چین بہ چین ہو گئیں۔ دادی نے خوب خبر لی۔ ابو ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے۔ مگر ثمنہ کڑے تیور لیے اس کے پاس آئی۔

”تم ہر رشتے سے انکار کیوں کر دیتی ہو؟“

”جو میرے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اسے منع ہی کروں گی۔ زبردستی کسی کو خود پہ کیوں مسلط کروں۔“

ناہید نے بڑے اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”کون پورا اترتا ہے تمہارے معیار پہ؟ طارق؟“

ناہید کھیلے لہجے میں بولی۔

”وہ اگر میرے معیار پہ پورا اترتا تو آج تمہاری جگہ میں ہوتی اس گھر میں تمہارے دلغ میں جو بھی خناس بھرا ہے اسے نکال کر پھینکو۔“

ناہید پہلے بھی ایک دو بار ثمنہ کے منہ سے طارق کے حوالے سے طعنہ سن چکی تھی اور آج اس کے ضبط کی حد ختم ہو گئی۔

”اسی بات کا تو افسوس ہے تمہیں اور وہ تمہارے ہی غم کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ اپنے بچ میں میری بیعت کیوں چڑھا دی تم دونوں نے۔“ ثمنہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔

”نہ مجھے کسی بات کا افسوس ہے اور نہ ہی طارق کسی غم کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ تمہارے آئے ان کے قصص و حقائق سے تنگ آکر میں نے بات کی تھی اس سے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر معاملے میں تمہارا لا پرواہ رویہ اور تمہاری بد تمیزی اسے غصہ دلاتی ہے۔ پھر تم میرے حوالے سے بھی اسے طعنہ دیتی ہو۔ طنز کرتی ہو، شک کرتی ہو اور تمہاری تسلی کے لیے بتاؤں کہ طارق سے شادی کا میرا کوئی ارادہ نہ پہلے تھا، نہ ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔“

ناہید غصے سے سرخ چہرے لیے اس کے سامنے سے گزرتی۔

”بھولی، مکار، دونوں کے دونوں مل کر میرے ساتھ ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔“ ثمنہ نے بے حد متفر سے اسے گھورا۔ اس کے دل میں شک کا پودا بڑھتے بڑھتے تھوڑے رشتہ بن رہا تھا۔

”امی ابو کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ساحر کا

پرو پوزل ناہید کے لیے آیا تھا۔ دیکھا بھالا لڑکا۔ دیکھے بھالے لوگ۔ پھر سب کی دانست میں یہ دونوں ایک دوسرے سے کافی باتوں بھی تھے۔ امی تو فوراً ہی ہاں کہنے کے موڈ میں تھیں۔ مگر ابو نے پھر بھی رسمی طور پر ناہید سے پوچھنے کے لیے دو تین روز کی مہلت مانگ لی۔ مگر بیٹی نے دو تین روز کیا۔ دو تین گھنٹے بھی سوچنے کی زحمت گورانہ کی۔ اگلے منٹ ہی ماں کو کورا جواب دے دیا۔

”ساحر کو انکار؟“ وہ بے یقینی سے بیٹی کو دیکھنے لگیں۔

”کیوں؟ ان میں ایسے کون سے سرخاب کے برنگے ہیں جو انہیں انکار نہیں کر سکتی؟“ ناہید نے تیوریاں چڑھائیں۔

”سب تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ۔“ امی نے بات ادھوری چھوڑی۔

”سمجھتے ہیں تو سمجھیں، میری بلا سے۔“ ناہید کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

”مگر تمہاری تو بڑی اچھی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔“ وہ ایک سے کورکیں۔ ”بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے ساحر سے۔“ انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

”دوستی یا انڈر اسٹینڈنگ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان سے شادی کر لوں۔ وہ میرے ہم ذوق ہیں۔ اچھا بولتے ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو میں مزہ آتا ہے۔ میرے ذہن کی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔“

ایک کمرے میں بیٹھ کر زندگی گزارنے والے شخص سے دو چار گھنٹے باتیں ہو سکتی ہیں۔ مگر اپنی پوری زندگی ایسے فرد کے ساتھ گزارنا میرے لیے ٹوٹا ممکن ہے۔ میں ایک نارمل شخص کے ساتھ نارمل لائف جینا چاہتی ہوں۔ ساحر بھالی میرے اس معیار پہ پورا نہیں اترتے۔“ ناہید نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

”مگر کچھ دیر کے لیے آسکو تو آجاؤ تم سے بات کرنی ہے۔“

”میں۔ تم سب کے لیے لائی تھی۔ اچھے خاصے ہیں، تم اور تائی بھی کھالوگی۔“ ناہید خلاف توقع ملاحت سے بولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”چائے کس نے بنائی ہے؟“ شینہ کی تفتیش کا رخ شوہر کی طرف مڑ گیا۔

”تم تو سو رہی تھیں۔ تمہاری بہن سے ہی بنوائی ہے۔“ اس کے تفتیشی انداز پر طارق کالب و لہجہ بھی طنز ہو گیا۔

”تمہاری بہن کیا ہوتا ہے۔ صرف میری بہن ہے وہ۔ تمہاری کیا کچھ اور لگتی ہے۔“ شینہ کا انداز مزید ٹیکھا ہوا۔

”میری کزن ہے اور دوست ہیں۔“

”ٹوکے، لڑکی میں دوستی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس رشتے کی آڑ میں لوگ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔“ شینہ زہر خند ہوئی۔

”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جسے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کسی آڑ کی ضرورت پڑے۔ مجھے جو کرنا ہو گا کھلے عام کروں گا۔ سب کے سامنے۔“ طارق نے ترنت جواب دیا۔

”ہاں تم مرد ہو، کر سکتے ہو سب کچھ، سرعام سب کے سامنے، مگر عورت کو تو اپنی نام نہاد عزت کا پردہ رکھنا ہوتا ہے نا دنیا کے سامنے۔“

”اس فالتو کو اس کا مقصد کیا ہے؟“

”سچائی فالتو کو اس ہی لگتی ہے بعض لوگوں کو اور میری بکو اس کا مطلب تو تم خوب اچھی طرح سمجھتے ہو اور مقصد یہ ہے کہ میں اتنی بے خبر اور انجان نہیں ہوں جتنا کہ تم لوگ سمجھ رہے ہو۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنی گھٹیا ذہنیت رکھتی ہو تو کبھی اس رشتے کے بے ہامی نہیں بھرتا۔“ طارق چائے کا کپ سلیب پر چبھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہاں کھڑا دیکھ کر چونک گئی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو اس وقت؟“ ناہید کڑے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”کیوں؟“ ناہید اس پر دوبارہ نظر ڈالے بغیر کہہ کر پڑے پھیلائے لگی۔

”تم اپنی بہن کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔“ طارق نے بغیر کوئی تمہید باندھے اس سے سوال کیا۔

”مجھنے کی ضرورت تو تمہیں بھی ہے۔“ ناہید اسے اسے جتایا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے، میں کچھ سمجھتا نہیں ہوں یا جان بوجھ کر اپنی لائف ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ میں جتنی کوشش کرتا ہوں اس کے قریب ہونے کی اس شادی کو بھلانے کی وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتی ہے جس سے میری ساری کوششیں سارے جتن ملیا میل ہو جاتے ہیں۔ سچ کہوں، میں عاجز آ گیا ہوں سب سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔“ طارق بہت تھکا ہوا بے بس اور آداس لگ رہا تھا۔

”تمہارا قصور ہے سارا، تم سے کس نے کہا تھا کہ میرا نام لے کر اسے کچھ جتاؤ۔ مجھے سچ میں لائے بغیر بھی تم اپنے غصے کا اظہار کر سکتے تھے اب اس کے دل میں ہم دونوں کے لیے شک بیٹھ گیا ہے، تمہیں ہی محبت اور تحمل سے کام لے کر اس شک کو دور کرنا ہے۔“ ناہید کپڑے پھیلاتے ہوئے اسے اب نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

”میں نے تو یونہی صرف ایک بار غصے میں ایک بات کی تھی وہ اس بات کو پکڑ کر بیٹھ گئی اور اب تک اس چنگاری کو ہوا دے دے کر شعلہ بنا دیا ہے اس نے۔“

”اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں ذرا ہوش کے ناخن لو، ایسا نہ ہو کہ اس کی لپیٹ میں تمہارا گھر اور زندگی دونوں آجائے۔“

”تمہیں اب بھی میرا خیال ہے؟ احساس ہے؟“ طارق یک دم اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے نرم اور پر اثر

لہجہ اس کی کہانی بولتی تھی۔

”کیوں نہیں ہو گا مجھے تمہارا خیال، کوئی دشمنی تو ڈال ہے تم سے آخر تم میری۔“

ناہید کا وہ قہر مند میں رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آخر تم میری بہن کے شوہر ہو۔

شینہ جانے کب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی خبری نہ ہوئی وہ ایسی شعلہ یار نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی جس میں نفرت تھی اور ذلت و حقارت بھی۔

”ہاں ہاں بات پوری کرو اپنی، تمہیں اب بھی اس کا خیال ہے؟ تمہاری پسلی اور آخری محبت جو ہے ہے۔“

”وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئی۔“

”کھیل کب سے تم دونوں کھیل رہے ہو۔ سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ تم تو ڈائن سے بھی بدتر لگتے۔ اپنی سگی بہن کو ہی نہیں چھوڑا۔ تم لوگ چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتے ہو۔ محبت کی باتیں کرتے ہو، شرم نہیں آتی تم لوگوں کو، میرے ساتھ ساتھ اور کتنے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو تم دونوں بندوں سے شرم نہیں آتی تو کیا خدا سے بھی شرم ہو گئے، اللہ سے تو تھوڑی حیا کر لیتے۔“ وہ

بہن کی طرح زور زور سے چیخ رہی تھی۔

طارق اور ناہید اس اچانک افتاد پر یکدم جیسے پتھر کے بت بن گئے تھے۔

”پانگل تو نہیں ہو گئی ہو تم، دماغ ٹھیک ہے تمہارا کچھ ہوش بھی ہے یہ کیا بکو اس کیے جا رہی ہو؟“

ناہید کے پتھر و جوہر میں ہی حرکت ہوئی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ایک زوردار پھینک شینہ کے منہ پر مارے۔

وقت اور شرم کے مارے اس کا برا حال تھا۔ گھر سے گھر لے ہوئے تھے اور چھتوں سے چھتیں، شام کا وقت تھا ویسے ہی اکثر لوگ اپنی اپنی چھتوں پر موجود تھے ارد گرد کی منڈیروں سے لوگوں کے سر ظلوں ہونا شروع ہو گئے۔

”ارے میں لٹ گئی، بریاد ہو گئی، میری سگی بہن نے مجھے لوٹ لیا، میرے شوہر نے مجھے دو کوڑی کا کروا، دونوں نے مل کر میرا جنازہ تیار کر دیا، مجھے کہیں کانہ چھوڑا۔“

”چپ ہوتی ہے یا لگاؤں ایک۔“ طارق اس کے قریب کھڑا ہوا۔

”چل، نیچے چل۔“ اس نے شینہ کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔

”کیوں؟ میں نیچے چلی جاؤں اور یہاں تم دونوں کو اکیلا چھوڑ دوں رنگ رلیاں منانے کے لیے۔“

”ارے کیا ہوا؟ یہ شور شرابا کون کر رہا ہے اوپر۔“

ای اور راوی ہانپتی کا پتی اور آ رہی تھیں۔ نیچے سے تائی بھی زور زور سے آواز لگا رہی تھیں۔ شینہ کے چیخنے کی آواز نیچے تک پہنچ رہی تھی۔

”بکو اس بند کر اور نیچے چل۔“ طارق نے اس کا بازو دبوچا اور سیڑھیوں کی طرف دھکیلنے لگا۔

”دور ہو، ہاتھ مت لگاؤ مجھے، ناپاک، غلیظ انسان۔“

شینہ نے پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے ایک زور دار جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا، طارق اس اچانک جھٹکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ لڑھک کر سیڑھی نیچے جا گرا۔

”کیا کر رہے ہو تم لوگ؟“ ناہید غیر ارادی طور پر آگے بڑھی، ذلت اور بے بسی کے احساس نے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر دی تھیں۔

”تیری یہ مجال، یہ ہمت تو نہ۔“ طارق تیر کی طرح اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

”ساری دنیا کو بتاؤں گی تم دونوں کے کرتوت۔“ شینہ نے اس کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھوکا۔

گی۔
”آخری بار پوچھ رہا ہوں تو یہ تماشا بند کرے گی یا نہیں؟“ طارق نے غیر متوقع طور پر خود پر قابو پا کر بہت غصے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔
”میں نہیں تم دونوں کر رہے ہو تم بند کرو یہ تماشا۔“ شمیمہ زہر خند ہوئی۔

”چل تو پھر میں ہی یہ تماشا ختم کر دیتا ہوں آج۔“ طارق نے اسی غصے ہوئے لہجے میں بولتے ہوئے آگے وہ الفاظ بولے جنہیں سن کر عرش بھی کانپ جاتا ہے پل بھر میں اس کی بیوی اس کے لیے پرانی ہو گئی تھی۔

قریب قریب اوپر پہنچتی داوی اور امی نے طارق کے منہ سے طلاق کے الفاظ سنے تو وہیں تیور کر میڑھیوں پر ہی گر پڑیں۔

طارق سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے نیچے اتر گیا۔ ناہید سیڑھی کی دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور جس پر اصل افتادہ لٹی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا نہ دکھ نہ خوشی نہ کچھ چھن جانے کی اذیت نہ من چاہی آزادی ملنے کا اطمینان کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے چہرے پر۔

طوفان آیا اور آکر گزر گیا، مگر اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی داستانیں چھوڑ گیا۔

کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا؟ ایسا کیا ہو گیا کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی؟ اپنے پرانے سب کے لبوں پہ ایک ہی سوال تھا۔ پھر لوگ خود ہی سوالات کے جوابات اخذ کرنے لگتے۔

”شک؟ شک ہوا تھا بیوی کو؟“
”کس پر؟ سگی بہن پر۔ ہا۔ ہائے“ لوگوں نے انگلیاں دانتوں میں دبائیں۔

ناہید کے ماں باپ نے دوسرا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اب ایک ہی گھر میں رہتا ہوں بھی مناسب نہ تھا پھر

آئے گئے کے سوالوں اور تفتیش سے بھی جان بھر گئی۔ داوی بھی بیٹے بہو کے ساتھ نئے گھر میں آ گئیں۔ زیادہ وقت چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔
اب بولتا ہی کون تھا سب کے سب جیسے بدوش ہوئے تھے، روئین کے کلمہ ہی تلی بات، زندگی پر عجیب و غریب چل نکلی تھی۔

ناہید خاموشی سے سر جھکائے، کانڈ سیاہ کرتی رہیں اور گھر کے روزمرہ کے کام شمیمہ زیادہ تر ایک کمرے میں اپنا ٹھکانا بنائے رہتی، بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتے اپنے برتن دھو کر رکھ دیتی، کبھی کبھار داوی کو یا ابو کو چائے بنا کر دے دی، اپنے کپڑے دھو لیے، چھوٹے بھائیوں کے چھوٹے موٹے کام کر لیے یا پھر کتابوں میں سروے کر بیٹھ جاتی، گھر میں ابھی تک اس سے کسی نے کوئی سوال جواب نہیں کیے تھے۔ طارق نے انہیں پہلے ہی الف سے لے کر یے تک ساری داستان سنا دی تھی۔ دونوں شریف طبع اور بھلے مانس انسان اپنے دکھ اپنے دل میں ہی دبائے سر جھکا کر رہ گئے کیا کہتے؟ کس سے کہتے؟

دوپہر کا وقت تھا شمیمہ کمرے میں سو رہی تھی ناہید نے داوی کو کھانا دیا۔

”کبھی دو گھڑی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کر ہر وقت قلم چلائی رہتی ہے۔“ داوی نے بڑے دنوں بعد اپنے مخصوص انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

”جی!“ وہ ایک گہری سانس لے کر ان کے پاس ٹک گئی۔

”تیری بہن نے برا تماشا کیا۔ اپنی بھی زندگی جہاد کی اور ساتھ ساتھ گھروالوں کی بھی۔ تیرے ماں باپ تو دونوں گائے ہیں۔ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے، کوئی اور ہوتا تو لڑکی کی ناک چھیا کٹ کر ہاتھ پہ دھرتا۔“ کوئی مہینوں کی خاموشی کے بعد داوی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

”شاید یہی نصیب میں لکھا تھا۔“
”ہاں“ چھٹی میں پانی ڈالو اور تقدیر کو ٹٹولو“ اپنے ہی کے کا پھل ہے جو اس کے آگے آیا ہے، اجڑ کے پڑا

کئی گھر میں اب کچے میں ٹھنڈ پڑ گئی یہاں کنواریوں کے رشتوں کے لانے پڑے ہوئے ہیں طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا۔

”سب کی ہو جاتی ہیں داوی، دیر سویر سے ہی سہی ایک دو کیا لوگوں کی تین تین شادیاں بھی ہو جاتی ہیں، زندگی ساری کی تیسری شادی نہیں ہوتی پچھلے سال۔“ ناہید نے انہیں تسلی دینے کو ایک مثال بھی دے دی۔

”شریفوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے بیٹی، ایک چھوڑ دوسرے کو پکڑ دوسرے کو چھوڑ تیسرے کو پکڑ شادی بیاہ نہ ہوا کھیل تماشا ہو گیا۔“ داوی نے اسے لتاڑا۔
”اب تو زندگیاں ہی کھیل تماشا بن گئی ہیں داوی تو شادی بیاہ گیا بیہیز ہے۔“ ناہید اٹھ کھڑی ہوئی۔
”پانی لے آؤں آپ کے لیے۔“

”ہاں مکے سے لانا مجھ سے نہیں پیا جاتا یہ فریق کا لہذا پانی۔“

ناہید نے ٹھیک ہی کہا تھا دوسری شادی بھی ہو ہی جاتی ہے یہ کوئی دنیا سے انوکھا نرا لایا ناممکن کام تو نہیں۔ ناہید کے رشتے کے لیے کو ششیں جاری تھیں، اوہر شمیمہ کے لیے ایک رشتہ آگیا اور رشتہ لانے والے کون؟ تایا ابو جو اس سارے واقعے میں اپنے بیٹے کو بھی برابر کا قصور وار سمجھتے تھے۔ بیٹے کے لیے اتنا پسندی اور تنگ مزاجی سے خوب واقف تھے۔ سچی سے زیادہ محبت انہیں اپنے بھائی سے تھی جو بے تصور ہوتے ہوئے بھی اتنے بڑے کرب سے گزر رہا تھا۔ عمران ان کے عزیز دوست کا بیٹا تھا۔ جدہ میں رہائش اور ملازمت تھی، تین بچے چھوڑ کر بیوی فوت ہو گئی تھی۔ تایا ابو کچھ بول بھی اس رشتے پہ زور دے رہے تھے کہ بیٹے کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیف اور بگاڑ کا ازالہ کرنا چاہتے تھے اور ابو امی نے یہ رشتہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بیٹی سب سے دراگ تھلگ تھی۔ شادی ہو کر دور جائے گی تو شاید

سب کے قریب ہو جائے۔
شمینہ کے پاس اب کوئی راستہ نہیں تھا طلاق یافتہ کا لیبل تو لگ ہی چکا تھا اس نے ہامی بھر لی ناہید نے بھی سکون کا سانس لیا دو ماہ بعد وہ رخصت ہو کر اپنی زندگی گھر گئی اور چھ ماہ بعد شوہر کے پاس جدہ چلی گئی۔ ڈیڑھ سال میں زندگی نے لوگوں نے کتنے رنگ بد لے تھے۔ شمیمہ نہیں یہ ڈیڑھ سال ہماری زندگی میں کیوں آیا؟ ناہید کبھی کبھی سوچتی۔

”کیسی ہو؟“ آج تقریباً دو سال بعد اس نے طارق کی آواز سنی تھی۔
”ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟“
”ٹھیک ہوں۔“

”تایا ابو اور امی؟“
”ہاں وہ بھی ٹھیک ہیں، پچھلے دنوں ابو کے معدے میں تکلیف ہو گئی تھی، اب تو اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔“

”ہاں پتا چلا تھا مجھے، ابو امی انہیں دیکھنے گئے تو تھے۔“

”تم کیوں نہیں آئیں؟“
”یو سبی نمون پہ ان سے خیریت معلوم کر لی تھی۔“
”جب سے یہاں سے گئی ہو ایک بار بھی پلٹ کر نہیں آئیں۔“ طارق نے شکوہ کیا۔

”ضروری تو نہیں ہے پلٹنا۔“
”کیا تم بھی مجھے ہی قصور وار سمجھتی ہو؟“
”اب کیا فائدہ اس قسم کی باتوں کا؟“
”مجھے فائدے نقصان سے کوئی مطلب نہیں، میں بس تمہاری رائے جانتا چاہتا ہوں کہ تم مجھے قصور وار سمجھتی ہو یا نہیں۔“ طارق کا وہی مخصوص ہٹ دھرم لہجہ لوٹ آیا۔

”میری رائے میں کسی حد تک قصور تمہارا بھی تھا۔“ ناہید نے دو ٹوک جواب دیا۔
”کیا قصور تھا میرا؟“ طارق نے ایک گہری سانس

”اسے شک ہوا تھا تم نے اس کے شک کو دور کرنے کے بجائے اپنی حرکتوں اور باتوں سے اور بڑھاوا دیا۔ تمہارے اس غیر سنجیدہ رویے نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔“

”تم جانتی ہو میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ میں اپنی بیوی سے چھپ کر نہ تو کسی سے فلرٹ کر رہا تھا نہ ہی عشق لڑا رہا تھا پھر میں کس بات کی وضاحت کرنا اس کے سامنے، کس معاملے کی صفائی پیش کرتا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ چونکہ تم اپنے معاملے میں فہم نہ تھے، سچے تھے اس لیے بڑی آسانی سے اس کا شک دور کر سکتے تھے سچ کو اپنی وضاحت کے لیے زیادہ ثبوتوں کی اور دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود ہی اپنے آپ کو منوالیتا ہے۔“

”جب آنکھوں پہ شک کی پٹی بندھ جائے تو نہ سچ نظر آتا ہے نہ سچائی۔“ طارق کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا۔

”اب چھوڑو یہ بے کار کے سوال جواب اس کی شادی ہو گئی ہے تمہاری بھی ہو جائے گی۔ ماضی کو دہرا کر کیا ملے گا۔“ ناہید نے بات ختم کرنی چاہی۔

”ٹھیک کہتی ہو ماضی کو دہرا کر کیا ملے گا۔“ طارق نے ہولے سے کہا۔

”اگر تم پر کہہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھ لو۔“ ناہید نے ایک گہری سانس لی۔

”تمہارا رشتہ طے ہونے جا رہا ہے؟“

”ہاں!“

”بھی فائل جواب تو نہیں دیا تا؟“ طارق کو مکمل معلومات تھیں۔

”نکل دیں گے۔“

”اگر میں تمہیں پروپوز کروں تو؟“

”جو جواب پہلے دیا تھا وہی اب بھی ہو گا۔“ ناہید نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”لوگوں سے ڈرتی ہو کہ شینہ کے الزامات سچ ہو جائیں گے؟“

”میں لوگوں سے نہیں ڈرتی میرا دل صاف ہے اور ہاتھ بھی۔“

”پھر انکار کی وجہ؟“

”ضروری نہیں تمہارے ہر سوال کا جواب میرے پاس ہو۔ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی میرا اتنا کمنا کافی نہیں؟“

”تم نے پہلے کی طرح آج بھی مجھے بہت مایوس کر دیا۔“ طارق کا لہجہ شکستہ تھا اور دل اس سے بھی زیادہ۔

”تمہیں کوئی اچھی بیوی مل جائے گی تو تمہاری ساری اداسی اور مایوسی دور ہو جائے گی۔ ضروری نہیں زندگی ہماری مرضی اور خواہش کے مطابق گزرے جو ہمارے پاس ہے ہماری دسترس میں ہے وہی ہمارا نصیب ہماری خوشی ہے باقی سب خواب و خیال ہے اور زندگی خواب خیال کے سہارے نہیں گزرتی۔ اچھا اللہ حافظ۔“ ناہید نے اپنی بات مکمل کر کے یکدم ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

”لفظوں کی کھلاڑی ہونا“ لفظوں سے ہی ملت دیتی ہو بندے کو۔“ دوسری طرف طارق کے لبوں پہ ایک مسکراہٹ آ گئی۔

نیا گھر، نئے لوگ، زندگی کا ایک نیا رخ، شروعات ہو چکی تھی ہفتہ دس دن کی نئی نویلی دلہن سے وہ اب تین ہفتے پرانی دلہن ہو چکی تھی۔ گھیر پکوائی کی رسم کل ہی ہوئی تھی آج اسے گھر کے کاموں کا چارج دے دیا گیا تھا خیر گھر میں افراد ہی کتنے تھے جو کام ہوتا۔ ساس، سر حیات نہیں تھے، ظہیر اور معجلہ دو ہی بہن بھائی تھے، معجلہ کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی، اچھی خوش مزاج لڑکی تھی، گھر میں بڑی خالہ رکھی ہوئی تھیں ایک ڈیڑھ مہینے سے۔ اب انہوں نے بھی بوریا بستر باندھ لیا تھا۔

”تو بھی ہو بیگم اب گھر اور گھر والا تمہارے حوالے۔“ انہوں نے چلتے وقت ناہید کے سر پر ہاتھ

پھیرا دیا تھا۔ دس سبجیلہ پہلے ہی جا چکی تھی باقی رشتے دار جو رکے ہوئے تھے دلہن کے بعد ہی چلے گئے تھے۔ گھر یکدم خالی خالی سا ہو گیا بہت سے لوگ

ناہید کی قسمت پر رشک بھی کر رہے تھے۔

”بڑی اچھی قسمت ہے بھی نہ سسرال کا جنجال، نہ سسرالیوں کا کھیرا، ایک میں ایک میرا بتا باقی سب روانہ۔“ یہ دادی کا بھروسہ تھا۔

”چلو اچھا ہے، تمہیں لکھنے کے لیے وقت مل جائے گا۔“ انی نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں خوشی کا اظہار کیا سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں۔

دو مہینے بعد دھیرے دھیرے نئی نئی شادی کا خمیر کم ہونے لگا تو ایک دوسرے کے مزاج اور عادات کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

ظہیر کے بارے میں ایک بات شروع میں ہی بہت اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ وہ بہت نفاست پسند تھا، معمولی سی شلن، معمولی سا دھبہ، گرد کا ایک ذرہ بھی اس کی طبع نازک پر گراں گزر تا تھا۔

”افہ!“ ناہید قدرت کی اس ستم ظریفی پہ کراہ

رہی تھی۔

وہ تو بس مارے ہاندھے صفائی ستھرائی کرتی اور جنہوں کو ٹھکانے سے رکھ دیتی۔ اس طریقے اور سلیقے کا اس میں فقدان تھا جو ظہیر کو مطلوب تھا۔ وہ خاصی حد تک لا رواد، غیر منظم اور بے ترتیب تھی اور ظہیر اس کے بالکل برعکس۔

”ناہید بی! وہ تو تمہاری خاطر خود کو بدلتے سے رہا، تمہیں ہی اپنی خراب عادتیں بدلنا پڑیں گی۔“ ناہید نے خود کو وارننگ دی۔

اس دن بھی ظہیر آفس سے آیا تو گھوم پھر کر گھر کا جنہوں کا جائزہ لیتا رہا۔

”تم نے ڈسٹنگ نہیں کی آج؟“

”کی تو تھی۔“ ناہید نے کچھ حیرت اور خفگی سے شوہر بلند کر کے جانب دیکھا جو بی سنوری بیوی کی طرف توجہ دینے کے بجائے ساز و سامان کی طرف متوجہ تھا۔

”کب کی تھی؟“

”صبح کی تھی۔“ ناہید نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”ایک ہی ٹائم صفائی کر کے فارغ ہو جاتی ہو؟“

”تو کیا تمہیں ٹائم صفائیاں کرتی رہوں، صبح دوپہر، شام۔“ ناہید کی فطری تنگ مزاجی عود آئی۔

”کیا حرج ہے۔“ ظہیر نے شانے اچکائے۔

”دیکھو نا، گھر تو تمہارا ہے تم صاف ستھرا رکھو گی اسے تو گھر آنے والے تمہاری ہی تعریف کریں گے، ورنہ تم جانتی ہو لوگوں کی زبانیں۔“

”میری بلا سے کوئی تعریف کرے یا تنقید مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”نکھر مجھے تو پڑتا ہے۔“ ظہیر نے غور سے اسے دیکھا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے تعریف کر دی۔

”شکریہ، گھر سے ہٹ کر آپ کی نظریں مجھ پر تو آئیں۔“ ناہید نے جلتے انداز میں کہا۔

”کیا کروں، پرانی عادت ہے میں گھر آتے ہی سب سے پہلے گھر کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہر شے اپنی جگہ ٹھکانے

پہ صاف ستھری ہو، معجلہ بھی نا گھر میں وہ پورا گھر آئینے کی طرح چمکائے رکھتی تھی، کیا کرے، کیا کچن،

باتھ روم، اسٹور، برآمدہ ہر کونا کھدیرا، صاف ستھرا۔ میرے مزاج اور عادت سے واقف تھی اس لیے کہیں

کوئی کمی نہیں چھوڑتی تھی۔“ ظہیر بہن کی تعریف میں رطب اللسان ہوا۔

”کہنے کو تو آپ شوہر ہیں مگر ساس کی کمی بھی پوری کر رہے ہیں۔“ ظہیر کی باتوں پہ جانے کیوں ناہید کی

جان جل کے رہ گئی۔

”ساس کی کمی؟ میں نے بھلا ایسا کیا کہا ہے تمہیں گھر صاف ستھرا رکھنے کو تو کہا ہے بس۔“ ظہیر کی

پیشانی شلن آلود ہو گئی۔ ناہید بھی منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

”ہو نہ، سارا دن ماسی بن کر گھر میں بٹھتے رہو۔“ وہ دیر تک غصے میں کھولتی رہی۔

طرح سلگ گئی۔

”شادی نہ ہوئی، کالے پانی کی سزا ہو گئی، ساری عادتیں چھوڑ دو، رشتے داروں کو چھوڑ دو، سہیلیوں کو چھوڑ دو، اپنے شوق، مشاغل، دلچسپیاں سب کچھ چھوڑ دو۔“ ناہید بے طرح شروع ہو گئی۔

”تمہیں اتنی جلدی، اتنا غصہ کیسے آجاتا ہے۔“ ظہیر بڑے اطمینان سے بولتا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے، غصہ نہیں آئے گا تو اور کیا آئے گا۔“

”سائیکلو جسٹس کہتے ہیں کہ بعض اوقات انسان اپنی کوئی چوری چھپانے اور دوسرے سے حاوی ہونے کے لیے خود کو بہت غصیلًا ظاہر کرتا ہے، مگر درحقیقت اس کا غصہ مصنوعی ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم اتنی نادان اور نا سمجھ تو نہیں ہو کہ میری واضح باتوں کا بھی مطلب پوچھو۔“ ظہیر ایک سٹین سی مسکراہٹ لیے وہاں سے اٹھ گیا اور ناہید اس کی بات پر غور ہی کرتی رہ گئی۔

اور ظہیر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، وہ اتنی نا سمجھ تو نہیں تھی غور کیا تو جانے کیا کیا کچھ اس پر عیاں ہونے لگا۔

جب سے شادی ہوئی تھی وہ ایک رات بھی اپنے گھر نہیں رک سکی تھی، ظہیر اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور ساتھ ہی واپس لے آتا۔ شروع کے دنوں میں تو یہ بات بڑی رومانٹک سی لگتی تھی جب وہ اپنی آنکھوں میں وارفتگی لیے اسے روکنا تھا۔

”میں کیسے رہوں گا تمہارے بغیر۔“

”پہلے کیسے رہتے تھے؟“ ناہید کی مسکان میں شرم بھی ہوتی اور ادا بھی۔

”پہلے کی بات اور تھی، اب تو تم سے دور رہنے کو دل نہیں مانتا۔“

”ایک دو دن کی تو بات ہے۔“

”تم ایک دو دن کی بات کرتی ہو؟ یہاں ایک دو گھنٹے کی دوری بھی سال برابر لگتی ہے، اچھا دیکھو میں تمہیں روزانہ گھر والوں سے ملانے لے جاؤں گا، پرامس۔“

”کیا بات ہے بھئی، شادی کر کے ہمیں بھول ہی گئیں، تین چار مہینے ہو گئے شادی کو تم نے کوئی ناول لکھا ہی نہیں اب تک، بس چھوٹی موٹی کہانیوں پر رخصتا رہی ہو۔“ اس کی سہیلی نورین بڑے شکستہ انداز میں اس سے مخاطب تھی۔

”ایک ناول شروع کیا ہوا ہے۔ بس مکمل ہونے والا ہے پھر بھیج دوں گی۔“ ناہید نے اسے جواب دیا۔

”بس جلدی سے مکمل کر کے بھجوا دو، ہم بھی تو دیکھیں شادی نے تمہارے قلم کو دو چار چاند لگائے یا نہیں۔“

”بات سنیں محترمہ! ہمارے ہاں شادی کے بعد اکثر خواتین قلم کاروں کے قلم کو گھن ہی لگتا ہے، چاند نہیں۔“ ناہید نے ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ایسا بھی ہوتا ہے، مگر تم تو خوش نصیب ہو، تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں، شوہر صاحب آفس روانہ، پیچھے تم اکیلی، سارا دن فارغ ہی رہتی ہو گی۔“

”فارغ؟“ ناہید نے آہ بھری۔ آدھے سے زیادہ دن تو گھر اور ساز و سامان کو صاف کرنے، دھونے اور چکانے میں لگ جاتا تھا یہ اور بات کہ ظہیر کی تسلی پھر بھی نہیں ہوتی تھی۔ نورین کو اب بھلا وہ کیا داستانیں سنائی ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے موبائل آف کر دیا۔

”کس کا فون تھا؟“ ظہیر سامنے ہی بیٹھا تھا۔

”سہیلی کا تھا۔“

”کون سی سہیلی؟“ اس کی جرح جاری تھی۔

”اب آپ کو کیا بتاؤں، کون سی سہیلی، آپ میری سہیلیوں کو جانتے ہیں کیا؟“ ناہید کبھی کبھار اس کے پے در پے سوالات سے بے زار ہو جاتی تھی۔

”اب شادی ہو گئی ہے، پہلے کے دوستانہ آہستہ آہستہ کم کرو۔“ ظہیر کی پھر ایک نصیحت، ناہید بری

وہ پیار محبت سے بہلا پھسلا کر کسی نہ کسی طرح اسے
میکے نہ رکھنے پر آمادہ کر رہی لیتا۔ بعد میں یہ رومانس
مجبوری میں ڈھل گیا۔

”مجھے ناشتا کون بنا کر دے گا؟ بازار کے کھانوں سے
میرے معدے میں تکلیف ہو جاتی ہے۔“

”پہلے بھی تو بناتے تھے۔“
”وہ تو مجبوری تھی، تم نہیں تھیں نا اب تمہارے
ہاتھوں کے ذائقے کی عادت پڑ گئی ہے۔ صبح صبح
تمہارے پیارے پیارے ہاتھوں سے بیڈی نہ پیوں تو
صبح ہی نہیں ہوتی۔“ مجبوری میں رومانس کا تڑکا بھی
لگ جاتا۔

ناہید کئی بار خفا بھی ہوئی مگر ظہیر نے اسے منالیا۔
ظہیر اسے میکے رکھنے کیوں نہیں دیتا تھا، ساتھ لے
جاتا، ساتھ واپس لے آتا، کیا بھی وجہ محبت یا مجبوری یا
کچھ اور۔ ناہید کا ذہن اب دوسری سچ پر سوچ رہا تھا۔
وہ کہیں فون کرتی یا اس کے فون آتے تو سوال
جواب کا ایک سلسلہ، وہ جواب دیتے دیتے تنگ آ جاتی،
مگر ظہیر سوال کرتے کرتے نہ تھکتا تھا۔

ظہیر اکثر اس کا موبائل لے کر بیٹھ جاتا تھا۔
”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ حیران ہوتی۔

”چیک کر رہا ہوں، میرے علاوہ اور کون میری
پیاری بیوی کو پیار بھرے میسج بھیجتا ہے۔“ ظہیر
شیخی کی سے بولتا اور وہ ہنس پڑتی تھی۔

گھر کشادہ تھا، مگر اس میں ایسی کوئی کھڑکی، روزن،
دریچہ نہیں تھا جس سے باہر کا آسمان دیکھ سکتی، ہاں
البتہ دھوپ، ہوا، روشنی کے لیے بلندی پر چھت کے
قریب روشن دان بنے ہوئے تھے۔ بڑی سی چھت
تھی، میٹھیوں کے اختتام پر گرل کا دروازہ لگا ہوا تھا جو
مقفول رہتا تھا۔

”اس پاس کے گھروں کے ساتھ چھت ملی ہوئی
ہے، کسی کا کوئی بھروسہ نہیں پھر کوئی چور ڈاکو بھی کسی
کی چھت سے ہماری چھت پر آسکتے ہیں، نیچے آسکتے
ہیں، اس لیے یہ دروازہ عموماً لاکڈ رہتا ہے۔“ ظہیر
نے اسے بتایا تھا۔ ہاں رات میں ہوا کھلانے کے لیے وہ

ناہید کو اپنے ساتھ چھت پہ لے جاتا اور ساتھ ہیچرا
آتا۔

شادی کے اولین دنوں میں ہی ظہیر روزانہ اسے
ناکد کر کے جاتا۔

”گھٹ اندر سے لاک کر لیتا، پوچھے بغیر تصدیق کے
بغیر ہر گز گھٹ نہیں کھولتا، حالات بہت خراب ہیں،
محلے میں دن بھاڑے کئی ڈکیتیاں پڑ چکی ہیں۔“

ظہیر کے جانے کے بعد گھٹ دن بھر لاک ہی رہتا
شام میں اس کی آمد پر ہی کھلتا تھا۔ مہمان کم ہی آتے
تھے۔ سچہ لہجہ بھی آتی تو عموماً ”چھٹی کے دن۔“

ابھی تک ناہید کو علم بھی نہیں تھا کہ اس علاقے
میں بازار کہاں کہاں ہے، مہینے بھر کا سودا سلف ظہیر لے
آتا تھا۔ ہفتے بھر کا گوشت، سبزیاں، فرنیج میں موجود
رہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ناہید سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ کئی مہینوں
بعد اس کا نیا ناول شائع ہوا تھا۔

”ہاں بھی یہ ہے جو آپ کئی ہفتوں سے لکھ رہی
تھیں؟“ ظہیر نے ڈائجسٹ اٹھلایا۔

”ہاں، خدا خدا کر کے مکمل ہو ہی گیا۔“ ناہید غریہ
مسکرائی۔

اگلی رات ظہیر اس کے ناول پر تبصرہ کر رہا تھا۔
”تم نے بڑی گہرائی میں جا کر لکھا ہے، خصوصاً
محبت کے بارے میں۔“ اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ناہید

نے ٹھٹھک گئی۔
”محبت بڑا خوب صورت احساس ہے، ہے نا؟“

ایکایک مسکرایا۔
ناہید پلک جھپکے بنا اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جو

پل پل رنگ بدلتے میں ماہر تھا۔
”بتاؤ نا؟“ ناہید کی خاموشی پر ظہیر نے اصرار کیا۔

”کہتے تو یہی ہیں لوگ۔“ ناہید نے بے حد شیخی
سے جواب دیا۔

”تم کیا کہتی ہو؟“

”میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔“ ناہید کی
جیدگی پر قرار تھی۔

”مگر تمہارا لکھا ہوا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ محبت
کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔“

”چھٹا پھر؟“
”پھر یہ کہ اتنے خوب صورت احساس کو اتنی گہرائی

میں اور شدتوں کے ساتھ بیان کرنا آسان نہیں، اس
میں خالی مشاہدہ کام نہیں آتا، تجربہ بھی چاہیے۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کھل کر کہیں۔“ ناہید کی
شیخی میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے جس سے بھی
محبت کی، بڑی شدت کے ساتھ اور دل کی گہرائیوں
سے کی۔“ ظہیر کا لہجہ بہت پر سکون اور ہموار تھا، مگر

ناہید کے سر پر جیسے کوئی بم پھٹا تھا۔ اس کے وجود کے
پرچے اڑ رہے تھے۔

”میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔“ ناہید نے
اس کی بات کو ٹھٹھایا۔

”شادی کے بعد بھی نہیں؟“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ شادی کے بعد اپنے شوہر سے بھی
محبت نہیں کی؟“ ظہیر لفظوں کی مار ہی نہیں مارتا تھا
بلکہ لفظوں سے گھیرتا بھی تھا۔

”محبت اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں
ہوتی۔“ ناہید نے جتلیا۔

”ہم نے تو سنا ہے کہ کبھی ایک پل ہی کافی ہوتا
ہے۔“

”ہاں کبھی ایک پل بھی کافی ہو جاتا ہے اور کبھی
صدیاں بھی لگ جاتی ہیں۔“

”ویسے تم میرا سوال گول کر گئیں۔“
”گول سا سوال؟“

”محبت کے بارے میں کچھ پوچھا تھا میں نے،
تمہاری محبت کے بارے میں؟“ ظہیر نے ایک ایک
لفظ پر زور دیا۔

”میں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں۔“ ناہید

نے اپنے شدید ترین غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کی۔
”ویسے کتنی عجیب سی زندگی ہو جاتی ہے نا، انسان کا
دل کہیں اور وجود کہیں اور۔“ ظہیر اس کی وضاحت

سے بے نیاز اپنی ہی ہانک رہا تھا۔
”میرا دل وہیں ہے جہاں میرا وجود ہے اور اب آپ

ایک لفظ بھی مزید نہیں بولیں گے۔“ ناہید نے بے حد
تختی اور غصے سے کہا تھا۔

”اور اگر میں خاموش نہ ہوا تو؟“ ظہیر اس کی حالت
سے حفا اٹھا رہا تھا۔

”جھگڑا ہو جائے گا، ہم دونوں کے درمیان میں نے
اپنے مزاج اور عادت کے برخلاف بہت برداشت کر لیا

آپ کی باتوں کو۔“
”اوہ ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”مجھ سے جھگڑا کرو گی، کس

بات پر؟ اس بات پر کہ شادی سے پہلے تم نے کسی سے
محبت کی تھی؟ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ ظہیر کی

سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔
”اف۔۔۔“ ناہید کا جی چاہا اپنے بال لوج لے یا

پھر سامنے بیٹھے اس شخص کا منہ۔
رات کو ظہیر تو بڑے آرام سے سو گیا تھا، رات کی

خاموشی اور تہائی میں ناہید جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔
اس کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں، اس صبح فریبا

انکشاف کے بعد کہ اس کا شریک سفر ایک انتہائی شکی
مزاج انسان ہے۔

”تمہیں کیا پتا، جب بے قصور ہوتے ہوئے بھی
ہمارے کردار پر شک کیا جائے تو کتنی تکلیف ہوتی

ہے۔“ ناہید کو اس وقت بار بار طارق کا خیال اور اس کی
باتیں یاد آرہی تھیں جو وہ ٹینے کے حوالے سے کرتا

تھا۔
”ایک بد مزاج اور بد شکل انسان کے ساتھ گزارا

ہو سکتا ہے، مگر شکی مزاج کے ساتھ گزارا۔ اللہ تو بہ۔
مجھے تو یہ احساس ہی مار ڈالتا ہے کہ میری لائف پارٹنر

میرے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے اور مجھے کتنا
برا اور غلط سمجھتی ہے۔“

آرام سے اسے مشورے دے دیتی تھی۔ اس کے احساسات کو سمجھے اور جانے بغیر کبھی اسے ہی مورد الزام ٹھہرا دیتی تھی۔

”سچ کو اپنی وضاحت کے لیے دلیلوں اور ثبوتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سچائی خود ہی اپنے آپ کو منوایتی ہے۔“ ناہید کے لیے اس وقت یہ سب کہنا آسان تھا اور طاریق نے کہا تھا کہ جب آنکھوں پہ شک کی بی بندھن ہو تو نہ سچ نظر آتا ہے نہ سچائی۔

”کتنا سچ کہا تھا اس نے، میں ہی غلط تھی شاید۔“ ناہید نے اپنے کراتے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔

”کتنا آسان ہوتا ہے یہ کہنا کہ سچ خود کو منوالیتا ہے اور کیا میری سچائی خود کو منوا سکتی ہے، کیا میرا شوہر میرے سچ پہ یقین کر لے گا؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

”کبھی نہیں کرے گا۔“ اپنے شوہر کو جس حد تک وہ جان سکی تھی، سمجھ سکی تھی۔ اس کے دماغ نے یہی جواب دیا تھا۔

اگلے کئی روز تک ظہیر بالکل نارمل تھا اس نے دوبارہ ناہید سے اس موضوع پر نہ کوئی بات کی نہ سوال جواب، یہاں تک کہ اس کا والدانہ انداز دیکھ کر ناہید کو محسوس ہونے لگا کہ اس دن جو کچھ بھی ہوا وہ سب ایک خواب تھا، مگر خواب تعبیر کی صورت میں مجسم ہو کر کبھی نہ کبھی انسان کے سامنے آئی جاتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ناہید کو اپنے موبائل پہ ایک انجان نمبر سے میسجز موصول ہو رہے تھے۔ پیغامات کیا تھے، بس اس کی بے تحاشا تعریفیں اور دوستی کے تقاضے، ناہید نے کوئی خاص توجہ نہیں دی، گھر کے کام اور لکھنے کی مصروفیت ہی بہت تھی اور نہ بھی ہوتی تو اس طرح رائگ نمبر پہ باتیں کرنا یا دوستیاں کرنا اس کا مزاج نہ تھا۔

دن بھر اسی انجان نمبر سے میسجز آتے اور وہ ڈیلیٹ کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

اس بار گھر گئی ملنے کے لیے تو امی، ابو اور دادی اس بھی اس سے بہت اصرار کیا رکھنے کے لیے۔

”دنیا جہان کی لڑکیاں میکے میں رکتی ہیں، تیری شادی انوکھی ہوئی ہے، بس ذرا دیر کو شکل دکھلا آجانی ہے۔“ دادی نے تقریباً ڈانٹ ہی دیا۔

”شادی تو انوکھی نہیں البتہ شوہر صاحب ضرور انوکھے ہیں۔“ ناہید نے کھٹاک سے دادی کو جواب دیا۔

”چھوٹی تو ملک سے باہر ہے، یہی سوچ کر صبر کر لیتے ہیں، تمہارا گھر تو تھوڑے فاصلے پر ہے پھر بھی نہیں ڈھنگ سے دیکھنے اور بات کرنے کو ترس گئے۔“ امی نے بھی لگے ہاتھوں شکوہ کر ڈالا۔

”گھڑی دو گھڑی کو غیروں کی طرح مہمان بن کر آئی ہو اور چلی جاتی ہو اب ایسا بھی کیا کہ کبھی کبھار رک بھی نہیں سکتیں۔“

”ظہیر سے پوچھ لیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے رکھنے میں۔“ ناہید نے کندھے اچکائے۔

”اچھا۔ میں بات کرتی ہوں اس لڑکے سے، ارے کیا دنیا سے زالی شادی ہوئی ہے جب بھی کو اکیلے پن کا بہانہ کرتا ہے کہ گھر کو کون دیکھے گا، کام کون کرے گا، ارے ہم نے بیوی بنا کر رخصت کیا ہے یا کوئی نوکرانی ملے باندھی ہے۔“

دادی آج بڑے جوش میں تھیں، لگ رہا تھا کہ ظہیر کی خبر لے ہی ڈالیں گی اور یہی ہوا۔ ظہیر سے انہوں نے جانے کیا اور کس طرح بات کی کہ وہ بادل خواستہ آج کی رات ناہید کو گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے دادی جان! آپ اتنا اصرار کر رہی ہیں تو آج ناہید رک جائے گی، کل لینے آؤں گا پھر۔“ اس نے دادی سے کہا۔

”جگ جگ جیو بیٹا، خوش رہو، دودھو نہاؤ پوتوں پھلو۔“ دادی نہال ہو گئیں۔

ناہید رک تو گئی، مگر رات گئے موبائل پر پیغامات جو تانتا بندھا اس کا لیٹنا حرام ہو گیا، ایک کے بعد ایک گھڑی گھڑی میسج آ رہے تھے۔

”آپ پلیز مجھ سے بات کریں، میں آپ کو بلا دوں گا، میں نہیں کروں گا، میرا یقین کریں۔“ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے۔“

”سچ تو آپ اپنے گھر پر ہیں، شوہر کی پرے داری نہیں ہے پھر آپ مجھے جواب کیوں نہیں دیتیں؟“ ”الو کا پٹھا!“ ناہید نے بریڈ کر فون اٹھایا۔ سائلنٹ رک گیا اور پھر سنچ دیا۔

اگلے دن شام میں حسب وعدہ ظہیر آ گیا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر دونوں روانہ ہوئے۔

”آپ تو تمہارا شکوہ دور ہو گیا؟“ ظہیر نے جتنا تے ہوئے سوال کیا۔

”کون سا شکوہ؟“

”یہی کہ میں تمہیں میکے میں رکھنے نہیں دیتا۔“

”وہ تو اب بھی برقرار ہے، ایک سال میں ایک دن رات اب اگلی بار رکھنے کے لیے مزید ایک سال کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”عقل مند مو اونی بیویوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں رکھتے۔“ ظہیر مسکرایا۔

”ایسی باتیں اور حرکتیں وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنی بیوی پر اعتبار نہ ہو۔“ اس بار ناہید نے اسے جھٹکائی ہوئی لگاہوں سے دیکھا تھا۔

”ا۔ ا۔ آج کل انسان کو اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے، دوسرے پر کیا کرے گا۔“ ظہیر نے ایک کھلی سانس لے کر کہا۔

”آپ خود کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں؟“ ناہید نے ہلکی سی سوال کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ دنیا کا ہر ایک انسان کسی نہ کسی حد تک ناقابل اعتبار ہے۔“ ظہیر نے کانڈھے لپٹائے۔

”آپ کی سوچ کافی نیگیٹو ہے۔“ ناہید نے برملا کہا۔

”میں اب معلوم ہوا، تقریباً ایک سال بعد۔“

ظہیر یوں مسکرایا جیسے اس کے تبصرے سے محفوظ ہوا ہو۔

”مجھے اندازہ ہوا تھا، مگر میں اس اندازے کو یقین میں نہیں بدلنا چاہتی تھی۔ اس لیے نظر انداز کرتی رہی۔ میرے لیے یہ کافی تکلیف دہ بات ہے۔“

”میں تمہاری توقعات کے برعکس نکلا، تمہیں مایوسی ہوئی، شادی کے بعد؟“ ظہیر یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

”میں نے ایسی کوئی توقعات وابستہ نہیں کی تھیں آپ سے جو مجھے مایوسی ہو۔ بس ایک بات سے تکلیف ضرور ہوئی۔“ ناہید نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”کس بات سے؟“

”آپ شکی مزاج ہیں۔“

”شک ہی کرتا ہوں نا، کسی کو قتل تو نہیں کرتا۔“ ظہیر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

”بے جا شک کرنا کسی کو قتل کرنے سے بھی زیادہ برا اور اذیت ناک ہے۔“ ناہید کو جانے کیا کچھ یاد آ گیا۔

”تم کہانیاں لکھتی ہو، اس لیے ڈانٹا گزرتا ہے بول لیتی ہو۔“

”یہ میرا ڈانٹا لگ نہیں ہے۔“ ناہید نے تیزی سے جواب دیا اور پھر فوراً ہی لب بھینچ لیے۔

”پھر؟ کس کا ڈانٹا لگ ہے یہ؟“ ظہیر کے چہرے پہ ناقابل فہم تاثرات آ گئے۔

”کسی کا نہیں۔“ ناہید نے بے زاری سے بولتے ہوئے منہ دوسری طرف کر دیا۔

”اس کا ہے تمہاری ناکام محبت کا؟“

”کیا بکو اس سے۔“ ناہید اک دم ہی برہم ہو گئی۔

”بکو اس تو تم کرتی ہو، اپنی محبت کے ڈانٹا لگز میرے سامنے دہراتی ہو، بڑی بہادر ہو ذرا ادھر منہ کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔“ ظہیر نے اس کا بازو دوچا اور اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

”اف۔ ف۔ انڈ!“ ناہید اس اچانک حرکت کے لیے تیار نہ تھی، گراہ اٹھی۔

”نظریں وہ لوگ چراتے ہیں جن کے دل میں چور ہو“ میرے دل میں کوئی چور نہیں میں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہوں“ آپ ایک بیمار ذاتیت کے انسان ہیں اور بس۔“ ناہید نے تیزی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اپنے بارے میں سچ برداشت کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ انسان فوراً“ دوسرے کو الزام دے دیتا ہے۔“ ظہیر حیرت انگیز طور پر پرسکون ہو گیا تھا۔ کچھ عجیب سی رنگ تھے اس کی فطرت اور مزاج کے پل میں تولہ پل میں ماشہ۔

”اپنے بارے میں سچ برداشت کرنا کتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ جھوٹ برداشت کرنا۔“ ناہید کرنے سے سیدھی نکلتی چلی گئی اور ڈرائنگ روم میں آکر خاموشی سے لیٹ گئی۔ وہ اگر کچھ دیر اور اپنے کمرے میں رہتی تو ظہیر کے ساتھ لڑائی یقینی تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ شوٹے چھوڑتا رہتا اور ناہید منہ توڑ جواب دیے بغیر نہ رہتی۔ اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس وہ بڑی حد تک برداشت اور سمجھوتے کی راہ پر گامزن تھی مگر کب تک شوہر کے شک کی سولی پہ وہ زیادہ دیر نہیں لٹک سکتی تھی۔

”شک بہت خراب چیز ہے ناہید! کوئی صبر برداشت والا انسان نہ ہو تو وہ ضد میں آکر وہ سب کرنے پر تل جاتا ہے جس کا اس پر شک کیا جا رہا ہو حالانکہ اس نے بھی سوچا بھی نہ ہو وہ ایسا کام کرے گا پتا ہے کیا تمہاری بہن کی طنزیہ باتیں اور طعنے کبھی اتنا مشتعل کرتے ہیں مجھے کہ میرا دل چاہتا ہے میں تم سے نہ کسی اور سے ہی“ مگر ایک عدد الفینو لڑانا شروع کر دوں۔“

ایک روز طارق نے ناہید کے آگے اپنا دکھڑاوتے ہوئے کہا تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔

”اسے اعتبار دو کہ تم صرف اس کے ہو وہ خود بخود تمہاری ہو جائے گی“ سارے طنز اور طعنے شک و شبہات ختم ہو جائیں گے۔“ ناہید نے بہت آرام سے مسئلے کا حل بتایا تھا۔

”ساحل پہ کھڑے ہو کر موجوں کا نظارہ بہت اچھا لگتا ہے“ موجوں کے تھپڑے کھانے والوں کا ایک احساس خدا خواستہ تم اگر میری جگہ ہو تیں تو ایسی بات کرنے والے کا منہ توڑ دیتیں۔“ طارق کا جواب اسے آج بھی یاد تھا۔

”کتنا سچ جانتا تھا وہ مجھ کو۔“ ناہید نے سوچا۔ اس کا سچ سچ یہی دل تو چاہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ظہیر بالکل نارمل تھا معمول کے مطابق اٹھا تیار ہوا ناشتا کر کے باہر نکل گیا۔ وہاں سے آیا تو حسب معمول ناہید سے اسی طرح باتیں کیں جس طرح کرتا تھا۔

ناہید عجیب اوجھڑ بن میں تھی۔

کیا زندگی اس طرح گزرے گی اسی آنکھ پھولی کے ساتھ۔

پیسے کی کمی کے ساتھ گزارا ہو سکتا ہے۔ محبت کی کمی کے ساتھ نباہا ہو سکتا ہے۔ کوئی خامی کوئی کی نظر انداز ہو سکتی ہے۔ مگر ”شک“ کے ساتھ گزارا کرنا نباہ کرنا ہر بل ہر آن کی اذیت ہے کوئی کب تک برداشت کرے اور وہ بھی ناہید جیسی برداشت سے کوسوں دور پھر بھی اپنی طبیعت اور مزاج کے برخلاف زندگی کے اس امتحان سے نبرد آزما تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کا سبیل فون خراب ہو گیا تھا۔ ظہیر سے کہا تھا نیا موبائل خریدنے کے لیے ہوں ہاں کرتا رہا کبھی پیسوں کی کمی کبھی وقت کی قلت کبھی حالات خراب ایک مہینہ گزر گیا تھا ناہید جھنجھلا اٹھی۔

”میں خود بازار سے لے آؤں گی۔“

”جانتی ہو حالات کسے ہیں پھر بھی“ کیلے“ گھونٹے کا شوق چرایا ہوا ہے۔“ ظہیر نے ”کیلے“ پر زور دیا۔

”گھونٹے نہیں جارہی ضرورت ہے۔ اس بے جارہی ہوں۔“ ناہید نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

”ضرورت تو میرے موبائل سے بھی پوری ہو سکتی ہے تمہارا موبائل کون سا لہجہ چڑا کر بزنس چل رہا ہے تم اسے استعمال کر لیا کرو۔“

”دن میں تو آپ آفس میں ہوتے ہیں میرا کوئی فون آئے یا مجھے کرنا ہو تو کیا کروں؟“

”میرے آفس سے آنے کے بعد کر لیا کرو ایسے گرنے سے ضروری فون آنے جانے ہیں جو میری غیر موجودگی میں ہی ہوں گے۔“ ظہیر کیلئے پن سے مسکرایا اور ناہید کا خون کھول اٹھا۔

”چھوڑی باتیں کتنا ضروری ہیں؟“

”پتا نہیں کیوں تمہیں میری سچی باتیں کبھی بُری لگتی ہیں کبھی چھوڑی۔“ ظہیر کا انداز استہزائیہ تھا۔

”مگر آپ کو مجھ پر اور میرے کردار پر اتنا ہی شک ہے تو اپنے ساتھ رکھا ہوا کیوں ہے کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔“ ناہید ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہو گئی وہ ضبط کی انتہاؤں کو چھوڑ رہی تھی۔

”اچھا! کہاں جاؤ گی آزاد ہو کر؟ اس کی پاس؟ اس نے ناہید کو پیچھے سے پکارا۔“

”اف۔“ ناہید اتنی کمزور نہیں تھی پھر بھی رنج اور بے بسی کے مارے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

وقت ظالم نہیں ہوتا نا مہیاں نہیں ہوتا یہ تو لوگ ہوتے ہیں جو گزرتے وقت کو تکلیف دہ بنا دیتے ہیں ناہید بھی ذہنی اذیت جھیل رہی تھی۔ دن اور رات گزر رہے تھے مگر ایک ایک پل تکلیف سے بھر پور لگتا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیسے سروائیو کروں؟

”سوچ کر اس کے داغ کی رگیں پھٹنے لگتی تھیں۔“

ظہیر کوئی الف سے لے کرے تک بالکل ہی برا نہیں تھا بس ہر ہفتے دو ہفتے بعد کسی نہ کسی بات پر کھلم کھلا ڈال کر چھوڑ دیتا اور ناہید کے سلنے کا نشانہ چھٹک

اس کی ذہنی حالت اور ٹینشن اب اس کی تحریروں سے بھی پھٹنے لگی تھی ایک تو کلم اٹھانے کو ہی اب دل نہیں چاہتا تھا پھر بھی خود کو مصروف رکھنے اور

خیالات کے جنگل میں بھٹکنے سے بچانے کی خاطر وہ لکھ بھی لیتی تو پڑھنے والوں کی شکایات کا نام نہ بندھ جاتا۔

”ناہید نور الہی کی کہانیاں کچھ عجیب سی ہوتی جارہی ہیں بے حد اداس، قنوطی۔ وہ ناہید کہاں ہے جو خوابوں اور زندگی سے بھرپور کہانیاں لکھتی تھی؟ خوابوں اور زندگی سے بھرپور کہانیاں؟ ناہید پڑھ کر بے بسی سے مسکرا دی۔

وہ خواب مر گئے وہ زندگی خواب ہوئی زندگی ہمیشہ ریوں کی کہانی تھوڑی ہوتی ہے اس میں درد کا رنگ بھی ہوتا ہے لکھنے والا اس درد کو کہاں لے جائے اپنے دل میں تھوڑی رکھتا ہے قلم کے ذریعے کاغذ پہ نخل کر دیتا ہے وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چائے لے کر کمرے میں آ رہی تھی جب ظہیر کی آواز بلکہ لفظوں نے اس نے بڑھتے قدم روک دیے۔ وہ اپنے دوست سے بات کر رہا تھا۔

”عورت سے زیادہ ناقابل اعتبار مخلوق اس دنیا میں کوئی نہیں ہے“ میرا یقین نہیں بلکہ ایمان ہے اس بات پر وہ تیرا ہی قول ہے تاکہ عورت یا تو پری ہوئی ہے یا پھر بہت زیادہ بری ہم تو آپ کی فلاسفی کے معتقد ہیں پرو مشد۔“

ظہیر نے ایک قہقہہ لگایا پھر دوسری طرف سے بات سن کر دوبارہ بولنے لگا۔

”بالکل ٹھیک“ عورت کو گھرواری میں بچوں میں اتنا مصروف اور مگن رکھو کہ ادھر ادھر کے فالٹو خیالات سے دماغ خراب نہ ہو۔ نہ کسی کو گھر بلاؤ نہ کسی کے گھر جاؤ یہ جو دوستیاں اور تعلقات ہیں نا یہ بھی عورت کو خراب کرتے ہیں ویسے میں اپنی بیوی کو رانگ کالز کر کے آنا چکا ہوں کوئی رسپانس نہیں دیا خیر کیا پتا میرے ہی ڈر کے مارے بات نہ کی ہو۔“

ناہید چپ چاپ کھڑی اس کے اقوال زیریں سن رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہی گرم گرم چائے کا کپ اس کے سر پر انڈیل دے تاکہ عورت کے

بارے میں اس کی رائے اور پختہ ہو جائے۔

”کاش میں ایسا کر سکتی۔“ ظہیر کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ کبھی کبھار گھر جاتی تو واوی پورانی ابو اس کا چہرہ کھوجتے رہتے۔
”تو خوش تو ہے نا؟“ واوی اسے بغور جاچتی ہوئی نظروں سے دیکھتیں۔

”ہاں۔“

”خرچے پانی کے معاملے میں تنگ تو نہیں کرتا شوہر؟“
”نہیں۔“

”میکے کیوں نہیں رکھتے دیتا۔“ وہ پے درپے سوالات کیے جاتیں۔

”گھر میں نالا پڑا ہوا ہو تو چوروں ڈاکوؤں کے آنے کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ ہمارے محلے میں کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔“ وہ ظہیر کا رٹا رٹایا بیان انہیں بھی سنا دیتی۔

”اللہ جانے کس انوکھے مزاج کا ہے تیرا میاں۔“
واوی پھر بھی مطمئن نہیں ہوتیں۔

اس دن اس کی عزیز دوست افشین کا فون آگیا۔ ظہیر نے ہمیشہ کی طرح اسپیکر آن کر کے اسے موبائل دیا۔

”کہاں ہو؟ کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے تمہاری خاطر۔ اتنی مشکل سے رابطہ ہوا ہے کیا بتاؤں۔“
افشین اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں شروع ہو گئی۔

”یہیں ہوں اسی دنیا میں۔“ ناہید مضحل انداز میں مسکرا دی۔ (اف وہ دوست دوستیاں باتیں سب کچھ صدیوں پرانی کہانیاں لگتا تھا۔)

”اس دنیا میں تو خیر نہیں، تم کسی اور ہی دنیا میں ہو۔ اپنی سوشل لائف تو بالکل ہی ختم کر ڈالی تم نے۔ نہ کسی سے رابطہ نہ فون نہ میل ملاقات کیا بات ہے۔ میاں تو کھڑوس نہیں ہے تمہارا؟“

”بس کچھ گھر کی مصروفیت ہے۔ کچھ لکھنے میں دقت گزر جاتا ہے۔ یوں ہی صبح سے شام، شام سے رات ہو رہی ہے۔“ ناہید نے اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے مختصراً کہا۔

”گھر کی مصروفیت؟“ وہ چیخی۔ ”تمہاری کون سی لمبی چوڑی سسرال ہے۔ ایک تمہارا میاں، ایک تم، دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے اور لکھنے کی بات تو تم چھوڑی دو۔ سچ اتنا کہو اس لکھ رہی ہونا پڑھ کر ہی غصہ آنے لگتا ہے۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“ افشین بغیر کسی لحاظ مروت کے بول رہی تھی۔

”پھر کیا کروں؟ لکھنا چھوڑ دوں؟“
”نہیں خیر۔ یہ مشورہ تو میں نہیں دوں گی، مگر تم یہ بتاؤ وہ پہلے والی ناہید نور الہی کہاں ہے؟“

”کھو گئی کہیں۔“ ناہید دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”اچھا بات سنو۔ میں اس وقت نکل رہی ہوں شاپنگ کے لیے۔ امی اور باجی تیار کھڑی ہیں میرا سٹ کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا، چلتے چلتے تمہیں بڑائی کر لوں، اتفاق سے نمبر آج مل ہی گیا۔ پھر فون کروں گی ٹھیک ہے۔“ افشین نے تیز تیز بولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور سیل آف کر دیا۔

”خدا حافظ۔“ ناہید نے دھیرے سے کہا
”بڑی خطرناک دوستیں ہیں تمہاری۔“ ظہیر نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ناہید کو کچھ اسی قسم کے تبصرے کی توقع تھی۔ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”اتنی خوف ناک باتیں؟ کوئی اپنے گھر میں خوش ہے۔ انہیں کیا ضرورت ہے آوارہ گردی۔“ اکسانے کی۔ ایسی عورتیں دوسروں کو درغلا کر ان کا گھر برباد کرتی ہیں۔“ ظہیر شروع ہو گیا۔

”گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت آوارہ نہیں ہوتی ظہیر صاحب، آوارگی انسان کے اپنے دماغ اور کردار میں ہوتی ہے۔ جس کے لیے باہر نکلنا ضروری نہیں۔ گھر بیٹھے لوگ بھی آوارہ ہو سکتے ہیں۔“ ناہید لکھی سے

کستی باہر نکل گئی۔

زندگی جیسے ایک جال بن گئی تھی۔ وہ جتنے ہاتھ پاؤں مارتی اسی میں الجھ رہی تھی۔

اس بار وہ گھر گئی تو باتوں کے دوران اچانک امی کو کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر فریج کے پاس گئیں۔ واپس آئیں تو ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

”مہربان کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ تمہاری مٹھائی بھجوائی تھی بھائی صاحب نے۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ ورنہ میں اور تمہارے ابو آج آتے تمہاری طرف۔“

”آپ فون کر دیتیں امی! ہم گھر پر رک جاتے۔ اسی بہانے آپ لوگ ہمارے گھر آجاتے۔ میٹوں ہو جاتے ہیں گھر سے کسی کو آئے ہوئے۔“ ناہید نے شکوہ کیا۔

”ایک ہی بات ہے بیٹا۔ تم آگئیں ہمارے دل کو تسلی ہوگئی۔“ امی نے نرمی سے کہا۔ وہ پھر اٹھ کر کمرے میں گئیں۔

”شہینہ کا خط آیا ہے تمہارے لیے۔“ انہوں نے ایک لفافہ ناہید کی طرف بڑھایا۔

”شہینہ کا خط میرے لیے؟“ ناہید بے یقینی سے ماں کو دیکھتے ہوئے اتنی حیران ہوئی کہ ہاتھ بڑھا کر لفافہ لینا بھی بھول گئی۔

”حیرت ہے انٹرنیٹ اور موبائل کے دور میں خطوط؟ ایسی کیا خاص بات ہے جو موبائل پہ نہیں ہو سکتی۔ نیٹ پہ نہیں ہو سکتی؟“ ظہیر نے مداخلت کرتے ہوئے امی کے ہاتھ سے لفافہ اچک لیا۔

ظہیر نے خط پڑھ لیا تھا۔ اسے بڑھنا ہی تھا۔ ناہید کے ہاتھ میں لفافہ دیتے وقت اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ظاہری تاثرات سے پاک دل میں کیا تھا خدا جانے، مگر اس وقت تو ناہید اس کے چہرے سے کچھ بھی کھوجنے میں ناکام رہی۔ ناہید کو لفافہ دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناہید کچھ دیر ہاتھ میں پکڑے لفافے کو دیکھتی رہی۔

وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ نہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے نہ دل کی دھڑکن غیر معمولی تھی۔ بس اندر۔۔۔ دور تک حیرانی ہی حیرانی تھی اور اسی حیرانی کے عالم میں اس نے لفافہ کھول کر خط نکال لیا۔

ناہید۔

بغیر کسی القاب و آداب کے مخاطب کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے، تمہیں برا نہیں لگے گا۔ ہمارے درمیان بہنوں والے مثالی تعلقات کبھی نہیں رہے۔ بس رسمی سے، مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ میری شادی ہونے تک، پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ میں آج بھی سوچتی بیٹھتی ہوں تو وہ سب اب سمجھ میں آتا ہے جو اس وقت نہیں آیا۔ میری باتیں شاید بے ربط ہی ہو رہی ہیں۔ ٹھہرو! میں ابتدا سے سب کچھ بیان کر لی ہوں۔

اس وقت۔۔۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی میں الز تھی، تو عمر تھی ہر لڑکی کی طرح میری آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے۔ دل میں کچھ ارمان، اپنے خواہشیں، کسی کو چاہنے کی، خود کو چاہے جانے کی وہ معصوم سی آرزو میں جو کچی عمروں کا خاصا ہیں۔ پھر طالق کا رشتہ آیا۔ ایک ہی گھر میں رہنے والا فرسٹ کزن پتا نہیں کیوں مجھے یوں لگا جیسے میں اس کی مرضی اور خواہش بن کر اس کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہوں یا پھر دل میں چھپی خواہشوں اور خوابوں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے پر آمادہ کیا۔

شادی ہوگئی طالق کا رویہ نارمل تھا، نہ بہت زیادہ اچھا، نہ بُرا، بلکہ سچ کہوں تو کسی حد تک اچھا ہی تھا، مگر میں جو والہانہ پن اور گرمجوشی کی توقع کے بیٹھی تھی۔ وہ پوری نہیں ہوئی، میں متنی تھی، اس کے لبوں سے اظہار محبت سننے کی۔ اقرار سننے کی۔ کہہ مجھے پانے کو کتنا بے تاب تھا، کتنا بے چین تھا، مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کو، میرے سارے ارمان سارے خواب، اک اک کر کے مرجھاتے جا رہے تھے۔ میں طالق کی طرف سے مایوسی کا شکار تھی۔ حالانکہ اب سوچتی ہوں تو بے وقوفی لگتی ہے کہ

شہر کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض بخوبی ادا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی معاملے میں مجھ پر جبر نہیں کیا یا زندگی نہیں کی تھی۔ مجھے کبھی ذہنی یا جسمانی تکلیف نہیں دی۔ مگر پھر بھی مجھے دل ہی دل میں اس سے شکایات ہو چکی تھیں۔

اب خیال آتا ہے کہ اگر اس نے مجھ سے اظہار الفت نہیں کیا تھا تو نفرت یا بے زاری کا رویہ بھی نہیں اپناتا تھا۔ اپنے طور پر وہ خوش کرنے کے جتن ہی کرتا تھا۔ مگر اب یہ خواب، یہ کم بخت دل اور یہ بے لگام خواہشیں، یہی تو ہیں جو ہمیں اور ہماری زندگی کو تباہی کے دہانے پہ لا کھڑا کرتی ہیں۔ مجھے جب یہ احساس ہونے لگا کہ میں فقط اس کی بیوی ہوں، محبوبہ نہیں تو میرے خواب ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگے اور ان کے ساتھ ساتھ میں بھی ٹوٹ رہی تھی۔ چاہے جانے کی خواہش سانپ کی طرح پھن پھیلانے میرے اندر مجھے دس رہی تھی۔ میں نیلیوں نیل ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھے سب کچھ برا لگنے لگا۔ وہ گھر، وہ لوگ، اپنا شوہر میں بات بے بات ہر ایک سے الجھ پڑتی۔ حتیٰ کہ طارق سے بھی۔ جان بوجھ کے اس کو خزانے کے لیے غصہ دلانے کے لیے اس کی مرضی کے خلاف کام کرتی، وہ کچھ مشتعل ہوتا، کبھی سمجھاتا، مگر دھیرے دھیرے ہمارے درمیان کشیدگی بڑھ رہی تھی۔

پھر ایک روز شدید غصے کے عالم میں (تمہیں معلوم ہے نا، وہ غصے کا کتنا تیز ہے۔ تمہاری اور میری طرح) اس نے انکشاف کیا کہ وہ تم میں دلچسپی رکھتا تھا اور تمہارے انکار کے بعد میں اس کے گھر اور زندگی میں شامل ہوئی۔ اس کی مرضی سے نہیں، بلکہ اس کے والدین کی مرضی سے، مجھے اعتراف ہے کہ اپنے والدین کی مرضی اور فیصلے کو اس نے بڑی سچائی اور غلوں کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی، مگر اس وقت میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ اس روح فرسا انکشاف نے جیسے میرے بدن سے میری روح کھینچ لی تھی۔ یعنی جان نکال لی تھی۔ مجھ پہ ایسی بجلی گری کہ میں جل کر خاک ہو گئی۔ میں نے اس پر اپنا غم و غصہ نکالنا

شروع کر دیا۔ شک کرنا شروع کر دیا۔ میرا غم و غصہ اس بات پر تھا کہ اس کی طلب اس کی محبت میں نہیں تھی۔ اب وہ تم ہو یا کوئی اور، مگر بہر حال وہ میں نہیں تھی۔ میں ہر وقت بس یہی سوچتی رہتی اور میرے اندر ایک آتش فشاں ابھرتا رہتا اور جب آتش فشاں پھٹتا ہے تو اپنے ساتھ کتنی اور کسی تباہی لے کر آتا ہے۔ راہ میں آنے والی ہر شے جل کر خاک ہو جاتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔

یہ سب اس لیے ہوا کہ میں نے اپنی محبت، اپنا اعتبار اسے دینے کی کوشش نہیں کی۔ صرف چاہے جانے کی تمنا کی۔ وہ بھی جلد بازی کے ساتھ میری تمنا، غلت پسندی اور غصیل طبیعت نے میرے اپنے ساتھ ساتھ تم دونوں کو بہت زیادہ ہرٹ کیا۔ بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کیا۔

ہم نہ کبھی ٹھیک طرح سے خود کو سمجھ پاتے ہیں نہ زندگی اور اس کے معاملات کو، آج میرا شوہر اپنی اولاد کی شکل میں ان کے وجود میں اپنی پہلی بیوی کو کھو چکا ہے۔

میں نے طارق کے معاملے میں معمولی سی شراکت بھی برداشت نہیں کی اور آج مجھے مکمل طور پر تقسیم شدہ شوہر ملا ہے جس نے اپنے آپ کو دو حصوں میں بانٹا ہوا ہے۔ ایک میں اس کا ماضی محبت اور یادیں ہیں اور دوسرے میں حال، میں اور اس کے بچے اس میں بھی اس کی محبت اور توجہ کا بڑا حصہ بچوں کے لیے ہے۔ میں تو کہیں کونے کھدرے میں، آخری نمبر پر ہوں۔ میری حاکمانہ اور خود پسند طبیعت یہ سب کس طرح برداشت کر رہی ہے۔ شاید ہی کوئی سمجھ سکے طارق کے کام مجھے مشکل لگتے تھے۔ اب شوہر کے ساتھ بچوں کی ذمہ داری بھی سنبھال رہی ہوں۔

جب کوئی جائے پناہ نہ ہو، سارے راستے مسدود ہو جائیں تو ہم سب اسی ایک در کی طرف بھاگتے ہیں۔ جو ہمیشہ ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا ہوتا ہے۔ ہم اسے ہی پکارتے ہیں جو ہماری پکار فوراً سنتا ہے اور جواب دیتا ہے۔ میں نے بھی عاجزی سے اس کے

سامنے سر جھکا دیا۔ حالات بدلیں نہ بدلیں، سکون تو مل ہی جاتا ہے۔

ایک مرضی اور چاہت اللہ کی تھی جو اس نے میرے لیے پسند کی، میں نے اسے قبول نہ کیا اور اپنی مرضی پہ اصرار کیا۔ اللہ نے اپنے قانون کے مطابق وہ بھی نہ دیا جو میری چاہت تھی اور وہ بھی چھین لیا جو اس کی مرضی تھی۔ اب جو بھی کچھ ہے۔ وہ جانے میری سزا ہے یا ایک اور آزمائش۔

میں نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو میرے دل میں تھا۔ میرا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو گیا اور بس آخری اور سب سے اہم بات میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ ہر بات کے لیے۔ اپنے ہر ہر لفظ کے لیے اور ہر حرکت کے لیے، اگر تم مجھے معاف کر دو گی تو میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

ناہید کو علم بھی نہیں ہوا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

ہم بظاہر کتنے ہی خود غرض، بے نیاز اور کٹھور بن جائیں۔ پھر بھی دل کے اندر کہیں ایک نرم سا گوشہ احساسات سے بھرا موجود ہوتا ہے۔ ذرا سا ممییز ہوا اور چھلک پڑا۔

”تم نے طارق کو انکار کیوں کیا تھا؟“ رات کو سونے سے پہلے ظہیر نے ون ملین ڈالر کا کوئٹہ سچن کیا تھا۔

ٹھیکہ کے پورے خط سے اس نے فقط یہی ایک بات اخذ کی تھی۔ اپنی مرضی کی۔ اپنے مطلب کی۔

ناہید چپ چاپ چند لمحے اس کی شکل دیکھتی رہی۔ پھر بے حد سکون سے گویا ہوئی۔

”کیونکہ مجھے اس جنم میں آنا تھا۔“

ظہیر نے اس وقت تو کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ دو دن بعد وہ ضرور بولا تھا اور چھپڑھا کر بولا تھا۔

”تم مجھ سے طلاق لے کر اپنے کزن سے ہی شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

ناہید کو اس سے ہر قسم کی بات کی توقع تھی۔ اسے کوئی بھی بات سن کر اب کوئی خاص حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس وقت اسے اک دم سے دھچکا ضرور ہوا تھا۔

”کوئی بھی شخص اتنا کیسے کر سکتا ہے؟“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ وہ یقیناً ناہید کی حالت سے حفا اٹھا رہا تھا۔

”میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ کسی کے مشوروں سے نہیں۔“ ناہید کا لہجہ مضبوط تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔“ ناہید کا سکون انداز اسے طیش دلا گیا۔

”مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔“ ناہید نے دہرہ جواب دیا۔

ظہیر کا رویہ دن بدن جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ پابندیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسے میکے لے جانا مزید کم کر دیا تھا۔ لے کر جانا بھی تو وہاں یوں چوکنہ ہو کر بیٹھا رہتا جیسے ابھی کسی کو نے سے طارق نکل کر آجائے گا۔

ناہید چپ چاپ یہ تمام شایوں دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب اس کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہو۔ شکر ہے کہ وہ جسمانی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ مگر ذہنی اذیت یہ تو جسمانی تکلیف سے بھی بڑھ کر تھی، مگر یہ خام خیالی بھی کچھ دنوں تک ہی تھی۔ رفتہ رفتہ ظہیر کا ہاتھ اٹھنے لگا۔ پتا نہیں کتنی فرسٹریشن تھی اس کے اندر، کتنی ٹھن تھی، وہ مار پیٹ کے ذریعے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ حیرت انگیز طور پر ناہید سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اس کی فحش کی طرح چلتی زبان بھی اور ہتھیار بنے ہاتھ پاؤں بھی کہاں تو وہ ناہید جو کسی کا کما ایک لفظ برداشت نہیں کرتی تھی اور اب اتنی بے حس ہو گئی تھی شوہر کی بدزبانی بھی برداشت کرتی تھی اور مار پیٹ بھی۔ کسی دوسرے کو کیا، خود اس کو بھی یقین نہیں آتا تھا۔

اس دن امی اور ابو دونوں سے ملنے آئے تھے۔

”سہی روز ہو گئے تم دونوں آئے ہی نہیں، ہم نے سوچا ہم ہی مل آئیں۔“ ابو بہت دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

ناہید چائے اور لوازمات لے آئی تھی۔ ظہیر بھی دیکھ بھانجھا۔ مگر اس کا انداز بہت اجنبیت اور بے گامگی لے ہوئے تھا۔ ناہید اسے اور اس کے روکھے رویے کو نظر انداز کر کے ماں باپ کے ساتھ گفتگو میں لگی رہی۔

”بھائی صاحب اور بھابھی آئے تھے، بہت پوچھ رہے تھے تمہیں۔“ ابو نے اسے بتایا۔ ”کسی روز تھوڑا وقت نکال کر ان کے گھر ہو آنا، شادی کے بعد سے تو وہ ایک بار بھی نہیں ملے تم سے۔“

”طارق بھی آیا تھا۔ وہ بھی پوچھ رہا تھا تمہیں۔“ امی نے بڑی سادگی سے لقمہ دیا۔

”پچھا نہیں چھوڑا اس نے اب تک؟“ ظہیر دہرایا۔

ناہید نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کر دی۔ والدین کے سامنے ابھی تک اس نے اپنی ازدواجی زندگی کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ سب اچھا ہے، اس کے گھر والوں کو بیش کی بتایا تھا۔

”یہ چائے بنائی ہے؟ بالکل بکواس۔“ ظہیر نے ایک دم ہی چائے کا بھرا کپ ناہید پہ کھینچ کے مارا تھا۔ گرم گرم چائے اس کے ہاتھ کو جلائی کپڑوں کو داغ دار کر دینے لگی۔ کپ کرچی کرچی ہو گیا اور اس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی، اس کا بھرم، اعتبار اور وہ رشتہ بھی جو اس کے اور ظہیر کے درمیان تھا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ ابو اور امی دونوں نے مل جل کر ناہید سے دھمکا دیا۔

”وہی کر رہا ہوں جو پہلے سے کرنا چاہیے تھا۔ شرم نہیں آتی تم دونوں کو، غیر لڑکوں کے پیغامات لا کر اپنی بیگم کو دے رہے ہو۔ کچھ تو لحاظ کر لیتے کہ اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ ایک تو اپنی آوارہ بیٹی میرے سر پر تھوڑی ہو رہی ہے۔“ ناہید نے ایک زوردار تھپڑ اس کے

منہ پہ مارا تھا۔ اس کی آتش فشاں انگلی زبان چُپ ہو گئی۔ رخسار پہ ہاتھ رکھے وہ ناقابل یقین نظروں سے ناہید کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ضبط کی ساری حدیں اب ختم ہو چکی تھیں۔

”بس خاموش، اب ایک لفظ اور منہ سے نکالا تو نیچے دونوں کپ تمہارے منہ پہ پھینک دوں گی۔ جتنا تمہیں کہنا تھا کہ لیا، جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اب شرافت سے چھوڑنا ہو تو چھوڑ دینا، ورنہ میں عدالت سے رجوع کروں گی۔ ناہید نے انتہائی سرد لہجے میں بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

ظہیر بہت ہٹا کھڑا تھا۔ اسے ناہید کے ایسے رد عمل کی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا ناہید اپنے اصل رنگ میں آج آئی تھی۔

اپنے گھر سے ماں باپ کے ساتھ وہ خالی ہاتھ واپس آئی تھی۔ فقط تن پہ پنے ہوئے کپڑوں کے سوا، اس گھر کا ایک تنکا اس کے ہمراہ نہ تھا۔

ماں باپ تو اس سے سارا معاملہ جان کر شاک میں تھے۔

”تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب؟“

”میں نے اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔“ ناہید نے آہستہ سے جواب دیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ ٹھکن ذہنی بھی تھی، جسمانی بھی، کتنے عرصے بعد وہ آج سکون کی نیند سوئے گی۔

ظہیر سے خلع کے لیے اس نے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ وہ طلاق دینے پر آمادہ نہ تھا۔ کچھ ہفتے عدالت کے چکر لگانے کے بعد اسے خلع مل گئی تھی۔ داوی اٹھتے بیٹھتے ہائے ہائے کرتیں۔ ماں باپ پہلے بھی کم گو تھے۔ اب اور بھی خاموش ہو گئے۔ بڑی آیا آئیں تو اسی کی فکر میں ہلکان رہیں۔ چھوٹے بھائی اتنے چھوٹے بھی نہیں رہے تھے۔ کچھ بڑے اور سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ناہید سب سے بے نیاز کاغذ، قلم سے

دوبارہ رشتہ استوار کیے بیٹھی تھی۔

مہرین کی شادی تھی۔ وہ تیار ہو کر چلی گئی، رشتے دار خواتین کی اکثریت اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

”تم یہاں؟ تم کیسے آگئیں؟“

”سب لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر حیران کیوں ہو رہے ہیں۔“ ناہید نے کچھ برا مان کر بڑی خالہ سے کہہ ہی دیا۔

”چھوڑو لوگوں کو اور ان کی باتوں کو اور تم کب سے لوگوں کی پرواہ کرنے لگیں۔“ انہوں نے مسکرا کر اپنی بھانجی کو دیکھا۔

”پروا تو خیر نہیں کر رہی، مگر لوگوں کی حیرت دیکھ کر مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔“ ناہید نے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

شاید لوگ اس سے توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اب گوشہ نشین ہو جائے گی۔ مگر وہ لوگوں کی توقعات کو ایک طرف کر کے تقریب میں دندناتی پھر رہی تھی۔

”کیسی ہو ناہید؟“ ساحر اچانک ہی سامنے آئے تھے۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے بروقت خود کو سنبھالا۔ گھبرانے کی حالانکہ کوئی بات نہیں تھی۔ مگر یوں ایک دم سامنے رکنے اور مخاطب کرنے سے وہ کچھ گڑبڑاسی ہو گئی۔

”آپ کیسے ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک؟“ وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بات کر رہے تھے اور پہلے سے زیادہ ڈشنگ اور اسارٹ لگ رہے تھے۔

”آپ کی بیوی سے ملی تھی میں ابھی۔ بہت پیاری ہے۔ بہت اچھا کپل ہے آپ دونوں کا۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرا دیے۔ ”ممانیہ، علوت، مزاج کی بھی بہت اچھی ہے۔ وہ تمہیں بھی منٹوں میں اپنی دوست بنالے گی۔“ ساحر سادگی سے اسے بتا رہے

تھے وہ ہنس پڑی۔

”مجھے خوشی ہوگی ایک اچھی دوست پارک اور دوست کاویسے بھی کل ہے دنیا میں۔“

”میں تمہارے کسی معاملے کو کرید نایا پوچھتا ہوں۔“ اس پر مطمئن تو ہونا؟“ ساحر نے اچانک ہی اس سے سوال کیا تھا۔

”ہاں میں مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی۔“ ناہید نے بے حد پرسکون انداز میں کہتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

”گڈ، ویری گڈ، آئی ویش کہ تم آئندہ بھی خوش رہو۔“ ساحر نے سر خم کرتے ہوئے اس سے اجازت چاہی۔ تو ناہید اپنی میز پر آن بیٹھی۔

داوی کی نمازیں اور وظیفے طویل سے طویل ہوتے جارہے تھے۔ ان کی دعاؤں کا بیشتر حصہ نواسیوں اور پوتیوں کی شادی کے لیے وقف تھا۔

”ہائے ہائے یہ پہاڑی زندگی ایسے کیسے کٹے گی۔“ وہ ناہید کو دیکھ دیکھ کر ہلکی رہتیں۔

”گٹ جائے گی داوی، آپ کی بھی ٹوٹ ہی گئی گی عمر تھی آپ کی جب بیوہ ہوئیں؟“

”دو کم چالیس۔“ داوی کو اندر تھا۔ ”مرے مگر ہمارا تو بڑھاپا تھا۔“ انہوں نے پوٹی کو دیکھا۔

”بڑھاپا؟ داوی آج کل اس عمر میں شادیاں ہوتی ہیں۔“ ناہید نے جتایا۔

”وہ شادیاں کہاں ہوتی ہیں میری بچی، سمجھتے ہوتے ہیں۔“ داوی نے ایک کمری سانس لی۔

جانے تم دونوں ہمیں کیسا نصیب لے کر آئیں؟“ داوی نے پھر ایک آہ بھری۔

”انسان زندگی کے بہت سے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی شادی ناکام ہو جائے تو دنیا اس پر اتنا ترس کیوں کھاتی ہے؟“

نے سوال اٹھایا۔

اس لیے کہ پہلی شادی، شادی ہوتی ہے اس کے بعد ”کھانا“ سمجھوتا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی شادی ہو، بیٹا یا شوہر اس کا ساتھ، اس کی موجودگی عورت کے لیے ضروری ہے۔ تب ہی وہ معتبر بن جاتی ہے۔“ ناہید کے سوال کا جواب اس کی دوست الفین نے دیا تھا۔

”تمہیں بھی جلد یا بدیر اس سہارے کو تھامنا پڑے گا۔“ ناہید نے ناہید کو سمجھایا۔

”میرے لیے ایک تجربہ ہی اتنا کافی ہو گیا کہ دوسرے کے بارے میں سوچنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔“

”پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔“ الفین واضح کیا۔

”مگر ان کا منہ تو ایک ہوتا ہی ہوتا ہے۔“

”اب منطق جھاڑنے بیٹھو تو انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی نصیب مند نہیں کرتے گی ہو؟“ ناہید نے اسے گھورا۔

”تمہیں اس وقت ان کی ہی ضرورت ہے۔“

”کاش کہ کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا۔“

ناہید نے ایک آہ بھری۔

”آئی جائے گا زندگی میں تمہارا چارہ ساز اور تھلا تم گسار۔“ الفین مسکرا دی۔

”مجھے حیرت ہوتی ہے سوچ کر بلکہ غش آنے لگتا ہے کہ تو اس شخص سے چپ چاپ مار کھالیتی تھی؟“

”چپ چاپ کیوں؟ آخری دن ایک ہی بار پھٹ پڑا۔“

”سارے جواب اسی ایک پھٹ میں تھے۔“

”آخری دن مارا نا، پہلی بار ہی مارنا چاہیے تھا اور پھر کی کوئی بات نہیں۔“

”کس کو جانی؟ لے دے کے والدین ہی رہ جاتے

پیارے بچوں کے لئے

پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے

ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہیں۔ اپنا بوجھ انہیں منتقل کر دیتی؟ وہ پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے تھے۔

”تو اتنی اچھی اور سمجھ دار کب سے ہو گئی؟“

”جب سے بڑے لوگوں سے واسطہ پڑا۔“

”کہانیاں لکھنے والے کبھی خود بھی کہانی بن جاتے ہیں؟ نا؟“

”ہاں ایسی کہانی جس میں نہ ہیرو ہوتا ہے نہ ہیروئن بس ولن ہی ولن ہوتا ہے شروع سے آخر تک۔“

”ارے واہ یہ کیا بات ہوئی شروع سے آخر تک ولن ہی ولن ہر کہانی میں ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں تب ہی تو ولن بھی ہوتا ہے ورنہ ولن کی کیا اہمیت؟“

”میری کہانی میں بھلا ہیرو ہیروئن کہاں ہیں؟“
”بعض کہانیوں میں ولن پہلے آ جاتا ہے۔ ہیرو ہیروئن کا انکشاف بعد میں ہوتا ہے۔ اب تمہاری زندگی کی کہانی سے ولن کا کردار ختم ہیرو کا کردار شروع۔“

”تم ہیرو یعنی کہ میں ہیروئن؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہیروئن تو ہمیشہ بہت اچھی اور ڈھیروں ڈھیر خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ میری جیسی بہت سی خامیوں کا مجموعہ ہیروئن نہیں ہو سکتی؟“ اس نے بہت شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ تو تمہارا قلم بیان کرتا ہے نا۔ ڈھیروں ڈھیر خوبیوں کا مجموعہ ہیروئن ہوتی ہے۔ مگر کاتب تقدیر کا قلم انوکھا ہے۔ کس کے لیے کیا رقم کیا گیا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ اب ہیروئن کی تعریف لغت میں کچھ بھی ہو۔ کہانیوں میں ہیروئن وہی ہوتی ہے جسے ہیرو اور اس کی محبت ملے ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“
”تو بس تجھے ہیرو بھی مل رہا ہے اور اس کی محبت بھی پھر تو ہیروئن ہوئی یا نہیں؟“
”تمہاری منطق کے حساب سے تو ہوئی۔“

لیکن۔۔۔
”لیکن ویکن چھوڑ بات دراصل یہ ہے کہ محبت کا

معاملہ کچھ عجیب و غریب ہے۔ کہیں پری پیکر لوگ محبت کو ترستے رہ جاتے ہیں اور یہ گوہر نایاب کسی عام سے فرد کی جھولی میں جا گرتا ہے۔ اور کبھی دنیا بھر کی دولت دیے کر بھی انسان محبت حاصل نہیں کیا ہوا۔ کبھی کچھ گھروں میں رہنے والوں کے بھاگ جال اٹھتے ہیں کیا ضروری ہے کہ خوب صورت یا طاقتور تمیز دار اور سلیقہ مند لڑکی ہی ہیروئن بنے۔ کبھی تیری جیسی بد تمیز، جھگڑالو اور لاپرواہ لڑکیوں کے نصیب میں بھی محبت لکھ دی جاتی ہے۔ نصیب خوب صورت ہو تو سب کچھ خوب صورت ہے کیا سمجھی؟“

”میری تعریف کچھ زیادہ ہی نہیں کر دی؟“ دانت پس کر کہا۔

”میں تو تیری تعریف میں پورے دفتر کے دفتر لکھ دوں۔ مگر مقبول ہونے سے ڈر رہا ہوں۔ (تقبیرہ)
”ہمارے درمیان جھگڑے بہت ہوں گے۔“
بھشن گوئی کی گئی۔

”بہت نہیں ہوں گے۔ کم ہوں گے۔“ اس نے ناہید کو جھٹلایا۔ ”دراصل ہم نے اپنی زندگیوں سے کچھ اور سیکھا ہو یا نہیں ایک سبق ضرور سیکھا ہے۔ برداشت اور تحمل کا۔ تھوڑی برداشت تو کرے گی تھوڑی میں کر لوں گا گاڑی چل ہی جائے گی پھر محبت کی زنجیر ہے نا دونوں کو باندھ کر رکھے گی۔“

”ایک بات سن لو مجھے تم سے لگاؤ یا انیت کچھ بھی کہہ لو وہ ہے۔ لیکن وہ شے جس کا نام محبت ہے ابھی میرے دل میں نہیں آئی۔“ ناہید نے صاف صاف بتایا۔

”آجائے گی جب ہیرو کو محبت ہو جاتی ہے تو ہیروئن کو بھی لازمی ہو ہی جاتی ہے۔ کسی کو کہانی کے شروع میں ہوتی ہے کسی کو درمیان میں اور کسی کو اپنے میں مگر ہوتی ضرور ہے۔“ بڑے اطمینان سے جواب دیا گیا۔

”زندگی ڈائجسٹ کی کہانی نہیں ہوتی۔“
”مگر ڈائجسٹ میں جو کہانی ہوتی ہے وہ تو زندگی کی ہوتی ہے نا؟“ برجستہ جواب ملا۔

”ان کہانیوں میں فینٹسی بھی ہوتی ہے۔ زندگی میں نہیں ہوتی۔“

”تو؟ زندگی ہمیشہ ہی تو ڈل اور بورنگ نہیں ہوتی۔ تھوڑی بہت فینٹسی ہوتی ہے اس میں۔ دیکھنے والی نظر چاہے اب تو خود سوچ اتنے کرانسیس سے گزر کر تجھے خوابوں کا شہزادہ مل ہی گیا۔ تیری زندگی میں فینٹسی ہوتی نا؟“

”خوابوں کا شہزادہ؟ تمہیں اپنے بارے میں اتنی خوش فہمی کیوں ہے؟“

”محترمہ! اگر میں خود کو کسی لقب سے نوازتا ہوں تو دراصل آپ کو بھی یہ اعزاز دے رہا ہوتا ہوں آپ میری مستقبل کی مسز ہیں۔ اگر میں ہیرو تو آپ ہیروئن میں شہزادہ تو آپ شہزادی میں راجہ تو رانی کیا کہیں؟“

”یہی سمجھی کہ بحث کر کر کے دوسرے کو قائل کرنے کی تمہاری عادت اب تک برقرار ہے۔“

”تمہیں چاہئے اور محبت کرنے کی میری عادت بھی برقرار ہے اب تک۔“ گنبدیہ لہجے میں بتایا گیا۔

”کچھ عادتیں اچھی ہوتی ہیں۔ انہیں بدلنا نہیں چاہیے۔“ ناہید نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور طارق بے ہوش ہوتے ہوئے بچا۔

نایا نے طارق کی مرضی اور خواہش سے ایک بار پھر دست سوال دراز کیا تھا۔ لوگوں کو ایک بار پھر چٹخارے وار مہم شروع مل گیا تھا۔ شینہ کی طلاق اور اس کی خلع پہ انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ ناہید کو کسی کے کچھ کہنے کی پروا نہیں تھی۔ اسے سوچ سمجھ کر اپنے حساب سے فیصلہ کرنا تھا۔ مگر وادی کے تبصرے نے اسے کچھ دیر کو تنکے اور سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

”دونوں بہنیں ایک دوسرے سے کٹ جائیں گی۔ کس کا رشتہ بالکل ختم ہو جائے گا۔“ وادی نے کہا۔

”ہم دونوں بہنوں کے درمیان پہلے ہی کون سا گہرا اور مضبوط رشتہ قائم ہے۔ بس ایک رسمی سا تعلق۔ پھر وہ ملک سے باہر ہے۔ اس کے شوہر کافی الجال لگا کر اراک بھی نہیں پاکستان واپسی کا۔ وہ آئندہ چندہ

میں پچیس سالوں بعد مستقل آئے تو آئے فی الحال تو دو تین سال بعد چکر لگاتے ہیں۔ پھر کیسا رشتہ اور کہاں کا تعلق۔“ ناہید حقیقت پسند بن کر سوچ رہی تھی۔

اس نے پہلی بار طارق کو انکار اس لیے کیا تھا کہ اس کے خیال میں چونکہ دونوں ہی مزاج کے تیز تھے۔ اس لیے نباہ ہونا مشکل تھا۔ وہ شادی کے ناکام ہونے سے ڈرتی تھی۔ مگر ہوا کیا؟ جس چیز سے وہ خوف کھاتی تھی وہی چیز اس کے سامنے آئی۔ حالانکہ اس نے آخری حدوں تک اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی تھی۔ اب معاملات اور حالات بہت بدل گئے تھے۔ کسی حد تک تبدیلی ان دونوں میں بھی آئی تھی۔ طارق نے بھی یہی کہا تھا۔

”دیکھ لڑکی! جھگڑے تو ہوں گے۔ بس کبھی تو برداشت سے کام لے لینا۔ کبھی میں خاموش ہو جاؤں گا۔ اسی طرح گزارا ہو گا۔ ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی متحمل نہیں ہے۔ شادیوں کی ہیٹ ٹرک کرنے کا۔“

ناہید نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد فیصلہ کر ہی لیا۔

بہن ہزاروں میل دور تھی۔ اس سے تعلق اور رشتہ نبھانے کا سوچتی تو قریب موجود ماں باپ کو اپنے مستقبل کے لیے کب تک پریشان اور فکر مند رکھتی۔ اس نے اپنا سوچا اپنے والدین کا سوچا اور ہاں کر دی۔

”دنیا والے جو کہیں سو کہیں کچھ عرصے بعد سب چپ ہو جائیں گے۔“

اگر ہم دنیا کی پروا کرتے رہیں تو شاید مسکراتا اور جینا بھی چھوڑ دیں۔“ اس نے سوچا اور ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔

”دیے میری توقع کے برعکس تم بڑی آسانی سے مان گئیں۔“ طارق نے کہا۔

”ہاں تھوڑی سی خود غرض اور بے حس جو ٹھہری۔“ ناہید مسکرا دی۔

سمیرا حمید کوسر

لوگ اسے پھر پھر۔ پھر کہتے تھے اس کے منہ پر کہتے تھے۔ ڈٹ کر کہتے تھے۔ ڈرتے ڈرتے نہیں تھے۔ اس سے کیسا ڈرنا۔ جو جھلی ہو۔ لگی دیوانی سی ہو اس سے کیسی لجا۔ تو لوگ اسے پھر پھر کہتے تھے۔ پورے سرنال کے ساتھ کس کرجم کر آواز لگا کر۔ ردھم سے۔ ترنم سے۔

نام اس کا فرزانہ تھا لیکن چونکہ عام رواج ہے اور خاصا مشہور اور دل پسند رواج ہے تو اس کے تحت وہ جی بھی ہو گئی۔ تو یہ جی تو ہوا عنی اور معاشرتی نام۔ چلیے رواجی بگاڑ ہی سہی۔ اور پھر پھر۔ پھر۔ یہ اس کی خصوصیت، خاصیت۔ مزاجی تہمت۔ ذاتی فارمولا۔ اس کی شخصیت کا حاصل جمع۔

ہنسی کی پہلی قسط ایسے نکلتی جیسے لاہور بھر کے کیوٹر ”پھر“ سے ایک ساتھ اڑے ہوں۔ دوسری قسط ایسے نکلتی (جو پہلی کے ہی عین پیچھے پیچھے چلی آئی) جیسے ان کیوٹروں پر بجلی آن گری ہو۔ اور اللہ ضرور ہی معاف کرے تیسری اور لگاتار قسط ایسے نکلتی جیسے لاہور بھر کی بلیوں اور بلیوں نے ان کیوٹروں پر حملہ کر دیا ہو۔

بچے بچے کو معلوم تھا جی کیسے ہنستی ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کہتے۔

”باجی جی! بس کرویں پھر پھرانا۔“ اتنا سنتے ہی وہ اور لوٹ پوٹ ہو جاتی ایویں سی بات تھی لیکن کافی سنجیدہ بھی تھی کہ مائیں اسے تاکید کرتیں۔

”اے جی! مناسو رہا ہے۔ ذرا قابو میں رہو۔“ مطلب ذرا دھیان سے۔ ہنسانہ شروع کرنا۔

اماں کو تو یاد کرنے سے بھی یاد نہ آتا کہ یہ بیماری اسے کب سے لگی خوش رہتی تھی۔ اور خدا ہی جانے وہ کب سے اتنی خوش رہنے لگی تھی وہ اتنی اندر بند (اوٹ پٹانگ) کب سے ہوئی کئی سو لوگوں میں بھی اماں اسے پیٹ ڈالتی تھیں۔

”چپ کر جا لگی۔ دیکھ سارا زمانہ ہنس رہا ہے۔“ دس بارہ قواروں کا ایک اور بڑا فوارہ نکلتا۔ اماں دوپٹے کا گولہ بنا کر اس کے منہ میں ڈھونس دیتیں۔ ذرا نہ رحم کھاتیں۔

”کوئی جن دن تو نہیں۔؟“ اماں کی دور کی چچی نے پوچھا۔

”جن ہی ہوتا۔ جان تو چھوٹی۔“

”دم دم کرواؤ۔“

”بہتیرے کروائے۔“

”کملی مگلی لگتی ہے۔ لگتا ہے خاندان سے اس کا رشتہ نہیں لینا تمہیں۔“

”اپنے باپ سے بھی مار کھائی ہے۔ پر منحوس ماری کی ہنسی ہی قابو میں نہیں۔ جی جی مذاق اڑا جاتا ہے اس کا۔“

اس مکالمے کی نوبت ملتان والی پھوپھو کے بڑے بیٹے کی ڈھولک میں آئی تھی۔ گھر بھر اڑا تھا۔ کھلی وسیع چھت پر ڈھولک بجائی جا رہی تھی۔ لڑکیاں خوب چمک رہی تھیں۔ اور اپنی یہ جی بھی۔ ایک لڑکی نے چٹکلی پھوڑا۔

”بڑے بڑے بیاہ گئے۔ پیارے اللہ جی ہمارے والے کدھر کو گئے؟“ قہقہوں کے مرغولے آسمان

جی اڑے۔ پھر پھر بھی گئے اور اپنی یہ جی۔
دھولک بجانے والی پڑوس کی لڑکی نے ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ لیا۔
چٹکے والی نے گردن موڑ کر دھولک کی ہنسنے لگاؤ۔ اس پڑوس والیوں نے پھوپھو کی طرف دیکھا۔ پھوپھو جی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اماں نے پڑوس کر گھٹ کر اسے اٹھایا اور ساتھ لے کر پیچھے چلی گئیں۔ پھر دھولک کی ذرا دیر سے جی۔ اس دوران بڑی سرگوشیاں

انہیں۔

”کون ہے یہ رضیہ تمہاری؟“
”لاہور والے چھوٹے ماموں کی بیٹی۔“ رضیہ چڑھ گئی۔

”یا گل ہے کیا؟“

”ہم کیا جائیں۔ پہلے تو نہ تھی۔“

”تو یہ ایسے ہنسا۔؟“

”ہماری جانے بلا۔“



گلانے، سرے گائے جانے لگے۔ اماں ساری شادی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ سب طرح طرح کے سوال کرنے لگے، لاہور والوں کی توخیر تھی۔ سب ہی اس کی عادت سے واقف تھے بس یہ دور دراز کے رشتے دار ہی حیران ہوتے پھر وہ بھی عادی ہو جاتے۔

”جنگلی پرگی پھر پھرتی جی کے۔“

اماں کہتیں ”یہ بیماری ہوتی ہے۔ ہنسنا تو ہنستے ہی رہنا۔ رونا تو روتے ہی رہنا۔ جیسے ہچکی کہ جان لے کر ہی ملے۔“

”یہ ہنسی بھی جان لے گی کیا۔“ چھوٹی عذرا ہنس کر بولی۔

”توبہ ہے۔۔۔ اب تو اللہ نے نسل بننے بنانے ہی چھوڑ دیے شاید۔“ اماں موت کے تذکرے پر ہول مچیں۔ ان کی پیاری بچی جی جی ہنستی ہے ہنستی رہے۔ جان کیوں جائے اس کی۔

”خود ہی تو کہا ہے اماں!“

”ارے جا۔۔۔ میں نے کچھ کہا۔ تو کچھ سمجھی۔“

”پاچی زندہ تو رہے گی نا۔۔۔؟“ عذرا اب ملنے والی نہیں تھی۔

”اس کا تو پکا ہے۔ تیرے لیے دعا کرنی پڑے گی۔“

اماں نے جوتی اٹھالی۔

جی جی کی سہیلی کی شادی ہوئی تو وہ روئی وہ روئی جیسے سہیلی بیابانی نہ گئی ہو جل کر مر گئی ہو خدا نخواستہ۔ اس کے گھر والوں نے بھی کہا۔

”اے جی جی! اتنے بین نہ ڈال۔“

اور جی جی ”وہ چلی گئی۔ مجھے چھوڑ گئی۔ وہ لے گئے۔“ کہہ کہہ کر روئی رہی۔ یہی دونوں سہیلیاں چھت مچھ کر ایسے ایسے جناتی قہقہے پھر پھراتیں کہ درو دیوار ہنسا کرتے۔

خیر دلیمہ ہوا اور دلہن سہیلی گھر آگئی اور پھر قہقہوں کی وہ قسم نکلی کہ بڑے بوڑھے کہہ اٹھے۔ ”یہ کیا بے غیرتی ہے چپ کرواؤ انہیں۔“

انہیں چپ کروانے کی ناکام کوشش کی گئی۔

یہ وہی سہیلی تھی جس میں جی جی کی پور پور جان تھی۔ نو عمری میں کہا کرتی تھیں ”ایک ہی گھربیاہ کر جائیں گی۔ ذرا سالوں بعد پھر یہ بات کسی نے ان کے منہ سے نہ سنی۔“

سنت مگر کے پرانے نقوش کے گھر تھے۔ بہت جگہوں سے ساتھ ملے ہوئے تھے، چھتیں تو انوار ایک ہی تھیں۔ کبھی بالکنی پھلانگ کر، کبھی کھڑکی سے پانچواں لکڑی کا زینہ اتر کر اور کبھی چھت سے پھلانگ کر وہاں جایا کرتی اور خوب ہی جایا کرتی۔ ایسے کہ چائے چولہے پر رکھی ہے اور ابال آنے تک وہاں۔۔۔ پریش پھر لگا ہے سیٹی بولنے تک وہاں ناشتا کیا۔ چکر لگا آئے شام کا تفصیلی اعلان پھر الگ سے۔ درمیان کے بھائی حادثاتی پھیرے الگ سے۔

اماں پہلے تو بہت بڑبڑائیں پھر جب اسی سے اس نے سینا پرونا سیکھ لیا۔ ہزار طرح کی کڑھائیاں۔۔۔ طرح طرح کے ڈیزائن کے کپڑے اور چھوٹے بچوں کے تو ہزاروں طرح کے کہ خالہ ماموں کے سارے بچوں نے اسی کے ہاتھوں کے سارے کپڑے پہنے۔ لینگے شرارے، فراکیں اس نے سب بچیوں کو خوب سی سی کر دیں تو پھر یہ اعتراض اٹھ گیا کہ وہ ہر وقت دھنی کے یہاں تھی رہتی ہے۔ دھنی نے ہی اسے حلیم بنانا سکھائی۔ ہر رہ تک جی جی نے اس سے سیکھ لیا۔ تو ایسی استاد سہیلی پر اتنی جانثاری اماں کو خاص نہ کھلی جہاں اس نے اسے سارے گن سکھائے وہاں پھر پھرتا جی جی سے سیکھ لیا۔ خیر اس فن میں دونوں ہی استاد نکلیں۔ مجال تھا کہ کوئی ایک بھی بات کھا کر پیچھے نہ جاتا جی جی اور اپنے خاندان میں مشہور تھی تو دھنی اور اپنے خاندان میں۔

دھنی بیابانی گئی پھر بھی جی جی وہیں پائی جاتی، چند ماہ گزرے سلیم نے کھڑکی بند کروا دی۔ بالکنی کی طرف یہ بڑے بڑے لکڑی کے تختے لگوا دیے۔ چھت کی دیواروں پر تین تین روے چٹائی کروائی اور کالج لگوا دیا۔ جی جی خوب ہنسی۔

”یہ دیواریں۔۔۔ یہ بندشیں۔۔۔ یہ دیواریں۔“

نئی پائی ہنستی جاتی۔

اماں نے دھنی کے جڑے ”اب کیوں ہنس رہی ہے۔“

”بھائی بالکنی بند کروا دی۔ کھڑکی بھی۔ اور وہ بہت۔“

”اب تیرے کرتوت دیکھ کر کیا سب۔۔۔“

اماں۔۔۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتیں۔ یہ اتنی بچپائی کس کام کی۔؟ وہ پھر دل لگا کر ہنسی۔

”اوندھی کھوپڑی! کم ذات ہیں وہ۔ یاری دوستی کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ باقی کا خناس نکال دے۔“

یہ دھنی (مصنوعی قلعے) بنانے چھوڑ دے۔

”لو نکال دیا خناس۔ خناس ہی تو نہیں گھسنے دیا۔“

دھنی میں۔۔۔ دھنی بنا میں ہمارے دشمن۔ ذات صرف خدا کی۔ انسان کی ذات اس کے اعمال۔“

دھنی سے پھر کبوتر اڑے۔

”کتنی سمجھ دار ہوں میں اماں۔ اتنی جلدی اتنی ابھی باتیں سیکھ گئی۔ دیری نہ کرو۔ سیکھ لو مجھ سے۔“

وہ پھر پھرانے لگی۔

بڑے دن گزرے، ڈھنگ کا رشتہ ہاتھ آیا نہ کھڑکی بہت کی چٹائی میں دراڑ آئی۔

”یہ تیرے انار کلی کے چکر بہت بڑھ گئے ہیں؟“

اماں اس پر نظریں گاڑے پوچھ رہی تھیں ”لے کر بھی کچھ نہیں آتی۔“

”کوئی کپڑا جو تاپسند آئے تو لاؤں۔ دوبار تو خالہ کے لیے گئی۔ ان کی منی کے جوتے کامپ ٹھیک نہیں آتے۔“

”منہ منی سے جوتے بھی تو ہی لائی ہے اور ماپ بھی تو ہی غلط لاتی ہے۔ جی میرے قہر سے جی جی رہ۔ ایک بار گردن جو پکڑی تو انار کلی والے ہی تماشا دیکھیں گے۔“

”جو تماشا لگے تو ایسے ہی سی۔“ وہ ہنسی۔

”تیری اس ہنسی کا گلا تو میں دباؤں گی کسی دن۔“

دھیان سے رہا کر۔

”اماں ہو کر یہ کرو گی؟“ پھر پھراتے کبوتر زمین پر آکر گرنے لگے اس کے انداز سے ایک ایسی ہوک نکلی کہ

اماں چپ اسے دیکھے گئیں۔

سنت مگر، کرشن مگر سے انار کلی جانا کون سا پہاڑ کھودنا تھا، یہاں ارادہ کیا وہاں پہنچ گئے تو یہ ارادے روز کیے جاتے، دن میں کئی کئی بار کیے جاتے۔ قرب و جوار ہی میں سب آباد تھے۔ چھوٹے بڑے پانچ ماموں۔۔۔

تین خالائیں، اماں کی خالہ زاد بہنیں۔ ان بہنوں کے آگے پیچھے کے رشتے دار۔ اور اودھر کے چچا، چچی۔

رشتے کے نانا، نانی، دادا، دادی۔ بہت رشتے دار تھے کہ صبح ملنے نکلو تو اگلی صبح واپس آؤ۔ کچھ ایک ہی گلی میں رہتے۔ کچھ ایک ہی بلڈنگ میں اوپر نیچے۔ کچھ آگے پیچھے کی چھوٹی بڑی سڑک پر۔

جب تک دھنی بیابانی نہ گئی۔ وہ مشکل سے ان سب رشتے داروں کو اپنی شکل دکھاتی، دھنی گئی تو وہ ان سب کو سلام کرنے نکلتی اور ایسے نکلتی کہ اماں کو جا کر ڈھونڈ کر اسے لانا پڑتا۔

وہ کسی ایک گھر جاتی۔ اسے سلام کرتی پھر اودھر اودھر جھانکتی۔ اگلے گھر نکل جاتی۔ تین چار جگہ حاضری لگوا کر بھاگ بھاگ بڑی سڑک تک آتی۔ بس اسٹاپ سے بس میں بیٹھتی اور آٹھ دس منٹ میں انار کلی پہنچ جاتی۔ دو سو۔ ڈھائی سو جوتوں کی بیل والے کے پاس پہنچتی۔ اور آدھے گھنٹے میں واپس آجاتی۔

اماں کو شک ہوتا۔ روز ہی ہوتا، کسی خالہ، ماما، نانی سے پوچھ لیتیں۔

”ہاں آتی تھی۔“ خالہ کہتی۔

”ارے ہاں نا! چائے پی کر گئی۔ برتن بھی دھو گئی پھر نوشاد کے گھر چلی گئی۔“ ماما بولتی۔

”کیا ہوا آپ؟“ کوئی ایک پوچھ لیتا۔

”ہونا کیا ہے۔ سلیم غصہ کرتا ہے۔“

”کیوں کرتا ہے غصہ۔ رشتے داروں کے گھر نہ آئے گی تو کہاں جائے گی پھر بیابانی جائے گی کہاں آنے

159

اکتوبر 2013

www.PAKSOCIETY

158

اکتوبر 2013

www.PAKSOCIETY

وے گا کوئی۔ سلیم کو نت نئی سوچتی ہے۔ اپنے گریبان میں نہیں جھانکتا۔ اس چندال کو چمن سے آکس کریم کھلا رہا تھا۔ کالے منہ والی۔ ہونہ۔! ”میری تو سنتا ہی نہیں۔“ اماں کو نئی فکر لگی۔

خیر ایک دن اماں نے اسے اتار کھلی جالیہ۔ سیل میں رکھی چوتیاں پہن پہن کر دیکھ رہی تھی اور ایسے ہنس رہی تھی کہ اس پاس والے عجیب سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اماں نے کمر پر زور سے چٹکی بھری۔

”یہ تو خالہ شکیلہ کے گھر کھڑی ہے نا۔“ اس نے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ضد تو وہ کر رہی ہیں اگر وہ اسے سیدھے راستے سے چلنا کریں تو وہ اٹنے راستے کی طرف نہ جائے۔

”سلیم تجھے جان سے مار دے گا۔ اس دو پیسے والے کے ساتھ تجھے کبھی نہیں بیاہے گا۔ کباڑیے ہیں وہ۔ بھول گئی۔ تیرا باپ کتنا ہنستا ہے ان پر۔“ اس نے وہ قہقہہ بلند کیا کہ اماں شرمندہ سی ہو گئیں اس کے قہقہے میں بڑی وضاحتیں تھیں۔ بڑے زہریلے طنز تھے۔

”اماں! مجھے کتنی ہو۔ میرے کرتوت برے ہیں۔ بھلے مانس انسانوں کو گالی دے رہی ہو۔ ان کی حلال کی کمانی پر لعنت بھیج رہی ہو۔ ان کے پیٹے سے انہیں لوقت دے رہی ہو۔ اماں! اب تو مجھے ہنس لینے دو۔“

اماں نے اسے در فٹے منہ کیا۔ اس کا گھر سے جانا بند کیا۔ جانا ہوتا تو اپنے ساتھ لے کر جاتیں۔

چھوٹی عید، بڑی عید، شبِ برأت، عیدِ میلاد النبی، محرم میں سب بڑے گھر (بڑے ماموں) کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ یہ بڑا تین منزلہ گھر تھا۔ ایسے موقعوں پر گھر بھر جاتا، اماں فچی کو ڈھونڈتی رہتیں۔ پہلا چوبابہ، دو سرا، تیسرا۔ کہاں گئی۔ فچی۔

”یہیں کہیں ہوگی۔“ کوئی کہہ دیتا۔ وہ کہیں سے نکلتی نظر آجاتی۔ ہونٹوں میں ہنسی

دہائی ہوتی۔

”کہاں تھی تو؟“

”یہیں تو تھی۔“

”یہیں کہاں۔؟“

”وہ ادھر چوبارے میں۔“

”ادھر ادھر کے سب ہی چوبارے دیکھ کئی تھیں۔“

”وہیں تو تھی اماں۔“ وہ کہہ کر کھسک جاتی۔

پیاز، لہسن، اورک، نمک، مرچ۔ آلو، دال، چاول۔ کچھ بھی کم پر جاتا وہ فوراً حاضر ہوتی۔

”لاؤ عیس لے آؤں جھٹ بازار سے۔“

”تندور سے روٹی لگو لاؤں۔ نان لے آؤں۔ اچھی لائی رہی۔ بس آدھ میر۔“

”آپ کے تو دو پیٹے بھی پیکو نہیں ہوئے۔ نہیں۔ دس منٹ کا تو کام ہے۔ یہ تو ہے بازار۔ ابھی کروالائی ہوں۔“

”خالہ زہرا! پیٹوں کے بغیر جوڑا کہاں بنے گا۔ ساڑھی پر تو جوڑا ہی بنائیے۔ میں ابھی پیٹوں کا پتالے کر آئی۔“

اورک، لہسن، نمک، مرچ، آلو پیاز۔ وہی گوشت، انار کلی سے آرہے ہوتے۔ روٹی نان بھی وہیں۔

دس روپے کا پیٹوں کا پتا بھی تیس روپے کا گریا کروہیں سے لایا جاتا۔

وہ بھاگ کر جاتی سناپ کر آتی۔

شادی بیاہ۔ سالگرہ، بسم اللہ، امین، میلاد، سوال، چالیسواں۔ مرگ، جلم۔ جہاں کوئی کی نہی

ہوتی فچی بھاگ بھاگ انار کلی سے پورا کرتی۔ سنت، منگوانے والے کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ دو گلو تین

صرف انار کلی سے آیا ہے۔ اور یہ چھٹا تک بھر لایا اور سوپوں کا ایک چھوٹا پیکٹ بھی۔ حد تو یہ کہ وہ

جوڑوں کے ساتھ کی دو فلکھیاں بھی وہیں سے آتا

اللہ اللہ فچی۔

☆ ☆ ☆

الحقنا۔ حقیقت کھلی جب دس روپے کا لاسٹک

لے گئی اور واپسی پر دھڑکی گئی۔

دور کی نوے سالہ پرانی نے کہا ”بیاہ دو اسی سے۔“

”نہیں۔“

”اور کسے کہتے ہیں شھیانا۔ مسلمان بچہ ہے۔“

”ہو نہ بیاہ دو۔ چولہے آگ نہ گھر پانی۔“

”اے بی بی۔ پرست نہ جانے جات کجبات اتنا سمجھ لو پانی کو پانی رہنے دو۔ آگ نہ بناؤ۔ یا وہ جل جائے گی یا تمہیں جلا مارے گی۔ میرے سر کی

ہانڈی کھو اور میری زبان اپنے ہی پاس رکھو ٹانی۔“

”اے فچی! بات سن۔ سیدھی ہو جاو نہ اپنی ہان سے جائے گی۔“

اماں آتے ہی اسے سنانے لگیں۔ وہ طوطوں کے

جیسے کے پاس کھڑی سیٹی مار مار کر اہیں ہسلا رہی تھی۔

”خاندان میں رہنا ہے مجھے۔ کباڑیوں کے لیے کوئی راضی نہیں ہوگا۔“

”میں راضی ہوں۔“ کہہ کر اس نے پھر سیٹی ماری

طوطے بھی جواب میں مارنے لگے۔

”اپنے باب بھائی کے ہاتھوں سے بیچ بھی گئی تو

تیرے چاہے مائے نہیں چھوڑیں گے تجھے۔ غیر

ت کے لیے مان بھی جائیں تو ان کی اوقات دیکھی

ہے۔ سنو۔ ان کے گھروں کے میلے چانتے چانتے تو تو

اس کے پینڈوں سے ہی جا گئی۔ کباڑیوں نے کباڑ

وہ سیٹی بجانا بھول گئی۔

دھنی کے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی تھی۔ رات کو

اس کا اپلا لاسٹک کے بڑے بڑے پھیلے مچن میں الٹ

دستا اور پھر سب مل کر پھیلے لوبا، پلاسٹک، کتا، کتا، الگ

الگ کرتے۔ وہ کتنی ہی چیزیں اٹھا لیتی۔ کبھی

پلاسٹک کی ٹوٹی پھوٹی ٹرین۔ کبھی رنگ لگے چھری

کانٹے۔ کبھی گڈا گڈیا۔ کبھی تصویروں سے الی

کتابیں۔ چاہے نے کبھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ چیز

سو کی ہوتی یا روپے کی، وہ پلٹ کر نہیں دیکھتا تھا کہ اس

نے کیا اٹھا لیا۔ ہاں ان ہی چیزوں نے اسے خرید لیا

۔ اماں کیسے سمجھتیں کہ کس نے کیسے اسے خرید لیا

بھلا یہ انسان اتنی جلدی بکتے پر تھوڑی آتا ہے۔ کوئی

جھپکار ہوتا ہے تو ہی بکتا ہے نا۔ ورنہ تو تخت و تاج پر

بھی نہیں بکتا۔

”ڈولی نہ کمار، لی بی بی بیٹھی ہیں تیار۔“ اماں

بریدوائیں۔ منڈ پر دو کوئے بیٹھے کائیں کائیں کر رہے

تھے۔

ان پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے ہنسی کہ ذرا دیر بعد اماں کو

ڈر ہوا کہ وہ صدمے سے پاگل ہو گئی ہے۔

”ہائے میری بچی۔ مرجائیں منحوس مارے ساتھ

”کافر ہوئی ہے کم بخت۔! جانوروں کو جنت میں لیے جا رہی ہے۔“

”انسانوں نے تو ارادے ہی بدل لیے ہیں نا۔ کوئی تو جائے پھر۔ کوئی تو جائے۔“

سلیم کہیں آگے پیچھے کھڑا نہ رہا تھا۔ اس بار اس نے اس کی چٹیا ہی پکڑ لی وہ مار ماری کہ سب ہی ماموں چاچے اکٹھے ہو گئے اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی منہ سر کا الگ عالم تھا۔

”تم کوئی رشتہ کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔“ ماموں بھڑکے۔

”پچاس تو دیکھ چکی اب تک۔“

”تم سے تو نہیں ہو گا پھر یہ۔ کل میں چھٹی کر رہا ہوں میرے ساتھ چلنا۔ رات سے دن نہ کرو اور قصہ ختم کرو۔ خبردار سلیم اچو تو نے دوبارہ میری جی کو ہاتھ لگایا۔ بچی ہے سمجھ جائے گی۔ نادان ہے ورنہ تو اس جمشید کے منہ پر تھوکے بھی نہ۔“

سلیم نے بچی کو تو ہاتھ نہ لگایا۔ بچے کو نہ چھوڑا۔ دوست لے جا کر انارکلی بازار میں وہ تماشا لگایا کہ دو کانداریوں کو پولیس بلانی پڑی۔ اور دو رتک وہ رش لگا جیسے تعزیر نکل رہا ہو۔ تین دن بعد ماموں سلیم کو تھانے سے لے کر آئے۔ ان تین دنوں میں خاندان والے چیل کو بے اس کی بونی بولی نوپتے رہے۔

جمشید کی ماں بھی آئی۔

”تو ہمیں بہت پیاری ہے لیکن جمشید سے زیادہ نہیں۔ یہ رشتہ نہیں ہو گا۔ خون خرابا ضرور ہو گا۔“ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

جمشید کو زبردستی کراچی بھجوا دیا۔ خود وہ سراگھر ڈھونڈنے لگے۔ اماں ابائے آگے بھی ہاتھ جوڑ گئے۔

”آپ کی بچی آپ اس کے مائی باپ ہم کون ہیں۔“

کرشن نگر کے سار کے سامنے ان کی کیا حیثیت۔۔۔

بچہ بچہ۔ بندہ بندہ اسے سار سے شادی کے نواد گنوا گیا۔ اس کی نادانی اسے سمجھا گیا۔ اسے پاگل نادان کہہ گیا۔ اسے چپ لگی تو پھر نہ ٹوٹی نیچے اسے جی

بادی پھر پھر کہنے کے لیے ترس گئے۔

”ہو جائے گی ٹھیک۔“ چھوٹی خالہ نے کہا۔

”آج رو رہی ہے کل بٹے گی۔“ مائی پولیس۔

”بیابا کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے آپا سوسائٹی پیلی رہے گی۔“

سلیم تک نے چاہا۔ مجنونانہ ہی سہی وہ ہنسنے تو ماموں نے کہا ”خبردار جو کسی نے اب اسے پھر کہا۔ اس کے سر ایوں تک یہ نام نہ جائے۔ ایسے ہی جھڑک رہے تھے۔ بڑوں چھوٹوں کو۔ بہ نیت تو جی آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔

وہ تو مٹی کی وہ ہانڈی بنتی جا رہی تھی جسے سونے چاندی سے بھر کر زمین میں دیا دیا جاتا ہے۔ اور پھر۔ اور پھر دبانے والا بھول جاتا ہے کہ ہانڈی کہاں پڑی تھی۔

ہائے یہ لڑکیاں۔ ہائے یہ ہانڈیاں۔

کچھ زمین کے اوپر لا کر بھول جاتے ہیں۔ کچھ زمین میں دبا کر۔ یہ بھول جانان کے نصیب میں بار آتا ہے۔ ضرور آتا ہے۔

ڈھائی مر لے گا گھر دھنی ہو رہے بیچ گئے۔

اماں نے کہا فکر نہ کر۔ دھنی کو ضرور بلاؤں گی تیری شادی میں۔ تیری مہندی اٹھن وہی کرے گی۔ اسے گھر میں بلا کر رکھوں گی۔ دے دلا کر بھیجوں گی۔ تیری سہیلی ہے وہ۔ فکر متی کر۔ وہ ضرور آئے گی۔ جانتی ہوں تیری جان ہے اس میں۔“

ماموں نے خاص۔ حیدر آباد آرڈر دے کر کراچی جوڑیوں پر ”فرزانہ جمیل“ لکھوایا۔ اسے لا کر پل دکھایا۔ چھوٹی خالہ نے ایک جاننے والے سے دکان سے ساڑھیاں اور چاندی کی پازیں منگوائیں۔ سلیم پشاور باڑے سے آدھا جینز خرید کر لایا خاص شادی قالین۔ شیر چیتوں کے گمبل۔

اماں نے عذرا کے حصے کا رکھا زیور بھی اسے دے دیا۔ عذرا تو بڑے ماموں کے بیٹے سے چاہی جائے گی۔ کچھ نہ بھی دیا تو خیر ہے۔ سب بس جی کو دے دیا جائے۔ سب جی کو ہی دیا جائے لگا سب

ملان لا کر دے دو کمروں میں رکھنا شروع کر دیا۔ اس سے چند سال چھوٹی لڑکیوں کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

”بچی کے لیے اتنا کچھ۔ سب کچھ ہی جی کے لیے کیوں نہ ہو؟“

خالہ ماماں ہنسیاں آتیں۔ ایک ایک چیز کی مدح بڑائی کرتیں۔ ایسا ہے یہ ویسا ہے۔ برتن کپڑے۔ کپڑے دیکھتیں۔

”نیکال دو آپا۔ یہ ہمیں جے گا ان کے خاندان میں۔ کسی نہ کسی چیز کو اٹھا کر کہا جاتا۔“

”ہو اماں! سن کو دو کڑے بہت ہیں۔“

”یہ مردانہ شالیں۔ کہاں سے منگوائیں۔ ذرا اچھی والی منگوا لیتے۔ سلیم سے کوونا ایک چکر اور لگا لہاڑے کا۔“

اس کے جینز کی دھوم بڑی خاندان بھر میں۔ مجال ہے جو کوئی کی رہنے دی گئی ہو۔ سب جتے ہوئے تھے ہزار ہزار بار چیزیں پرکھتے تھے۔ رات رات بھر ہوتے تھے۔ ان کو بازار سے کیا کیا لانا ہے۔ کیسا لانا ہے جس بازار کو جانا ہے۔ کس راستے سے جانا ہے۔ یہ سب ہی بے نا لگ جانے دو۔ بچی کی ناک بن جائے۔ کراہت نہ کر جائے۔ آج ماں باپ مائے چاچے زندہ ہیں۔ دے رہے ہیں۔ کل کونہ رہیں تو کون دے گا۔ سب میرے بجوا ہر سونا چاندی ریشم کچھاب اکٹھا کر دیا جائے۔ قارون کے خزانے کی چابیاں مل جائیں تو وہ بھی خوشی سے۔ بدے دل نہیں تھے ان کے جو تمام سامان دینے کو تیار تھے۔

آپا رکھی گئی۔ اماں اس کا ہاتھ کھینچ کر بڑے دکان کمروں میں لے گئیں سامان کھول کھول کر رکھا تاکہ وہ دیکھ لے۔ دیکھ کر خوش ہو لے۔ خوشی سے خوش قسمت جان لے خود کو۔ وہ ایک ٹک ملان کو دیکھے گی۔

”اتنا بھر کر رہا ہوں مجھ سے؟“ بہت دیر گزری پھر اس نے پوچھا۔ اماں جواب تو ضرور دیتیں اس کے اندر لڑکھانہ انھی تھیں پر چپ رہیں۔ پندرہ دن بعد

نکل تھا اس کا۔



”پانچ لاکھ سکے رائج الوقت قبول ہے۔“

بچی نے پہلی بار نظریں اٹھا کر کمرے میں موجود ایک ایک شخص کو دیکھا۔ رجسٹرار اس کی گود میں رکھا تھا۔ یہ کیا ڈھونگ ہے۔ اسے ہنسی آئی۔ وہ قبول نہیں کر رہی پھر بھی کر رہی ہے۔

”قبول ہے؟“ نکاح خواں کو پھر سے پوچھنا پڑا۔ ذرا پیچھے کھڑے ماموں گڑبڑا س گئے۔ یہ بے وقت کی ہنسی۔ کمرے میں موجود پندرہ بیس عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بڑی مائی نے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ کوئی سرالی عورت ہی اندر نہ آجائے۔

”فرزانہ بہت جمیل احمد۔! نکاح خواں پھر سے دہرانے لگے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور پھر پھرانے لگی۔

”فرزانہ۔! ماموں گرے۔“

”جی ماموں۔! اس کی آنکھوں کا کاجل پھیل

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سنگھڑی

آہستہ ریاض

قیمت - 250/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اندر بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

چکا تھا۔

نکاح خواں سر اٹھائے اور دھڑکیہ رہے تھے۔
”وہ سخت کروٹے۔۔۔ جلدی کرے۔۔۔“

”اچھا ماموں جی! جیسی آپ کی مرضی۔۔۔ اچھا اماں جی۔۔۔ اماں جی! خالہ جان۔ اچھا جی ٹھیک ہے ماما جی۔۔۔ جی اچھا۔“

”فرزانہ۔۔۔!“ ماموں پھر دبی دبی آواز میں گرجے۔
۔۔۔ ماما نے آکر ماموں کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔
”اماں! بائیں بیٹھی خالہ ماما نے کمر اور شانوں پر ہاتھ سے زبرداری پکڑی۔“

”ایسے نہیں کھراتے فرزانہ!“ زہرہ خالہ بولیں۔
”ہاں جی خالہ جی ٹھیک کہتی ہیں۔“ ہنسی کا فوارہ

نکلا۔

”آپ بھی کہیے نامولوی صاحب جی۔۔۔!“

”فرزانہ بنت۔۔۔“

”بعوض ماں باپ کی عزت خوشی مجھے قبول ہے۔“

اس نے ایسی آواز میں کہا جو آواز کسی نے آج سے پہلے اس کے حلق سے نکلتی نہیں سنی تھی ذرا کونے میں کھڑی اماں کانپ گئیں۔ بیک وقت سب نے جیسے شیش ٹاگ دیکھ لیا۔

”بعوض خاندان کی عزت غیرت مجھے قبول ہے۔“ انداز اور آواز پہلی سی ہی تھی۔

”بعوض سونا چاندی ذات برادری نام۔۔۔“
ماموں نے اس کی گود میں سے رجسٹر کھینچا۔ اور مولوی صاحب کو لے کر جھٹ باہر نکلے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ الٹا۔
کاہل پھیلی آنکھوں سے ایک نظر سب کو دیکھا۔
”میں ہنس لوں اماں جی۔۔۔“

اماں جو اس کے نکاح کے بعد رونا چاہتی تھیں ششدر کھڑی اس کے انداز پر ساکت ہو گئیں۔
”اجازت ہو تو میں ہنس لوں؟“ اس نے مشترکہ

سب سے پوچھا۔
اسے ہاں کہنے کی ہمت کون کرتا۔ اسے ناں کہنے

کا خیال کسی کو نہ آیا۔

وہ ایسے پھر پھرتی جیسے لاہور بھر کے کبوتر ایک ماڑی اڑے ہوں اور یکدم ہی بالکل فوراً ہی ان پھر پھرتے کبوتروں پر بجلی آن گری۔۔۔ خالہ ماما چابی نے ایک دوسرے سے نظریں چرائیں۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ دیکھو وہ ہنس رہی تھی۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔

عذرا کانپ سی گئی۔ اماں کی طرف دیکھا۔
”اماں؟“ اتنا ہی کہہ سکی۔ اتنا ہی پوچھ سکی۔

اس کی آواز کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ لیکن اس پنڈال تک نہیں جاسکتی تھی جہاں اس کے خاندان کے بڑے۔۔۔ اس کے بارانی اور اس کا دوا بیٹھا تھا۔ وہ وہاں تک بھی نہیں جاسکتی تھی جہاں کوئی معاشرتی خواندہ بیٹھا لکیریں اور خانے پہنچ پہنچ لوگوں کو اوپر اور نیچے رکھ رہا تھا وہی خواندہ جو عزت و شرافت کو سب سے نچلا خانہ بھی نہیں دیتا۔ ہاں ہاں وہی خواندہ۔ ہاں ٹھیک وہی جو ذات و مرتبے کو۔ ہاں ٹھیک وہی۔

وہ اس خواندہ پر ہنس رہی تھی۔ نہیں۔ وہ خاندان بھر پر ہنس رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ قبول کر چکی ہے۔ کس وہ اسی لیے ہنس رہی ہے۔

خالہ زہرا نے اپنی آٹھ سالہ بچی کو خود میں بھینچ لیا۔
”کیوں؟ جانے کیوں۔۔۔ وہ ایسا کر گئیں بس۔۔۔“
”بچی۔۔۔!“ اماں کی لرزتی آواز اس تک آئی لیکن وہ سن نہ سکی۔

ہر ایک کے ساتھ اس کی پھر پھر اہٹ لپٹ گئی۔
اور پھر۔۔۔ پھر اڑ کر جانے والے سب ہی پرندے جلے پروں کے ساتھ اس دھرتی پر آگرے جواب ”اوسر“ (بجھر) ہو چکی تھی۔ اوسر کر دی گئی تھی۔

اب یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں رہی کہ پھر کسی بچی کے منہ میں دوپٹا ٹھونس کر اس کی ہنسی کا گھا گھونٹنے کی نوبت نہیں آئی۔



”اوئی ماں۔!“ واوی کی لاشی اچھی طرح اس کی کمر سینک گئی۔ وہ جو درخت پر بندر کی طرح لٹکی ہوئی تھی نیچے گرتے گرتے نیچی۔
”اتر آ کھنت! اتر آ۔ کتنی دفعہ کہا ہے کچے آموں کا تاس نہ مارا کر۔ پر نہ جی! اس کان سے سنے گی۔ اس کان سے نکال دے گی۔“
واوی کی لاشی کی پہنچ سے دور وہ اب دو ٹہنیاں اوپر چڑھ کے بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں ادھ کھایا کچا آم تھا۔
”آج تو نے کچے آم اپنی اس دھماچو کڑی ٹیم کو کھلائے تو دیکھنا! کسے آج تیری ٹانگیں توڑتی ہوں۔ میں کہتی ہوں۔ اترتی ہے یا بلواؤں تیرے باپ کو دکان



سے وہی آکر تجھے اتارے۔“
واوی کی اب کے دی گئی دھمکی کچھ کام کر گئی۔ اس نے ادھ کھایا کچا آم نیچے پھینکا۔ مگر دو ٹہنیاں نیچے اتر کر رک گئی۔
”ایک شرط پر اتروں گی۔“ اب کے مزید واوی کا کلیجہ جلایا۔
”کیا شرط ہے پھوٹو منہ سے۔“
”مارس گی تو نہیں مجھے؟“ معصومیت بھرا سوال واوی کو آگ ہی لگا گیا۔
”نہیں ماروں گی۔“ الفاظ اور تاثرات ایک دوسرے کے مخالف نظر آئے۔
”کھائیں شاہو کی قسم۔“ وہ مزید پھیلی۔
”نام مت لے اپنی دو گز زبان سے اس غریب کا۔ کاٹ کے پھینکیں۔“ رگھو دوں گی نامراد! لٹکی رہ ساری زندگی تیرے باپ کو بھیجتی ہوں وہی آکر اتارے گا تجھے۔“

شاہو کا نام لے کر اس نے واوی کے اصل غیظ و غضب کو آواز دی تھی اور نہ ایسی چھوٹی موٹی جھڑپیں تو اس گھر کا روز کا معمول تھیں۔ واوی کے وہاں سے چلے جانے کا اطمینان کرنے کے بعد اس نے آخری ٹہنی سے چھلانگ لگائی۔ کیڑے جھاڑے۔ سائیڈ پر براؤنٹھا اٹھا کر لاپرواہی سے گلے میں ڈالا۔ وہیں پر موجود گونے میں بستے تل سے ہاتھ منہ اور پاؤں اچھی طرح سے دھوئے اور گھر کی اندرونی سمت چلی آئی۔
لیکن میں آکر فریج کھولا۔ تو قلع کے عین مطابق



جگ میں فالے کا شربت موجود تھا۔ گلاس اٹھا کر دو گلاس شربت لی کر باقی جگ ویسے فریج میں رکھا اور اپنے لور دانیہ کے مشترکہ کمرے کی طرف چلی آئی جہاں حسب معمول دانیہ ہیڈ فون کانوں سے لگائے کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ موبائل پر گانے سنے جا رہے تھے شاید لیکن اشتہاک پورا نہیں پر ابھرے خوب صورت پھول کی طرف تھا۔ وہ دم سے اس کے پاس مسہری پر ہی گر گئی۔

دانیہ نے فریم سائیڈ پر رکھ کر ہیڈ فون کانوں سے اتار دیا۔ پتا تھا اس کی موجودگی میں کوئی کام ڈھنگ سے کرنا ناممکن ہوتا تھا۔

”داوی کہاں ہیں؟ اس نے آنکھیں موندے موندے پوچھا۔

”سو گئی ہیں۔ پتا بھی ہے تمہیں یہ ٹائم ان کے قیلوے کا ہوتا ہے۔“

”ان کے اسی قیلوے نے تو مجھے بے موت مروا دیا تھا آج۔ میں نے ان کو دروازے میں سے جھانک کر بستر پر سوتے دیکھا یہ تصدیق کیے بغیر کہ وہ سو گئی ہیں یا نہیں اور چڑھ گئی ان کے ایک عزیز از جان درخت پر۔ بہت جی چاہ رہا تھا آج کچے آم کھانے کا پر کیا پتا تھا کہ رنگے ہاتھوں ہی پکڑ لیں گی۔ اف! ایسی ٹکا کے لگائی کر

پہ کہ اب تک ٹیسس اٹھ رہی ہیں۔ مزید میری خدمت پر آمادہ تھیں وہ تو میں ان کی پیچ سے دور گئی تو بچت ہو گئی۔ اور اصل غصہ تو انہیں تب آیا جب میں نے ان سے کہا کہ ایک شرط پر نیچے اترتی ہوں کہ اپنے پیچھے شاہو کی قسم کھائیں کہ مجھے نہیں ماریں گی بس جی شاہو کا نام سننا تھا کہ میری اگلی پچھلی ساری کسریں نکال لیں ساتھ میں ابو جی سے شکایت کی دھمکی دیتے ہوئے چلی گئیں۔“ کمال اطمینان سے آج کی تازہ رووا دانیہ کے گوش گزار کی گئی جبکہ وہ اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

”کیا ملتا ہے تمہیں ان کو تنگ کر کے؟“

”جو انہیں مجھے تنگ کر کے ملتا ہے اور ہاں! آج

فالے کے شربت میں چینی کم تھی لیکن پیاس بہت لگی تھی پھر بھی تڑپ ہی آگیا۔ کھانے میں کیا ہے آج؟“

”ماش کی دال اور پودینے کی چٹنی ہے۔ تھوڑے سے چاول بھی ابالے تھے داوی کے لیے۔“ دانیہ نے تفصیل بتائی۔

”اف یہ دال۔۔۔ پرسوں مسور کی دال“ آج ماش کی دال۔۔۔ کسی دن ان بھرے ہوئے والوں کے ڈبوں کو بھی روپوش کرنا پڑے گا مجھے تب ہی ان سے جان چھوٹے گی۔“ اس نے دانت کچکچائے۔

”چاول کھا لو رات کے ساتھ۔“ تحمل دانیہ کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔

”ایک تو داوی نے اپنی ساری قناعت پسندی تمہارے اندر ہی انڈیل دی ورنہ تمہارا دوٹ بھی میرے ساتھ ہوتا تو میں دیکھتی کیسے یہ ٹنڈے آلو دال روز پکتے ہیں اس گھر میں اور پلیر دانیہ! ذرا کھانا ہی لا دو یہاں۔“ ایک بات کا سرا دو سری بات سے جوڑتے ہوئے دانیہ سے التجا بھی حکیمہ لکھے میں کی جواباً دانیہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کر کچن میں چلی آئی جبکہ اس نے ہیڈ فون اپنے کانوں سے لگالیا۔

”ذرا زور سے دباؤ۔ ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا۔“ ساس کی کراری آواز نیند کے اس بیٹھے جھوٹے سے دوبارہ اسے اسی مخصوص فضا میں کھینچ لائی۔

پہلے کے خیال سے ہی کوفت ہونے لگی لیکن اس نے جلدی میں پچھنے والی ہڑبونگ سے بچنے کے لیے جلدی سے آٹا گوندھ کر باؤل میں ڈالا۔

”کچن میں رکھا۔“ کپڑے سے کچن کے فرش پر پوچھا پھر اور لائٹ بجھا کر۔ کچن کا دروازہ بند کر لی وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ غنی بیوی دیکھ رہا تھا اسے دیکھ کر سترایا۔

”کیا ہے یار! کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ محترمہ بتا نہیں کن اہم کاموں میں مصروف ہیں؟“ اس کی ہر مصروفیت کا علم ہونے کے باوجود وہ اسی سے شکوہ کنال نکالتی۔

”کچن میں مصروف تھی۔ آپ بتائیں کیا کام تھا؟“

”کچن میں مصروف تھی۔ آپ بتائیں کیا کام تھا؟“

”کچن میں مصروف تھی۔ آپ بتائیں کیا کام تھا؟“

دوسری طرف حقوق کی ادائی کا بھول کر بھی کہیں ذکر نہ تھا۔ اپنی مردانگی دکھانے کے بعد جب سو گیا تو دیکھتے سر اور جسم کے ساتھ اس نے صبح کے لیے کپڑے استری کیے اور بستر پر دراز ہو جانے کے باوجود نیند آنکھوں سے روٹھی رہی۔

پانچ بجے اٹھ کر غسل کر کے جب اعصاب کچھ ڈھیلے محسوس ہوئے تو اس نے نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کتنی ہی دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

☆ ☆ ☆

عصر کے ٹائم آسمان پر دیکھتے ہی دیکھتے گرد و غبار کے بادل چھا گئے اور تیز چلنے والی آندھی نے سارے میں گرد و غبار کا طوفان مچا دیا۔ مہو کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے جھٹ سے گیند بلا اٹھایا اور فٹ سے گھر کے پچھواڑے آگئی۔ پتا تھا کرکٹ کے سارے شدیدائی مٹی کی گرمی کا زور نوٹا دیکھ کر فوراً یہیں آئیں گے۔ اس کا اندازہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ گیارہ بارہ سال کے مانی، گندو، عاصم اور احمد جلد ہی پہنچ گئے اور وہی مخصوص ہا کار پیچ گئی جو ایسے ہی ماحول کا نتیجہ ہوتی تھی جبکہ دانیہ کو صبح دھوئے کپڑوں کے اڑ جانے کی فکر نے جو اس باختم کر ڈالا۔ وہ جلدی سے کپڑوں کا ڈھیر جو وہ پھر میں اس نے مہو کے ذمہ لگایا تھا کہ اتار لائے۔ اس کی غیر ذمہ داری کے باعث اسے ہی لانے پڑے۔ اس نے کپڑوں کا ڈھیر مسہری پر پھینک کر جلدی جلدی دونوں کمروں کی کھڑکیاں بند کیں۔ لیکن تب تک آندھی اپنا رنگ دکھا چکی تھی۔

”جانیٹا! آندھی سے کافی سارے کچے آم گر گئے ہیں پہلے وہ سمیٹ لے۔ اچا رہی ڈال لیں گے۔ ایسے ہی چھوڑ دیا تو اس ٹارزن کی پٹی اور اس کی چندال چوکرڑی نے چورن لگا کے سارے کھا جانے ہیں۔ یاد نہیں پچھلی دفعہ کی آندھی پر جو کھائے سو کھائے بانی سب سمیٹ سٹ کر ساتھ لے گئے بد تمیز بچے۔“

داوی خود اندر آئیں اور اوہراوہر کا پھیلاوا عیمیتی

وانیہ کو مخاطب کیا جو ”جی واوی۔“ کہہ کر باہر جانے لگی۔

”اور ہاں بیٹا! فالسے آج میں نے دیکھے کافی سارے پک گئے۔ ٹوکری لے جا میرا بچہ! پکے پکے سارے انار کے فرج میں رکھ دے۔ صبح شربت بنا کے رکھوں گی، میرے شاہو کو بڑا پسند ہے۔“

ان کے بوڑھے چہرے پر محبت کے سارے رنگ پھیل گئے تھے شاہو کے ذکر پر۔ وانیہ نے رک کر ان کی بات سنی اور بچن سے ٹوکری اٹھا کر صحن کے بائیں جانب بنے اس کے اچھے اچھے میں چلی آئی جہاں واوی کا بنایا چھوٹا سا کھیت ان کی محبت اور محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آم کے پانچ بیڑ چار کینو کے بیڑ، لیموں کے آٹھ دس پودے دو امروہ اور دو جامن کے بیڑ ساتھ میں فالسوں کے بیڑ جن پر کچے پکے فالسوں کی بہار تھی۔ سور میان کی خالی جگہ کو موسمی سبزیاں لگا کر پر کیا گیا تھا۔ موتیا اور گلاب کے پودے الگ بہار دکھاتے نظر آتے۔

واوی کا دن کا بیشتر حصہ ان بیڑ پودوں کی ناز برداری کرتے گزرتا۔ آج سے دس برس پہلے تقدیر نے ان کے بڑھاپے پر کاری وار کیا جب شاہ میر اور وانیہ کے والدین اور مہرالنسا کی والدہ جب دوسرے گاؤں ہونے والی کسی فونگی میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے۔ ثاقب احمد واوی کے چھوٹے بیٹے جن کا گاؤں میں اپنا جنرل اسٹور تھا کام کی وجہ سے رک گئے تھے۔ بچے بھی پر بھائی کی وجہ سے گھر پر تھے اور واوی کی اس دن طبیعت ٹھیک نہیں تھی، سو وہ بھی گھر پر رک گئیں صبح کے وقت گھر سے ٹھیک ٹھاک روانہ ہونے والے تین نفوس واپسی پر گفن اوڑھے میتوں کی صورت واپس آئے تھے۔ واوی کے لیے ایک جوان بیٹے اور دو سوویں کی موت کا صدمہ ہی جان لیوا تھا۔ ان کا ہنسا کھیلتا گھرانہ اجڑ گیا تھا۔ پر تین لڑکھن کی حدود میں قدم رکھنے والے معصوم بچوں کی صورت ان کو کمر کس لینے پر مجبور کرتی۔ بچوں کے مستقبل کی خاطر انہوں نے اتنا بڑا غم اپنے دل کے اندر اتار لیا تھا۔ بڑے بیٹے

فرید کا بڑا بیٹا تیرہ سال کا اس سے چھوٹی وانیہ گیارہ سال کی جبکہ چھوٹے بیٹے ثاقب کی مہرالنسا ابھی دس سال کی تھی۔ واوی اللہ تعالیٰ سے اب بس کچھ مہلت ہمت اور حوصلے کی توفیق کی دعا کرتیں۔

واوی کی توجہ تربیت اور پیار نے جہاں شاہ میر کو ایک ذمہ دار، سختی اور احساس ذمہ داری رکھنے والے نوجوان کی شکل میں ڈھالا۔ اپنے باپ کی طرح اونچے لمبے قد کاٹھ اور خوب صورت نین نقش والے شاہ میر کو نظر لگ جانے کے ڈر سے نظر بھر کر بھی نہ دیکھتیں۔ وہ شہر میں مکینیکل انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا جبکہ دونوں لڑکیاں آج کل بی اے کے پہرے دے کر رزلٹ کے انتظار میں تھیں۔ وانیہ میٹرک کے امتحانات میں شدید بیمار پڑنے کے باعث امتحانات نہ دے سکی تھی۔ نتیجتاً اب دونوں ایک ہی کلاس میں تھی اور یہی ایک قدر ہی ان دونوں میں مشترک تھی اس کے علاوہ دونوں کی عادات، خیالات اور شکل و صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

وانیہ جیسے نین نقش لیے قدرے سانولا رنگ رکھتی تھی لیکن اس کے گھٹنوں تک آتے لمبے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مقابل کو مبہوت کر دیتی تھیں۔ سلیقہ مندی گویا اسی پہ ختم تھی۔ واوی کو ہوتا نہیں کب سے اس نے پلنگ پہ بیٹھا دیا تھا۔ گھر کے سارے کاموں کا چارج اسی کے ہاتھ میں تھا۔ انتہائی نرم مزاج، ہمدرد اور قلمیں۔ ان تین لفظوں میں وانیہ کی فطرت بیان کی جاسکتی تھی۔ پھر بھی مہرالنسا عرف مہو جس کے تربیت کرنے والے وہی لوگ تھے جو وانیہ کے پر طبیعتوں کا تضاد دیکھنے والوں کو حیران کر دیا کرتا تھا۔

شوخی، نٹ کھٹ، چلبلی مہو بچپن سے ہی بہت شرارتی تھی۔ اسکول میں بھی اس کے دوست زیادہ تر لڑکے ہی تھے جن کے ساتھ وہ لڑکوں والے کھیل ہی کھیلا کرتی تھی۔ کبھی گلی ڈنڈا، کبھی کپڑے، کبھی کرکٹ۔ گھر میں بھی اپنے دوستوں کو بلا کر ہمارا چوکڑی مجاہد رکھتی۔ شروع شروع میں تو کپڑے بھی مروانے

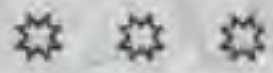
تھی، پھر زبردستی ہونے پر واوی نے زور زبردستی کر کے اسے شلوار قمیص پہننے پر مجبور کیا تھا ہاں وہ پٹا سنبالنے کی عادت اب بھی نہ تھی اس میں۔ واوی کو اور بالادیکھ کر کونوں کھدروں سے دوپٹا برآمد کر کے کونا سر پر لگانے کا کٹھن کر لیا کرتی تھی۔

گھر کے اس خوب صورت دور میں پہنچ کر بھی اپنے حسن سے بے نیاز تھی۔ ماں کی طرح لانا باندھنے سیاہ بال، سرخ و سفید رنگت پر جیسے نقوش۔ واوی اس کا ہوشیار سرا دیکھ کر دہل جاتیں۔ اگرچہ وہ بس کبھی ہنگام کے حلیے میں نظر آ جاتی۔ ورنہ زیادہ تر اپنے آپ سے غافل ہی رہتی۔ لی اے کے پہرے زوے دینے کے بعد بھی اس کا وہی حال تھا۔ کبھی واوی کے چھوٹے سے باغیچے کے کچے پائلوں کی شامت آتی رہتی۔ کبھی چوری چوری کے فالسے توڑ توڑ کر کھائے جاتے، کبھی نظر کرم امروہوں کی جانب ہو جاتی۔ کھیلتے کھیلتے کبھی جو موٹا موٹا سبزیاں بھی محفوظ نہ رہتیں۔ مولیاں بھاگ جاتیں، شلیم زمین سے نکال کر دھو کر کھائے جاتے۔

واوی چل پکنے پر اپنی ضرورت کا رکھ کر محلے میں بھجوا دیتی تھیں۔ ایسے ہی موسمی سبزیاں اور مختلف قسم کے شربت بنا کر بھی بوتلوں میں بھر کے رکھ دیتیں۔ شاہو کو گھر میں بنے موسمی شربت بہت پسند تھے۔ سبز یوں اور آم کے اچار بنانے کے کئی طریقے واوی نے وانیہ کو ازیں کر دیے تھے۔ یوں نہ صرف اپنی کفایت بخاری کے باعث واوی کو بچت ہو جاتی تھی بلکہ محلے دار بھی مستفید ہو جاتے۔

وانیہ کی بات اپنی خالہ کے بیٹے سے ملے تھی جس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وانیہ کی شادی ہونا قرار دیا گیا تھا۔ جبکہ شاہ میر کے ساتھ واوی نے ہمیشہ مہو کا تصور کیا تھا۔ شاہ میر کو بھی اپنی شرارتی سی کزن دل و جان سے پسند تھی لیکن اس کی نٹ کھٹ اور لا پرواہ طبیعت اسے مہو کے سامنے اپنے جذبے آشکار کرنے سے باز رکھتی اور خود وہ عمر کے اس خیرین دور میں اس کے باوجود ان قسم کی باتوں سے کوسوں دور تھی۔ لڑکی یا لڑکے بھی اس قسم کی کوئی بات بچوں کے سامنے

نہ کی تھی۔ وہ چاہتے تھے وقت آنے پر ان کو بھی بتا بھی دیں گے اور مضبوط رشتوں میں باندھ بھی دیں گے۔



اس نے کبھی اس قسم کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ رویوں، رشتوں سے اسے ہمیشہ محبت، پیار اور اعتماد کی فضا ملی تھی اور اب شادی کے بعد اس کی زندگی میں کی تھی تو انہی چیزوں کی۔ زندگی کی تلخی کیا ہوتی ہے وہ اب دیکھ رہی تھی۔ حقیقی رشتے روح کو کیسی ٹھنڈک بخشتے ہیں اس نے کبھی محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن مجازی رشتوں کے ناگ کیسے کیسے اپنا زہر اس کی نس نس میں اندیل رہے تھے، زندگی کے رنگ اتنے رخ بھی ہو سکتے ہیں اسے اب پتا چلا تھا۔ اسے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اتنے چاؤ سے بیاہ کر لانے والی ساس نے پہلے دن سے اس سے ایسا بیرباندھا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ تنہائی میں اس سے پیار کے راگ الاپنے والا غنی ماں کے سامنے ایسا کاٹھ کا الو بن جاتا جس کی دوڑ اس کی ماں جہاں چاہے بھلاتی رہتی تھیں۔ اس کی ساس کو اس کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے سے لے کر اس کے کھانے پینے تک پر بے حد اعتراض ہوتا۔ اسے شروع سے گوشت دھونے سے ابکائی آتی تھی۔ گھر میں کوئی بھی کام کے لیے اس سے نہ کہنا نہ تھا، مگر جب سے اس کی ساس کو اس عادت کا پتا چلا تھا وہ خود ساتھ کھڑے ہو کر اس سے گوشت دھواتیں۔ اسے چاول صاف کرنے سے المرتی ہوتی تھی۔ اس کی ساس مینے کا سودا جب اکٹھے منگواتیں سب سے پہلا کام ڈھیروں چاول صاف کر کے ڈبوں میں رکھنے کا دے دیتیں۔

نئی نوٹی دلسن تھی۔ اپنے نئے کپڑے اور زیور اور میک اپ کی چیزیں برتنے کا شوق ہر نو بیباہی لڑکی کو ہوتا ہے۔ اس کو بھی تھا۔ شروع شروع میں بری اور جینز کے نئے کپڑے نکال کر وہ زیور پہن کر تیار ہو جاتی تو اس کی ساس اس قسم کے سجنے بننے کو بازاری حرکات

قرار دیتیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اس کا سارا زیور اپنے قبضے میں لے لیا۔ جس کی دوبارہ آج تک اسے شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوئی تھی۔ تقدیر کے اس موڑ کے بارے میں جتنا سوچتی آتی پریشان ہو جاتی۔ سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ نہ تو اپنی ساس کے مزاج کے تمام رنگوں سے آشنائی حاصل کر پائی تھی نہ مجازی خدا کے۔

گر میاں آگئی تھیں پر ابھی تک اس کے پاس اپنے جینز کے وہی ریشمی جوڑے تھے جو اب اس چلتی گرتی میں اسے چھپنے لگے تھے، اس کی ضروریات کی ذاتی چیزوں کی فراہمی کا خیال نہ تو ساس کو آیا تھا نہ ہی شوہر کو۔ وہ تو میکے سے جو سوغاتیں اور ضروریات کا سامان آجاتا۔ اس کو بھی قبضے میں لے لیتی تھیں۔ حالانکہ میکے سے آئی یا لائی کئی چیز سے عورت کو خصوصی انیت ہوتی ہے۔ اس فکر سے آتی تپتی ہوا بھی عورت کو یاد دہیم لگتی ہے۔

اب کی بار اس کے میکے سے چار جوڑے لان کے جس میں سے دو سٹلے اور دو ان سٹلے آئے تو اس کی آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں۔

آج اس نے نہادھو کر وہ سوٹ پہنا تھا اور اس میں ماں کی محبت باپ کی شفقت محسوس کر کے دل بہت گداز ہو رہا تھا۔ طبیعت بہت بوجھل سی تھی سو بہت ست روی سے گھر کے معمول کے کام بنانے میں مصروف تھی اچانک کچھ اس طرح سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھلکا کہ کچھ بھائی نہ دیا۔ اس نے سارے کے لیے پاس کسی چیز کو تھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور توازن پر قرار نہ رکھتے ہوئے نیچے گر پڑی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز پایا۔ ذرا حواس بحال ہونے پر ساس صاحبہ کی خوشگین لگا ہوں کا سامنا کرنا پڑا جو سامنے پڑے صوفے پر نیم دراز تھیں۔

”کب سے یہ حال ہے تمہارا؟“ کڑے لہجے میں استفسار نے اسے بوکھلا دیا۔

”جی کیا حال؟“ مرے مرے لہجے میں دریافت

کیا۔

”یہی چکر دوکر۔ التیاں بھی آتی ہیں؟“ ہنسنے کے ساتھ اگلا سوال بھی جڑوا۔

”ہوں۔“ بہت معنی خیزی تھی اس ہوں میں۔ ”کچھ نہیں ہوا ٹھیک ہے سب کمزوری ہے تھوڑی سی شام کو ڈاکٹر صاحب سے دوائی لے کر آؤں گی دوا کھالینا اور اپنی طبیعت کا ذکر میاں سے مت کرنا۔ مرد کو بیمار دیکھ کر کبھی بھی متاثر نہیں کرتی۔ کھانا میں نے بنالیا ہے۔ وہ لائی ہوں کھالو۔“

کرخت لہجے میں توجہ کا ایک عنصر اسے بے طرح حیران کر گیا۔ اس پورے ایک سال میں پہلی دفعہ اس کی ذات کے حوالے سے تھوڑی سی تفتیش اسے مطمئن کر گئی تو اس نے بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔



جون کی تپتی دھوپ میں جب ہر طرف ہو کا عالم تھا درخت کے تے تک ساکت تھے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں گرمی کی تپش سے پناہ لیے چھپے بیٹھے تھے گاؤں کی نہریں گھنوں تک ڈوبے وہ تینوں موجود تھے۔ آم کی گھنی شاخوں نے نہر کے اوپر چھت سی بنا دی تھی۔ وادی کے باغ سے توڑا گیا ترلوز اس وقت ڈش میں نفاست سے کٹ کر وانیہ نے اس میں تین کائے رکھے اور ان دونوں کو پیش کیا۔ دوسرا سبز ترلوز نہر کی سطح پر تیر رہا تھا جو اگر ان کی پہنچ سے ذرا دور جانے لگتا تو کبھی ٹانگ سے شاہو اسے اپنی طرف کھینچ بھی مہو ہاتھ سے اسے دھکیل کر وانیہ کی سمت کر دیتی یہاں سے نہر کا پاٹ بہت کم جوڑا تھا۔ نتیجتاً اسے سامنے والے کنارے سے ٹکرا کر پھر انہی کی جانب آجاتا۔

”شاہو۔ تمہاری کلاس میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں؟“ ترلوز کھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں کیوں؟“ وہ چونک کر گویا ہوا۔

”تمہیں کوئی پسند ہے تو مجھے بتا دو۔ دراصل وانیہ

کی شادی کے بعد میں اکیلی رہ جاؤں گی تو میں چاہتی ہوں اس کی محسوس نہ کروں۔“

وانیہ نے اپنی شادی کی بات پر پہلے تو گھور کر اسے دیکھا ساتھ ہی ایک دھپ رسید کی وانیہ کی بات بہت پہلے سے اس کی خالہ کے ہاں طے تھی جو نزدیکی گاؤں میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کا بیٹا اب تعلیم مکمل کر کے شادی کر چکا تھا اور اس نے اپنے گاؤں میں ہی بیٹی سائیڈز کا بزنس کر لیا تھا۔ اس کی ہونے والی ساس ابھی پر سوں ہی دھوپ کو کہہ کے گئی تھیں کہ وہ جلد ہی شادی کی بات طے کرنے آئیں گی۔ اس بات پر پر سوں سے ہی ہونے چھینر چھینر کر وانیہ کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ ہلنے ہلانے سے یہی ذکر نکال کر بیٹھ جاتی۔ کبھی لگنے لگا شادی شروع کر دیتی اور تو اور وادی بھی مسکرا دیتی تھیں۔

”پتا ہے شاہو! تم شہر سے اگلی بار ڈھوک کی لے آنا اور کچھ چیزوں کی لسٹ بنا کر دوں گی وہ لے آنا تاکہ ابھی سے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔“

اب اس کی گفتگو کا دھارا وانیہ کی طرف مڑ گیا تو شادی کے کئی منصوبے بنا لیے گئے جبکہ شاہ سیر دل میں اس میں یہ سوچ کر رہ گیا کہ کیا اس کی آنکھوں میں جنموں کے رنگ کبھی مہو کو نظر نہیں آئے۔ لازمی ہے کہ ہر بات کا زبان سے اقرار کیا جائے؟

”مہو! تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟“ شاہ میر کا پوچھا گیا سوال ایک دم اسے چونکا گیا۔

”مطلب سب کی شادی ہوتی ہے تو اسی حوالے سے ہر ایک نے کوئی نہ کوئی خیالی خاکہ ذہن میں ضرور بنالیا ہوتا ہے۔ تمہارا بھی ہو گا ظاہری بات ہے اور اندری شادی بھی کرنی ہے ہم نے۔“

وانیہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر شاہ میر کو دیکھا کہ کدو بھائی کے دل کی خواہش سے واقف تھی۔ جبکہ مہو کی کیفیت وانیہ کی کیفیت سے جدا تھی۔

”کیا مطلب شاہو! تم اپنی بیوی لانے سے پہلے مجھے کمرے بھگانا چاہتے ہو؟“ اس کی بے وقوفانہ سوچ پر شاہ میر کا دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔

”پتا ہے شاہو! میری کسی سے دہ کر رہنے کی فطرت ہے نہ کسی کی غلط بات برداشت کرنے کی عادت۔ جبکہ شادی ایک ایسا بندھن ہے جس میں ایک شخص اس قابل ہے۔ یا نہیں ہے کہ اس کی غلامی کی جائے پر نہ چاہتے ہوئے عورت کو یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اوپر سے ساس عمندوں جیسی مخلوقات کا حکم بجالانا، نہ چاہتے ہوئے انہیں برداشت کرنا تو تمہیں پتا ہی ہے ناں کہ کوئی میرے اوپر ایک لمحے کو اپنے خیالات حاوی کرے مجھے اسی سے اتنی محسن ہوتی ہے کجا کہ ساری عمر کے لیے چند لوگوں کو اپنے اوپر مسلط کر لینا۔ اف تو یہ!“ اس نے بے ساختہ ہنسنے لگی۔

”لیکن ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہر مرد ایسا نہیں ہوتا جو بیوی کو اپنا غلام بنائے۔ نہ ہی ہر ساس اور نہ ہی ایسی ہوتی ہے جو زبردستی ہو بھانج کو حکم بجالانے پر مجبور کرے اور خود کو بہو کے سر پر تمام عمر مسلط کرے۔“ وانیہ کو اس کی بات سے شدید اختلاف ہوا تو وہ بول اٹھی۔

”تم کہہ سکتی ہو یہ کیونکہ تمہارے ہونے والے سسرالی تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں اور تم کسی نہ کسی حد تک ان کی فطرت و عادات سے واقف ہو۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ شادی ہو جانے کے بعد پہلے محبتیں جتانے والے یہی لوگ رشتے کی نوعیت تبدیل ہونے پر خود بھی بدل جاتے ہیں۔“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ دونوں بہن بھائی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف نگاہ کی۔

”تمہارے سسرالی رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے تمہارے رشتہ دار نکل آئیں۔“

”میرے دور دور تک ایسے کوئی رشتہ دار نہیں ہیں۔“ کمال اطمینان سے جواب دیا گیا۔

”قریب کے تو ہیں۔ لیکن تمہاری قریب کی نظر شاید کمزور ہے۔“ وانیہ سے زیادہ دیر تک اس کی فضول گوئی برداشت نہ ہوئی نہ ہی بھائی کا پیچھا پڑتا چہرہ تو وہ بول پڑی۔

”قریب کا رشتہ تو صرف شاہو سے ہے۔ لیکن میں

ایک فضول رشتہ بنانے کے چکر میں اس سے جو میرے اور ڈھیر سارے رشتے بنتے ہیں۔ وہ ختم نہیں کر سکتی۔ یہ میرا ایسا کزن ہے جس سے ہر قسم کی فرمائش دھڑلے سے کر لیتی ہوں۔ یہ میرا ایسا دوست ہے جس سے اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک کر لیتی ہوں۔ بلکہ تم میری کسی کم ہوئیہ زیادہ ہے۔ اس نے شاہ میر کو شرارت سے دیکھا۔ ”تم تو کبھی کبھار ٹوک بھی دیتی یہ نہیں ٹوکتا۔ تسلی اور توجہ سے میری بات سن کر مسکرا دیتا ہے۔“ وہ پھر مسکرائی۔

”میں ایک رشتہ جوڑ کر اتنے ڈھیر سارے رشتے نہیں توڑ سکتی نہ ہی شاہو ایسا چاہے گا۔“ اس نے تائیدی نظر سے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ ”اچھا پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔ اگرچہ بہت سی باتیں تمہاری غیر منطقی ہیں اور میں تمہیں اچھی طرح سمجھا سکتا ہوں پر ابھی ہمیں آئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ داوی انتظار کر رہی ہوں گی اور چچا بھی دکان سے آگئے ہوں گے۔“

شاہ میر نے سنجیدگی سے کہہ کرپاؤں نہر کے پانی سے نکالے اور پاس گھاس پر بڑی چیزیں سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالنے لگا۔ وہ دونوں بھی پانی سے نکل کر اس کے پاس آگئیں اور کچھ ہی دیر میں وہ لوگ گھر پر تھے۔ شاہ میر کی توقع کے عین مطابق داوی جاگ چکی تھیں اور ان کے انتظار میں تھیں۔

”آگئے میرے بچے!“ انہوں نے تینوں کو مخاطب کیا اور شاہو کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ ان کے بٹھانے کی دیر بھی وہ بھی ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند گیا۔

دانیہ داوی کے لیے کھانا نکالنے چلی گئی جبکہ مو بھی پاس بڑے پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ داوی آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں اور ساتھ ساتھ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ مو محبتوں کے اس مظاہرے پر جل ہی تو گئی۔

”اٹھائیں لاڈ اپنے لاڈ لے پوتے کے۔ جب اس کی بیوی آجائے گی نا تو آپ کو اس کے پاس بھی نہیں

پھٹکنے دے گی۔ تب میں ہی ہوں گی جس کے پاس بلا ڈھونڈنے آئیں گی آپ اور میں بھی ایسے ہی ٹولہ کرادوں گی جیسے آپ مجھے کراتی ہیں۔“ ایسی بے سرو بات پر جہاں داوی جھٹکنے سے سیدھی ہوئیں وہاں شاہ میر بھی پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ ”کیا کہا تو نے کون ہو گی اس کی بیوی؟ ارے کس میں جرات ہے جو میرے بیٹے کو مجھ سے جدا کر سکے۔“ داوی چمک کر بولیں۔

”وہی جس سے یہ شادی کرے گا۔ گاؤں میں تو اس کے معیار کی کوئی ہے نہیں۔ شہر سے ہی لائیں گے ہم اپنے شاہو کی دلہن۔ اور شہری لڑکیاں سب سے پہلے ساس کو ٹھکانے لگانے کے چکر میں ہی ہوتی ہیں۔“ وہ جوش سے بولی۔

”لیکن آپ فکر کیوں کرتی ہیں داوی! میں ہوں گی آپ کے ساتھ۔ اس لیے تو کہتی ہوں مجھ سے بنا کے رکھا کریں۔“ اب کے وہ اترا کر بولی تو داوی کو پٹکنے ہی لگ گئے۔

”کج بخت! منہ کے آگے خندق ہے۔ بولے چلی جائے گی۔ مجھے کس نے اجازت دی کہ فیصلے کرتی پھرے۔“ داوی نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا بیٹا! ابھی بھی مجھے کشتی ہے کہ میں تجھ سے اور دانیہ سے زیادہ پیار کرتی ہوں اور اس کی سوتیلی ہوں۔ باتیں سنیں اس کی۔ فضول کی باتیں کرو الو سارا دن یا وہ مواڈنڈالے کے چوبیس گھنٹے بھلو الو۔ ارے وہ بچی بھی تو ہے دانیہ۔ سارا گھر اس نے سنبھال رکھا ہے۔ منہ میں زبان نہیں ہے اس کے۔“

اتنے میں دانیہ نے کھانے کی ٹرے لا کر آگے رکھی اور اشارے سے شاہ میر سے داوی کے غصے کا سبب دریافت کیا۔

”چھوڑیں داوی! کھانا کھائیں۔ ابھی کھانڈری ہے ہماری مو۔ ذمہ داری بڑے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی؟“ شاہ میر نے داوی کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

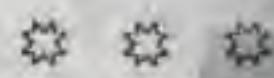
”اکیس سال کی ہو گئی ہے اس سال۔ میں تو دانیہ کی شادی کے بعد اس کی شادی کا سوچ رہی ہوں اور تم

بچے ہو کہ چھوڑیں۔“ میں نے شادی نہیں کرنی کسی اونگے بونگے سے۔ میں اب لا پرواہی سے پلنگ پر بیٹھی ٹانگیں ہلاتی ہوں اپنے قہیدے بڑے شوق سے داوی کے منہ سے سن رہی تھی۔ شادی کی بات سنتے ہی بدک پڑی اور ہار سے کشتی باہر چلی گئی۔ ”دیکھ اس کے تیور۔“ داوی نے غصے میں شاہ میر کی طرف دیکھا۔ ”تو تو تسلی دیتے ہوئے اپنے ہاتھ سے دانیہ کی ٹانگیں کھلانے لگا۔“

ان ہی کزرتے دنوں میں چھٹیاں گزار کر شاہ میر واپس ہاسٹل چلا گیا تو دانیہ کی ساس اس بار پھر شادی کا تھکا لے چلی آئیں۔ داوی نے ابا سے مشورہ کر کے شادی کی تاریخ دے دی اور مو سب کچھ بھول بھال کر شادی کی تیاریوں میں لگ گئی۔

”باب کے لاڈ پیار نے یہ حال کر دیا اس کا۔ اب میرے شاہو کی قسمت پھولنے گی۔ پتا نہیں کیسے گزارہ کرے گا میرا بچہ اس فتنے کے ساتھ۔“

داوی کے یہ الفاظ کان میں بڑے تو دانیہ کی بے ماتہ ہنسی نکل گئی۔ لیکن اسے پتا تھا کہ اس کے بھائی اہل مو کی محبت میں سمندروں ایسا وسیع تھا اور عین میں بہت کچھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے غلطیاں کی اور محبت تو اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ کچھ بھی دیکھنے پر قادر ہوتی ہے۔ وہ جانتی تھی اس کے بھائی کی بات جلد ہی اپنا آپ منوالے گی۔



اس دن اپنے مخصوص آم کے پیڑ کے نیچے وہ اور اس کے دوستوں نے لوٹو کی گیم چھائی ہوئی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ رہائشی کمروں کی جانب آئی تو داوی کے پاس ایک فریہ عورت اور ساتھ ہی نہایت وجہہ اور خوب صورت نوجوان کو بیٹھنے پا کر وہ وہیں ٹھنک کر رہ گئی۔

”اومو! ان سے آکر ملو یہ تمہاری فرزانہ خالہ اور بھائی ہے۔ میری بھانجی ہے یہ۔ شادی کے بعد

دینی چلی گئی تھی۔ اب کافی عرصے بعد پاکستان آئی ہے۔ لاہور میں رہتی ہے۔ یہاں گاؤں میں کسی شادی میں آئی تو بوڑھی خالہ بھی یاد آگئی اسے۔“

خوشی سے بتاتے بتاتے آخر میں داوی آبدیدہ ہو گئیں۔ جھجکتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا اور کھانے کے خالی برتن اور پھلوں کی ٹوکریوں میں کھائے پھل دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ انہیں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اور حسب معمول کھانے پینے کا سارا انتظام دانیہ نے اکیلے کیا تھا۔ اسے بے اختیار اپنی سلیقہ مند اور کم گوی کزن پر بے اختیار پیار آیا۔ کسی کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر کے چونک گئی۔

شوخی نگاہوں کے ارتکاز پر وہ خود بے ساختہ نظریں جھکا گئی۔ ابا اور شاہ میر کے بعد پہلا مرد تھا جس کے رویہ وہ بیٹھی تھی۔ اس کی مشہور زمانہ طراری کے غبار سے ہوا نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔

جلد ہی وہ خالہ سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کو ان کی شوخی طبیعت نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جس کمپنی میں ان کا بیٹا ملازم ہے انہوں نے دینی اور لاہور میں اس کو دو گھر دیے ہوئے ہیں اور جہاں ان کا بیٹا جاتا ہے وہاں وہ بھی جاتی ہیں۔ وہ زیادہ تر دینی پرانچ میں ہوتا تھا تو وہ بھی زیادہ تر دینی میں ہوتی ہیں۔

جاتے ہوئے اسے خوب سنج کر پیار کیا۔ داوی کا ماتھا ٹھنک گیا اور تین روز بعد داوی کے خدشے کو تصدیق کی سند مل گئی۔ جب وہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر دوسری بار ان کے پاس آئیں۔

داوی تو شاہ میر سے اس کی نسبت کا بتا کر فوراً انکار کرنا چاہ رہی تھیں لیکن دو ٹوک انکار کرنا انہیں مناسب نہ لگا تو اپنے بیٹے اور بچوں سے مشورہ کا کہہ کر بعد میں جواب دینے کا کہا اور اشارے کنائے میں یہ بھی بتا دیا کہ ان کے گھر کا بھی بچہ موجود ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ گھر کی بات گھر میں ہی طے کر لیں۔

شام کو ابا کے گھر آنے پر داوی نے ان کے سامنے بات رکھی تو ابا نے کہا کہ انہوں نے ہمیشہ مہرالنسا کے

لیے شاہ میر کو سوچا ہے۔ لیکن بہتر ہے بچوں کی رائے معلوم کر لی جائے۔ خصوصاً "مہرالنسا" کی رائے کی زندگی میں کبھی وہ شکوہ نہ کر سکے کہ ماں کا سایہ سر پر نہیں تھا تو کسی نے زندگی کے سب سے اہم معاملے میں اس کی رائے نہیں لی۔

اس دن وہ اپنے معمول کے مطابق بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ چونکہ نماز پڑھ کے دوبارہ سوچانی تھی تو دوبارہ تقریباً "دس بجے" بیدار ہوئی۔ ناشتا اس کو تازہ چاہیے ہو نا اور دانیہ پھرنی سب کی فرمائشیں بجالانے پر مامور سوہر کام چھوڑ کر پہلے اس کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی اگرچہ اس بات پر بھی واوی بہت برا بھلا کہتی تھیں پر اس نے اور کون سی باتوں پر توجہ دی تھی جو اس بات پر دیتی۔ لیکن واوی کے پاس آکر بیٹھنے سے ہاتھ ٹھنک گیا۔ بہت سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کون سی تازہ ترین واردات سرزد ہو گئی ہے اس سے جو واوی تشریف لے آئی ہیں۔ یہ یاد نہ آسکا کیونکہ بیدار ہونے کے بعد پہلا کام وہ ناشتا ہی کر رہی تھی۔

اسی کا گلاس خالی کر کے رکھا اور بغور واوی کی طرف دیکھنے لگی جو اسے کچھ الجھی ہوئی دکھائی دیں۔ "کیا بات ہے واوی! خیر تو ہے ناں؟" اس کا تشویشی انداز واوی کو چونکا دیا۔

"ہاں خیر ہے۔ تم ذرا سکون سے بیٹھو۔ ایک بات کرنی ہے تم سے۔" انہوں نے تمہید باندھی تو مہو بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"تمہیں پتا ہے اگلے ماہ دانیہ کی شادی ہے تو ہم نے سوچا ہے شاہو کی دلہن بھی گھر لے آئیں۔ تمہیں شاید نہ پتا ہو کہ میں نے اور تمہارے ابا نے شاہو کی دلہن کے طور پر بہت پہلے تمہیں چن رکھا ہے۔ ہم دانیہ کی شادی کے ساتھ ہی تمہاری اور شاہو کی شادی بھی کر دیتے ہیں۔ چونکہ تمہاری کہیں نسبت کا اعلان نہیں کیا تھا تو ایک دو جگہوں سے تمہارا رشتہ بھی لے کے آئے کچھ لوگ۔ ایک دو گاؤں کے عزیز ہیں۔ دو سری فرزانہ میری بھانجی جو اس دن اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھی۔ اس کا بھی بڑا اصرار ہے تمہارے لیے۔

ہم نے سوچا تمہارا عندیہ لے لیں تو اگلے ہفتے تو اس کی کر دیتے ہیں تاکہ جب لوگوں کو اس نسبت کا پتا چلے گا تو رشتوں کا یہ سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ میں بھی جلد اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھ لوں گی۔ غریب ایسی ہے کہ ہر دم بلاوے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جانا تو ہے بچے! پر تم لوگوں کو خوش دیکھ جاؤں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں مانگا اس سوچنے پر سب سے میں نے۔" انکشافات کی بشاری اس کے سامنے کھول کر آخر میں واوی کو بیدار ہو گئیں تو انہیں اشک بار دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

"ارے! ارے! آپ رو میں مت۔ آپ کو پتا ہے میں کسی کو روتے دیکھوں تو مجھے بھی فوراً رونا آجاتا ہے۔" اس کی آواز میں کمی محسوس کر کے واوی نے جھٹ اپنے آنسو صاف کر لیے۔

"اچھا اب بتا تیری کیا رائے ہے؟" واوی اپنا متوقع جواب سننے کے لیے بے تاب ہوئیں۔

"آپ۔۔۔ آپ فرزانہ خالہ کو پاں کریں۔" اس کا جواب پاس بیٹھی واوی اور اندر آئی دانیہ کو سنا کر گیا۔

"اور۔۔۔ اور شاہو کا کیا ہو گا؟" واوی کی سرسراہٹ آواز پر وہ چونکی۔

"شاہو کے لیے اچھی سی لڑکی میں خود پسند کروں گی۔"

"وہ اچھی لڑکی تو نہیں ہو سکتی مہرالنسا؟" واوی کی کانپتی آواز میں عزیز پوتے کے اوہورے خواب کی کرچیاں بول اٹھی تھیں۔

"میں نے کبھی شاہو کے لیے اس انداز میں نہیں سوچا۔"

"وہ تجھے پسند کرتا ہے مہرالنسا! واوی کی آس بھری نظروں پر وہ نگاہیں چرائی۔

"آپ کو اپنے پوتے کی پسند تو پتا چل گئی واوی! میری کیوں نہیں؟" اب کی بار واوی نے چونک کر اسے دیکھ لیا۔ آکھوں میں کسی کی محبت صاف رہ گئی تھی۔

"مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا لگا تھا" پر میں جو ساری

زندگی شادی نام کی شے سے چڑتی آتی ہوں۔ میرے دل میں جو رست کی دیوار ثابت ہوئے لیکن میں نے اس بات کو اپنی وقتی پسندیدگی کہہ کر دل میں دبایا تھا پر اب اگر تقدیر نے اسے میرے سامنے لا کر رکھا ہے تو اس میں بھی میں قدرت کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

تھکنے سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی واوی کو اپنا حال دیکھنے لگی تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگا لیا اور پیشانی چوم کر کہا تو صرف اتنا کہ "میرے لیے دانیہ بھائی اور تم۔۔۔ تینوں برابر ہو۔ بے فکر رہو۔ تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔" دل گرفتہ سی واوی اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔ جبکہ دانیہ دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔

اپنے بھائی کی خاموش محبت کے اوہورے رہ جانے کا غم اس کا دل کاٹنے دے رہا تھا۔ واوی نے فون کروا کر شاہو کو اور جنٹ بلوایا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بھاگا چلا آیا اور جب واوی کی زیبائی ساری صورت حال پتا چلی تو تقدیر کے اس فیصلے پر اس کا دل رونا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے واوی کو وہاں ہاں کر دینے کو کہا تھا جہاں ضرورت تھی۔ جبکہ دانیہ اس بات پر اس سے جواب لڑی تھی۔

"تم تو لڑے بغیر ہی ہار رہے ہو بھائی! ایسا مت کرو۔ ایک بار تو اپنا دل کھول کے اسے دکھاؤ۔" وہ سسکی مارتی تھی۔

"تیرا بھائی اتنا کمزور نہیں ہے دانی! کہ محبت جیسی نعمت کسی بھیک کی طرح لے۔ شاید میرے جذباتوں میں غما کھوت ہو گا جو وہ ان کو ایک دفعہ بھی محسوس نہ کر پائے۔ آج کے بعد یہ بات زبان پر مت لانا۔ دعا کرنا وہ مجھے خوش رہے۔"

دانیہ کا سر تھپتھا کر وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ شادی کے معاملات آس قدر تیزی سے طے ہوئے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ حالانکہ مہرالنسا نے ضد بھی کی تھی کہ دانیہ کی شادی اس سے کچھ دن پہلے ہو تاکہ وہ شادی کو ٹھیک طرح سے انجوائے کر سکے لیکن اس کی ہونے والی ساس کا اصرار تھا کہ بہو کو ساتھ لے

کر جانا ہے وہی۔ سو ایک دن کے وقفے سے دانیہ اور مہرالنسا کی شادی طے ہوئی اور دونوں لڑکیاں دل میں مختلف خدشات و خیالات لیے پراسنگ سدھار گئیں۔

دانیہ کو نئے گھر جانے کی خوشی تھی تو بھائی کی اوہوری رہ جانے والی محبت کا غم بھی تھا۔ واوی اور چچا سے الگ ہونے کی فکر بھی تھی۔ پہلے تو جب بھی اپنی وداعی کا خیال آتا یہ نیال مطمئن کر جاتا کہ پیچھے مہو ہو گی تو اسے واوی اور چچا کی فکر نہیں رہے گی۔ پر مہرالنسا کے خیالات اس سے جدا تھے۔ وہ نئی نئی محبتوں کے شمار میں تھی۔ شوہر کی وارفتہ نگاہیں شرم سے گلنار کیے دے رہی تھیں تو ساس کا والہانہ انداز سرشار کیے دے رہا تھا۔ اتنا کہ وہ پچھلوں کو بھلائے بیٹھی تھی۔

دنیا کی کوئی بھی یونیورسٹی آپ کو وہ سبق نہیں پڑھاتی جو زندگی کے نصاب میں درج ہوتے ہیں۔ مہرالنسا جس کے لیے زندگی حقیقتاً "پھولوں کی بیج" تھی۔ جس میں محبتیں تھیں پیار تھا دل میں ہزاروں ارمان لیے وہ غنی اور اس کی ماں کے سنگ پہلے لاہور والے گھر میں آئی تھی۔ گھر میں اس کی ساس کے کچھ رشتہ دار بھی تھے۔ اسے ایک کمرے میں لا کر بٹھایا گیا جو معمولی سامان سے آراستہ تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ ایک اعلیٰ کمپنی میں اعلیٰ عہدہ رکھنے والے دینی پلیٹ کا کمرہ ہے۔ اس کا سامان تو اس کی ساس نے یہ کہہ کر لینے ہی نہ دیا تھا کہ کمپنی کی جانب سے غنی کو فرنیچر گھر ملا ہے۔ اگر وہ لوگ کچھ دینا بھی چاہتے ہیں تو اپنی بیٹی کو کیش دے دیں۔ ابا نے شاہ میر سے مشورہ کرنے کے بعد ایسا ہی کیا تھا۔ وہ چیک اس وقت اس کے پرس میں موجود تھا۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہونے پر اس نے اپنی کمر کو تختہ بنے محسوس کیا۔ دفععتاً اس کی ساس کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ "تم اگر اس انتظار میں ہو کہ دو لہا تمہارے پاس آئے گا تو اس بھول میں مت بیٹھی رہو کیونکہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب تک گھر میں ایک بھی مہمان

رہے۔ دولہا دلہن والے کمرے میں نہیں آئے۔“
مہرالنسا کے لیے نہ تو بات عام تھی نہ لہجہ عام تھا۔ خالہ کا پیار جتنا انداز مفقود تھا بلکہ مہرالنسا کو ان کے لہجے سے عجیب سی تحقیر کا احساس ہوا۔ مگر اس وقت کیا کہتی۔ خاموش ہو رہی۔

”اور وہ جو چیک تمہارے پاؤں دیا ہے وہ تو مجھے دے دو۔ گھر بھر اڑا ہے مہمانوں سے کسی کی نیت کی کیا خبر کب بدل جائے۔ میں سنبھال کر رکھ لوں گی۔ کل کلاں کو تمہارے ہی کام آتا ہے وہ گھر کو سجانے سنوارنے کے لیے۔“ وہ دروازے سے دوبارہ پلٹ آئیں۔

اسے ان کی یہ بات پہلی بات سے کہیں زیادہ کھلی پر اپنے گھر کے خوش کن احساس نے کسی ناگوار احساس کو سر نہ اٹھانے دیا اور پرس کھول کر چیک ان کے ہاتھ میں تھا دیا۔ ویسے بھی غنی کے علاوہ اور ہے کون ان کا اس نے سوچا۔ اتنی دیر میں اس کی ساس دروازہ بند کر کے جا چکی تھیں۔ آئینے میں اپنا سر لپا دیکھتے ہوئے کتنے ہی آنسو بے اختیار ہو کر چلوں کی پاڑ توڑ کر چلے آئے۔ اس نے کبھی سنے سنورنے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ پر آج جس کے لیے اس نے اپنا پور پور سجایا تھا۔ وہ اس کے پاس نہیں تھا اس کے حسن کو سرائے کے لیے۔

کتنی دیر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے بعد تھکے تھکے انداز میں اس نے اپنا عروسی لباس تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ بھلا اس وقت گاؤں کے اس آنگن میں بسنے والے اس سے محبت کرنے والے کیا کر رہے ہوں گے۔ ابا دادی۔ اور شاہو۔

”سچ بچا ہوا۔ کیا کبھی بھی تمہیں شاہو کی آنکھوں میں وہ محبت نظر نہیں آتی۔ جو اس نے پتا نہیں کب سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ میں چاچا دادی۔ ہم سب سے بھی شاہو نے اس حوالے سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیں اس کی آنکھوں میں محبت کے ویسے چلتے نظر آگئے۔ اور جس کے لیے اس نے محبت

کے خزانے سینت سینت کر رکھے کسی متاع کی طرح اس کو پتا چلتا تو ایک طرف احساس ہی نہ ہو۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔“

شادی سے محض تین دن پہلے دانیہ کی کئی گئی باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اسے ایک دم شدید پیاس اور ٹھنکن کا احساس ہوا جیسے گلے میں ہزاروں گانے آگے آئے ہوں۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ”نہ دانیہ پتر امیرے شاہو کے لیے بھی دیکھتا میرے اللہ نے کہیں ڈھیر ساری خوشیاں سنبھال رکھی ہوں گی۔ وقت آنے پر میرا سو ہزار ب اس کو بھی خالی ہاتھ نہیں رکھے گا۔ محبت کسی کے کہنے سننے سے تھوڑی کی جاتی ہے بچے! یہ تو دل کی خبر زمین پر خود بخود پھوٹ پڑتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خبر ٹکڑا ٹکڑا ہوتی فصل میں بدل جاتا ہے۔ اللہ سو ہزار امیری پتری مہرالنسا کا نصیب بھی اس کی صورت جیسا سو ہزار کرے۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اپنی بہن کو دعاؤں کا تحفہ دے کے رخصت کر میرے بچے!“

اسی بل اسے دادی کا اندر آکر دانیہ کو ٹوک دینا بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ پر وہ اپنے ضدی دل کا کیا کرتی جس نے ہمیشہ اپنی من مانی کی تھی۔ محبت بھرے دلوں کو چھوڑ کر اس پر ہوا بھی تو کس کا۔ محض ایک نظر دیکھنے کے بعد ایک اجنبی کا جواب اسے اجنبی نہ لگتا تھا۔

اسی سوچی جاگتی کیفیت میں پتا نہیں کب اسے غنڈ آ گئی۔ آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے گرد عورتوں کا جم غفیر دیکھا جو اس کی ساس کی سسرالی عزیز تھیں اور دلہن کو اچھی طرح دیکھنے کی چاہ میں جمع تھیں۔ ان میں سے بقول ایک عورت کے ”دلہن بنے تو ہر لڑکی خوب صورت لگتی ہے۔ اصل میں کسی کی صورت کو پرکھنا تو میک اپ کے بغیر دیکھو۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی سائیڈ پر پڑا دپٹا اٹھا کر سر پر ڈالا۔

”بہو تو پری ڈھونڈ کر لائی ہے۔“
ایک عورت نے تو صیغی انداز میں کہا تو اکثریت نے تائید میں سر ہلایا۔ کئی طرح کے جملے کانوں میں پڑے جو اس کے حسن کی شان میں تھے پر جس سے

صرف سنا چاہ رہی تھی اس کو کل سے اس نے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ معا ”ایک عورت جو اس کی ساس کی بیٹی جیٹھلی تھی ناشتا لے آئی۔ اسے واش روم جانے کی تاکید کر کے باقی لوگوں کو کھانے کے لیے بلا کر گئی تو فریض ہو کر آنے کے بعد اس نے کمر اخلی کر کر سکون کا سانس لیا۔

”ارے اکیلے اکیلے ہی ناشتا کیا جا رہا ہے۔ دولہا پہل کمال ہیں۔“

چائے پیتی مہرالنسا ایک دم چونک کر مڑی تو دروازے میں دانیہ کو کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ وہ بھاگ کر اس سے ایسے گلے ملی جیسے صدیوں سے بچھڑی ہو۔

”دادی کہاں ہیں؟“ رندھی آواز میں پوچھا۔
”دادی تو نہیں آسکیں۔ اتنا لمبا سفر کہاں کر سکتی ہیں وہ تمہارے لیے بہت سہارا اور دعائیں بھیجی ہیں۔ میں چاچا شاہو اور وہ آئے ہیں۔“

دانیہ کو شاد مطمئن اور کھلا کھلا دیکھ کر اسے یاد آیا کہ ان کی شادی ایک دو دن کے وقفے سے ہوئی تھی۔ دانیہ کا پور پور کسی کی چاہت میں بھیگا نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاس منانے کو بے تحاشا قصے تھے اور پوچھنے کو ہزار باتیں۔ اس کی شوہر کی والدہانہ محبت کے قصے سن کر وہ اسے اپنے حوالے سے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پائی۔ اتنے میں دو تین عورتوں کے ساتھ یوٹیشن اسے تیار کرنے چلی آئی۔ تیار ہونے کے بعد دانیہ ابا اور شاہو کو اس سے ملوانے لے آئی۔ ابا سے ملتے ہوئے کی گرم گرم آنسو نکل کر چہرہ بھگوتے چلے گئے۔

”کیسی ہو مہو؟“ شاہو کا نرمی سے پوچھا گیا سوال اسے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر گیا۔ اس کی آنکھوں کا وہی نرم سا تاثر چہرے پر ہمیشہ کی طرح بھلی مسکراہٹ۔

”ٹھیک ہوں۔“ آہستہ سے کہہ کر وہ ابا سے الگ ہوئی۔ بہت سی دعائیں دینے کے بعد ابا اور شاہو دوبارہ ملنے میں چلے گئے۔

کل صبح کی ان کی دینی کے لیے فلاٹ تھی۔ سو

فنکشن ختم ہونے کے بعد جب وہ لوگ روانہ ہونے لگے تو اس کا ضدی دل ہمک ہمک کر اسی آنگن میں دوبارہ جانے کی ضد کرنے لگا، جہاں عمر کے اکیس سال سب کی محبتوں کی چھاؤں میں گزارے تھے۔

پورے ایک دن بعد اس نے غنی کو دیکھا تھا جب دانیہ نے اسے بہت زیادہ اصرار سے بلوایا تھا۔ ان کے ہاں ولیمہ پر دولہا مروانے میں اور دلہن زنان خانے میں ہوتی تھی۔ اسے اس قدر بچے سنورے دیکھ کر وہ مبہوت ہی رہ گیا۔ پر دانیہ کا خیال کر کے اس سے بمشکل دھیان ہٹایا۔

ابا لوگوں کے روانہ ہونے کی دیر تھی کہ غنی جو ابھی بیٹھ کر کمر بھی سیدھی نہ کرنے پایا تھا کہ باہر سے پیغام آ گیا کہ کچھ دوست بلارے تھے۔ ایک بھر پور نظر اس پر ڈال کر وہ اس سے کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا کہ پیغام لانے والی جو بھی تھی وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ باہر نہ نکل گیا۔

مہمانوں کی اکثریت شام کو ولیمہ ختم ہونے پر چلی گئی جو اکا دکا لوگ باقی تھے ان کا کل ان لوگوں کے ساتھ ہی نکلنے کا پروگرام تھا وہ جو غنی کے حوالے سے کتنے خواب سجائے بیٹھی تھی دینی آنے پر وہ سارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔

اس کی آج تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اس کی ساس نے یہ سب کچھ کرنا تھا تو اسے بیاہ کر کیوں ملائی تھی۔ غنی جس کو ایک نظر دیکھ کر وہ اس کی اسیر ہو گئی تھی ایک ایسا کاٹھ کا الو ثابت ہوا تھا جس کی ڈور اس کی ماں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں دیکھتا اور نظر انداز کر دیتا۔ کبھی کبھار ان زیادتیوں میں خود بھی شریک ہو جاتا۔

دادی ابا اور دانیہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ جو تحائف بھیجتے وہ اسے کبھی برتنا نصیب نہ ہو سکے تھے۔ اس کی ساس نے اس کے گھر والوں کو جولا رالگایا تھا کہ وہ لوگ کچھ عرصہ دینی کچھ عرصہ لاہور میں ہوتے ہیں سب جھوٹ تھا اس ایک سال میں اس نے دینی کی فضا تک کو محسوس نہ کیا تھا۔ دس ماہ کے اس عرصہ میں

ایسے فقط تین بار اس کی بات ہوئی تھی۔

اپنے گھر میں ایک سالن اپنی پسند سے نہ پکنے پر تماشا کھڑا کر دینے والی مہرالنسا کو سمجھ میں نہ آئی کہ وہ ان لوگوں کی زیادتیوں پر چپ بھی تو کیوں۔ شاید وہ اس دکھ کا ازالہ کرنا چاہتی تھی جو شاہو سے شادی کے انکار کی صورت میں دیا تھا۔ اس نے معاشی تنگی، بے رخی، طعنے ہر چیز برداشت کی تھی، پر کل جو اس کی ساس نے کیا تھا وہ برداشت نہ کر پا رہی تھی۔ اس کی ساس نے اس کی کمزوری دور کرنے کی جو دوا لا کر دی تھی وہ کھا کر تین گھنٹے بعد دروازہ کھولا جو صبح اس نے عبور کیا تھا وہ ایک طرف، اس انکشاف نے ہی اس کی پوری ہستی کو ہلا ڈالا کہ اس کی ساس نے اس کی کوکھ اجاڑ دی۔

اسے کبھی پتا نہ چلتا، اگر وہ ماں بیٹے کی گفتگو نہ سن لیتی جو اسی کے حوالے سے تھی۔

”یہ کیا کیا اماں! آپ نے اتنا برا قدم اٹھالیا۔ اگر یہ مر مر جاتی تو پتا ہے تائی پاکستان نہیں ہے۔ جہاں کوئی کسی کے ساتھ کچھ بھی کر ڈالے کوئی پوچھنے والا نہیں یہاں تو پولیس کو بھٹک بھی مل گئی تو فوراً دھر لیں گے ہم دونوں کو۔“

غنی کی بات سن کر وہ ایک دم دروازے کے اور قریب ہوئی۔

”ارے تو پیدا ہونے دیتی وہ سناپ کا بچہ۔ فکر مت کرو، ابھی ابتدائی ایام تھے۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بڑی ڈھیٹ ہے۔ میرے تو سینے کی آگ ہی تب ٹھنڈی ہو گئی جب اسے اس حال میں بھیجوں گی اس کے باپ کے پاس کہ بچان نہیں پائے گا اپنی لاڈلی کو۔ برسوں سے ٹھکرائے جانے کی جو آگ جل رہی ہے نامیرے اندر تو نہیں سمجھ سکتا۔ ان پڑھ گنوار کہہ کر ٹھکرایا اس کے باپ نے مجھے اور لے آیا پڑھی لکھی ناگن۔ اب دیکھو گا اس کی پڑھی لکھی نازک بیٹی کا یہ ان پڑھ گنوار کرتی کیا ہے؟“

اپنی ساس کی زہریلی آواز اور تنفر بھرا لہجہ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔

”میں تو کہتا ہوں اماں! ہر کاویہ مثلاً۔ اگلے مہینے آرہی ہے امریکا سے۔ اس نے اور اس کے سہیلیاں جان کھا لینی ہے ہماری۔ پکڑ کے سیدھا پولیس میں دے دیں گے کہ دوسری شادی کی اجازت کس نے دی۔ آپ کو پتا بھی ہے یہ نوکری یہ ٹھاکہ یاٹ میرے سر کی وجہ سے ہیں۔ پہلے تو چلو باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ وہیں تھی تا معلوم عرصہ کے لیے مگر اب انکل کی طبیعت ٹھیک ہے۔ آج ہی ٹینس کا فون آیا تھا۔“

غنی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس سے زیادہ سننے کا مہرالنسا میں یا رانا رہا تو وہ تورا کر نیچے آ رہی۔



ہادی کو اٹھائے وہ باہر آیا۔ آم کے گھنے بیڑے کے نیچے اپنی مخصوص جگہ پر وہ اسے بیٹھی دکھائی دی۔

”لو بھئی۔ وہ رہیں آپ کی ماما!“ اس نے ہادی کو گود سے نیچے اتارا تو وہ بھاگتا ہو پیچھے سے اس سے لپٹ گیا۔ اس کی جنت مکمل تھی۔ پر اسے یہ جنت بہت دعاؤں کے بعد ملی تھی اور اب وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

طلاق کے کاغذات ہاتھ میں لیے اجڑی بچڑی مہرالنسا جب نیم پاگلوں کی سی حالت میں ان کے پاس پہنچی تھی۔ دادی تو یہ دکھ برداشت ہی نہ کر پائیں اور اسی دکھ کو لیے دنیا سے چلی گئیں۔ یہ دو سرا برا صدمہ تھا جو ان کے خاندان کو جھیلنا پڑا تھا۔

مہو کی ذہنی حالت مہینوں ایسے ہی رہی۔ اماں اس کے غم سے بیمار رہنے لگے تھے۔ انہیں احساس جرم ستا کہ ان کی بیٹی کی حالت کی وجہ وہی ہیں۔ نہ وہ حوالی میں اپنی منگیترا (مہو کی ساس) کو ٹھکراتے نہ یہ ہوتا۔ پر کاتب تقدیر نے سب کچھ یونہی لکھا تھا۔ دانیہ اپنا گھر بار چھوڑ کے اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھی ان بہن بھائیوں کی محبت اسے پھر دنیا کی طرف کھینچ لاتی اور وہ ایک بار پھر ان کی مقروض ہو گئی تھی۔

میں نے ایک بار دیر کی تھی مہو! پر اب کی بار میں لی تست خود آزمانا چاہتا تھا۔ میں لمبے چوڑے رومے نہیں کروں گا، پر محبتوں کے سفر میں میں نے بڑے تھکے سنگ چلنا چاہتا تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس ایک رشتے کے جڑنے سے باقی رشتے ختم نہیں ہونے دیں گے۔ زندگی کے ہر دکھ سکھ میں تمہارا دوست رہے گا اور شہر بعد میں ہوں گا۔“

”میں تمہارے قابل نہیں ہوں شاہو!“ ہاتھوں میں چھوٹا کر دھوئی تھی۔

”تم کس قابل ہو، یہ میں اور میرا دل جانتا ہے۔“ وہ زہری سے اس کے ہاتھ تھام کر مسکرایا۔ ”پر اس بار بیٹوں گا میں ہی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے اور ایک بات اور۔“ وہ کچھ رک کے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”انکار کرنے سے پہلے ایک بار دادی کے خواب کی تعبیر تمہیں اور مجھے ساتھ دیکھنے کی تھی۔ چاچا کی بیمار آنکھوں میں چمکتی حسرت، جو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور یاد کر لینا اور یہ بھی یاد رکھنا کہ پھر زندگی میں بھی میری شکل نہیں دیکھ پاؤ گی۔“

”نہیں نہیں شاہو! مجھے چھوڑ کے مت جانا۔ میں بہت اکیلا ہوں۔“

اس کی آخری بات اسے ہولا گئی تھی۔ گزرتے دنوں نے ابا کی وفات کا غم بھی ان کی جھولی میں ڈالا مگر وہ مطمئن ہو کر اس دنیا سے سدھارے تھے۔ اپنی لاڈلی کو شاہو میرے سنگ خوش دیکھ کر وہ ان کی دوائی خوشیوں کی دکان پر تے چلے گئے۔

دانیہ اثر آتی رہتی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ مہو جو بھی کھنڈری، منڈا مائی ٹاپ لڑکی ہوتی تھی۔ ایسے بچوں کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے تھے۔ وہ سر تپا شاہو کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ کبھی گھبار مڑتے دنوں کی ناگوار یادیں ستائیں تو وہ اپنی پسندیدہ چھٹی چائے پیتی مگر جب دو تین گھنٹے بعد وہاں سے اٹھتی تو کھانسی کی ہستی مسکراتی مہو ہوتی۔

ہادی کی کھلکھلاانے کی آواز پر شاہو میرے چوکا پھر اٹھ کر انداز میں مسکرا دیا۔ ہادی مہو کے دوپٹے کا پلو

پکڑے پتا نہیں کیا کیا باتیں کر رہا تھا کہ مہو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی الوہی چمک شاہو کو یہاں تک محسوس ہوئی تھی۔ قریب آنے پر اس نے لپک کر ہادی کو گود میں اٹھایا، مہو کا ہاتھ تھاما اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔



مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں، کارٹونوں سے مزین

آفت طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

450/-

450/-

450/-

275/-

225/-

225/-

225/-

300/-

225/-

225/-

200/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

سلاطین

باقراویہی اپنے بھیلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنہ دینے رہتے ہیں۔ تقی کو شوہر میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رومی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔ شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لادلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساہر کو اس سے شدید جلن ہے وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساہر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساہر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی جچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا بنانے پر اس نے ساہر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساہر پر لگا دیا کہ ساہر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر ساہر کو دو پھیر مار دیتا ہے۔ ساہر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔ تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساہر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف کر دیتے ہیں مگر ساہر شفا سے بیرماندہ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود۔ جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوا دیتی ہے۔



کاسٹنگ ڈائریکٹر جاسم۔ تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں جہاں شفا کا گروپ لہر ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو سمیر اپنی منگیت کا گمان ہوتا ہے۔ رپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔

چھٹی قسط

”میں نے کہا تھا میں تمہارا اتنا اعلیٰ پورٹ فولیو بناؤں گی کہ بڑے بڑے پروفیشنلز بھی حیران رہ جائیں گے۔“

سمک اپنی کارکردگی سے بہت خوش تھی۔ خوش تو تقی بھی تھا۔ سمک نے واقعی بہت اچھا پورٹ فولیو بنایا تھا۔ جاسم نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ بہت پروفیشنل انداز میں کام کرتی تھی۔ بلکہ اسے فوٹو گرافی پر عبور حاصل تھا۔ تقی جانتا تھا وہ ہینڈ سم ہے۔ لیکن اتنا زیادہ ہے یہ آج تک اسے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔

”میں تو کہتا ہوں ان ہی تصویروں میں سے کوئی ایک بروکھوے کے لیے بھجوا دیتا۔“ سمیر نے تصویریں دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا تھا۔ اس وقت تو ہنسی مذاق میں بات مل گئی، لیکن اب کچھ روز سے تقی سوچ رہا تھا شاید بروکھوے کے لیے تصویر بھجوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ ممکن ہے اسے بنفس نفیس جانا پڑے۔ سمک کئی بار اسے گھر آنے کی دعوت دے چکی تھی۔

یہ خیال آتے ہی تقی نے غیر ارادی طور پر سمک کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بڑے انہماک اور جوش کے ساتھ اپنے آئی فون پر اس کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی خواہش میں جھٹلانا ہوتا اپنے بس کی بات ہی نہ تھی۔

”تم کیا کھاؤ گی؟ میں لے آؤں؟“ وہ دونوں ایک مشہور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں آئے ہوئے تھے۔ یہاں چونکہ سیلف سروس تھی۔ اس لیے تقی بوجھ رہا تھا۔ سمک نے بتایا تو وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ سمک نے گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نیلی جینز پر کالے رنگ کی ہاف سیلوزی شرت پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں اس کے کالی کھیڑی تھی جو وہ اکثر پہنے ہوتا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا۔ سمک ارسلان جیسی دلکش لڑکی کے ساتھ باہر آتے ہوئے بھی اس نے کوئی خاص تیاری کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ تقی کاؤنٹر کے پاس کھڑا لاروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور سمک اسے دیکھ رہی تھی۔

ان چند دنوں میں پورٹ فولیو تو جو بنا سوتا، اس دوران ان دونوں کے مابین بڑی اچھی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

سمک نے کئی بار سوچا۔ لیکن ہر بار وہ فیصلہ کرنے سے رہ جاتی تھی کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے دل کو تقی کی طرف کھینچ رہی ہے۔ کیا اچھی شکل؟ نہیں یہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں کہ سمک جیسی لڑکی کو بار بار ہوا محسوس کرے۔ وہ خود بھی کم خوب صورت نہیں تھی۔ پھر جتنے امیر باب کی وہ بنی تھی، ایک سے ایک اچھی شکل والا اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔

پھر شاید تقی کی بذلہ سنجی۔ اس کا اعلیٰ اخلاق؟ اس نے کئی بار اپنے دل سے کسوٹی کھینچی تھی اور ہر بار بس یہی نتیجہ نکال پاتی تھی کہ تقی ان لوگوں میں سے ہے جو جانے انجانے دوسروں کو اپنی محبت میں جھٹلاتے جانتے ہیں۔

”تقی! میں سوچ رہی تھی تمہارے پورٹ فولیو

ڈفرنٹ ایڈورٹائزنگ ایجنسیز میں بھجوانا۔“ تقی دایس آیا تو سمک نے اس سے کہا۔

”کیا فائدہ؟“ تقی نے زنگر زنگ کا بڑا سا نوالہ لینے کے لیے روتے ہوئے بری سی شکل بنا کر کہا۔ ”وہاں سے کوئی نہ کوئی آفر آجائے گی۔ جسے میں ابا کے ڈرامے کیل نہیں کر سکوں گا اور میری حسرتوں کی لسٹ میں ایک اور حسرت کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ کاسٹنگ ڈائریکٹر سے آفر آئی جائے۔“

”تم کتنے کانفیڈنٹ ہو۔ جیسے آفر آئی جائے گی۔“ سمک نے اسے چلانے کی غرض سے کہا۔

تقی ہنس دیا۔ لیکن کہا کچھ نہیں کہ وہ دونوں ہی جانتے تھے تقی کا پورٹ فولیو جس بھی ایجنسی میں بھجوا جائے گا وہاں سے آفر ضرور آئے گی۔

”ابا کا ڈرامہ درست سہی، لیکن میرا خیال ہے کہ اسٹاف چر کے لیے تمہیں یہ اسٹیپ تو لینا ہی پڑے گا۔“ چند منٹ بعد سمک نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”دعا کرو مجھے اچھی نوکری مل جائے۔ ابا کا لائق فائق بیٹا بن کر دکھاؤں تو انہیں میرے شوہر جو اس نے پر اعتراض نہیں ہو گا۔ یقیناً۔ شاید۔ پتا نہیں۔“ وہ اس معاملے میں خود بہت کنفیوز تھا۔

تقی ایسی ساری زندگی لودھی صاحب کے ساتھ گزار لینے کے باوجود وہ ابھی تک ان کے بارے میں کوئی درست فیصلہ نہیں کر سکتی تھیں تو تقی کو تو ابھی زیادہ ہی آئے جمعہ جمعہ اٹھ دن ہوئے تھے۔

سمک نے لگی۔

”اچھا۔ میرے ڈیڈی سے کب ملو گے؟“

”میں ان سے مل کر کیا کروں گا؟“ تقی نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میں بھی ایکٹنگ کا بہت شوق تھا۔ ڈیڈی کہتے ہیں۔ انہوں نے بہت بار آڈیشن بھی دیا۔ لیکن کوئی ان کی اپنی فلم ان کی ناقص ایکٹنگ کی وجہ سے فلاب کر دیتا تھا۔ اس لیے پاکستانی فلم انڈسٹری کو

ایک عظیم اداکار بننے سے رہ گیا۔“ سمک نے بڑے دلچسپ انداز میں بتایا۔

”میں چاہتی ہوں مستقبل کا ایک عظیم اداکاران سے ضرور مل لے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“

”کیا تم مجھے صرف اسی لیے ان سے ملوانا چاہتی ہو؟“ تقی سمک کو کہہ کر رہا تھا۔ لیکن پروسچ نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

”نہیں۔“ سمک کی مسکراہٹ بہت خاص تھی۔

”دیر از سم اسٹیبل ریزن۔“

اب کی بار تقی بھی کھل کر مسکرایا۔

”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے پروپوز کر رہی ہو؟“

اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے زور دے کر بولی۔ ”لڑکیاں پروپوز کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ پروپوز تو تم ہی کرو گے۔“

”ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟“

”نہیں! کھانا بنانا تو نہیں آتا۔“

”اوپ۔“ اسے مایوسی ہوئی۔ ”مجھے کھانا کھانے کا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول



ایک عظیم اداکار بننے سے رہ گیا۔

قیمت - 300 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

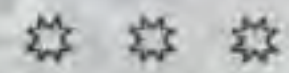
بہت شوق ہے۔ اس لیے میری بیوی کو کھانا بنانا ضرور آنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ بہت اعلیٰ قسم کی بریانی کٹا کٹ اور پائے بنائے گی تو میری اس سے محبت میں بے تحاشا اضافہ ہوگا۔ اس نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔

”یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں کھانا بنانا سیکھ لوں گی۔“

”اچھی طرح سوچ لو میڈم! مجھے کھانا کھانے کا جتنا شوق ہے، میں اپنے کھانے پینے کے معاملے میں اتنا سیلیکٹو بھی ہوں۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہرگز نہیں ہوگا۔“ تقی نے اسے ڈرایا۔

”یہ سوچنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے کہ تمہارے ساتھ زندگی آسان ہوگی یا نہیں۔ البتہ کھانا بنانا میں سیکھ لوں گی۔“ وہ بہت پراعتماد تھی۔

ایک لعلق جو بہت خاموشی سے ان دونوں کے درمیان اپنی جگہ بنا رہا تھا، لفظوں میں ڈھل کر مضبوط ہو گیا تھا۔



ساہر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ خوشی سے چیخ چیخ کر سارا گھر سرراٹھالے۔

”تقی! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ اتنے سالوں کے بعد۔ اور تم کتنے پینڈ سم ہو گئے ہو۔“

”ہو گئے ہو سے کیا مراد ہے؟“ تقی نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ میں اور زیادہ پینڈ سم ہو گیا ہوں یا یہ کہ میری وجاہت کو چار چاند لگ چکے ہیں۔ کیونکہ میں تو پہلے بھی پینڈ سم ہی تھا۔ البتہ تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے کہ کوئی تو تم پہلے بھی نہیں۔ اب تو موتی اور بھدی بھی ہو گئی ہو۔“

اس نے جتنی سنجیدگی اور مایوسی سے کہا تھا اتنا ہی بے ساختہ عمیر کا تقہر تھا۔

”اس بات پر آپ بہت خوش ہوئے ہیں غیر بھائی! میرا خیال ہے نتائج بولنے کی ہمت آپ ساری زندگی نہیں کر سکتے تھے۔“ وہ شرارت پر آمادہ تھا۔

”اسی لیے تو خوش ہو رہا ہوں کہ کوئی تو ہے! میرے دل کی بات کہہ سکتا ہے۔“

”اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ساہر نے آپ پر کتنی بیویوں کی طرح رعب بہت رکھا ہوا ہے کہ آپ اپنے دل کی بات نہیں کہہ پاتے یا پھر یہ کہ آپ بھی اس کی بد صورتی سے خائف ہو کر زبان بند رکھتے ہیں۔“

”بس بھائی! کیا باتوں تمہیں۔ ہم تو دونوں طرح سے ہی بچنے ہوئے ہیں۔“ عمیر نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”اب ٹھنڈی آپیں نہ بھریں۔ اپنے پاؤں پر کھڑی تو آپ نے خود ہی ماری ہے۔“ تقی کی اس بات پر تو ساہر نے اسے کشن ہی کھینچ مارا۔ تقی نے لیکن اس کی ذرا پروا نہ کی۔

”ہاں! تو میں جھوٹ تھوڑا ہی بول رہا ہوں۔ محبت کی شادی میں یہ بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ پھر آپ کسی دوسرے کو الزام نہیں دے سکتے۔ اپنی غلطی کو میڈل بنا کر ساری زندگی گلے میں لٹکانا رہتا ہے۔ لیکن مائیں عمیر بھائی! ہم نے تو شکر ادا کیا تھا کہ کسی نے تو ہماری بد صورت ساہر کو پسند کیا۔ ورنہ ہمیں تو اسے اپنے سرکل میں انٹروڈوس کرواتے بھی شرمندگی ہوتی تھی کہ کہاں ہم اتنے پینڈ سم اتنے سوہنے بھائی اور کہاں یہ رنج کے کوئی لڑکی۔“

اس نے مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دی۔

”بس کرو تقی! تمہاری وجاہت کو چار چاند لگے ہوں یا نہیں۔ لیکن زبان کو ضرور لگ چکے ہیں۔“ ساہر نے کہا۔

تقی شرارت سے ہنستا رہا۔ پھر عمیر سے مخاطب ہوا۔

”میری باتوں کو سنجیدگی سے مت لیجیے گا عمیر بھائی! امی کہتی ہیں، تقی کو بک بک کرنے کی عادت ہے۔ ساہر تو ہماری بہت پیاری بہن ہے۔ ایٹ لیسٹ مجھے اور میری اماں کو اب تک آپ سے گلہ ہے کہ ساہر کو ہم سے دور کر دیا۔“

اس کا لہجہ سادہ تھا۔ لیکن سنجیدہ بھی۔

”میں نے کہاں دور کیا یا راؤ! وہ تو آپ کے والد صاحب ہی ملنا پسند نہیں کرتے۔ ورنہ ساہر سے پوچھ رہی ہوں کہ کئی بار اس سے کہا کہ یہ جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ میں بھی اسے ملوانے لے جا سکتا ہوں۔“

”جی، اور اصل ضد کے معاملے میں ساہر اماں کی فونو ہائی ہے۔“ تقی نے کہا۔ ”نیرامی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔“

”تم ان کو بھی ساتھ لے آتے تھے۔“

”تم ان کو نہیں جانتیں؟ تمہیں یاد تو بہت کرتی ہیں، موتی بھی ہیں، لیکن اماں کی بات ان کے لیے پتھر کی ٹکڑی ہے۔ جب تک اماں اجازت نہیں دیں گے۔ وہ کڑھتی رہیں گی۔ لیکن ان کی حکم عدولی نہیں کریں گی۔ لیکن خیر۔ میں آگیا ہوں نا۔ ان کو بھی لے ہی آؤں گا۔“ تقی کا لہجہ مضبوط تھا۔

”تقی! تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں ساہر کو سمجھاتا ہوں کہ ضد چھوڑ کر اپنے تایا بابا سے ملے۔ لیکن یہ واحد بات ہے میری جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تم سمجھاؤ۔ شاید سمجھ لے۔ مجھے دراصل اس وقت جانا ہوگا۔ آفس سے ایک اہم کل آرہی ہے۔ البتہ تم برا نہیں مانو گے۔“ عمیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

پھر عمیر چلے گئے تو وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر تقی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کلب آتے جاتے رہنا تقی۔“

”ہاں! میں دوبارہ آؤں گا اور اگلی بار میرے بھانجا بھانسی کو بے وقت مت سلاتا۔ میں ان کے ساتھ کھیلتا چلتا ہوں۔ کتنے پیارے ہیں دونوں۔ بالکل اپنے اپنے تقی جیسا کہ ہیں۔“

اس کی کن ترانیاں کسی حال میں ختم نہ ہوتی تھیں۔ تب ہی اس نے دیکھا۔ دروازے کے دوسری طرف ایک ہرا آچل عائب ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ دل کہیں اور اٹکا ہوا تو رنگ برنگے آنکھوں کی کون پروا کرتا ہے۔ بھاڑ میں جا میں سب۔



تقی، عادل اور ہدیہ کی تصویریں اپنے موبائل فون میں کھینچ لایا تھا۔ امی ہر دو گھنٹے بعد نکلا کر ایک گھنٹہ دیکھتیں۔ نہ وہ دیکھ دیکھ کر تنگ آرہی تھیں۔ نہ تقی دکھا دکھا کر تنگ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار کہتیں۔

”ماشاء اللہ کتنے پیارے ہیں دونوں۔“

”مجھ پر گئے ہیں۔ پیارا تو ہوتا ہی تھا۔“ وہ بھی ہر بار ایک ہی بات مختلف انداز سے کہہ دیتا تھا۔

”مجھے یاد آیا تقی! ساہر کی تو ایک بڑی پیاری سی منہ بھی تھی۔“ انہیں کچھ خیال آیا تو کہا۔

”آپ نے پہلے نہیں بتایا کہ اس کی کوئی منہ بھی ہے۔ اور یہ کہ ”پیاری“ بھی ہے۔ پہلے بتا دیا ہوتا تو میں اس کی بھی تصویر لے آتا۔“

”تم تو جب بھی بولنا، الٹا ہی بولنا۔“ وہ پھر سے تصویریں دیکھنے لگیں۔

”امی! آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ساہر سے ملواتا ہوں۔“

امی نے اسے دیکھا۔ ایک افسردہ آہ بھری۔ یہ ایسی ہی آہ تھی جسے تقی ہمیشہ فلم اشار شکنم کی آہ سے تشبیہ دیتا تھا۔

”تمہارے ابا کو بتا چلا تو بہت دوا دلا کریں گے۔“

”انہیں کون بتائے گا امی! آپ نے بلا وجہ ابا کو ہوا

بنا کر سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں۔ یہ دراصل ابا کو غیر ضروری اہمیت دینے کا نتیجہ ہے کہ وہ اتنا سر چڑھ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں تاکہ انسان کو اس کے ظرف سے زیادہ ملنے لگے تو وہ خود کو انسان نہیں سمجھنے لگتا ہے۔“

وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ ٹانگیں سامنے دوسری کرسی پر پھیلا رکھی تھیں اور لیپ ٹاپ ٹانگوں پر رکھا تھا۔ انگلیاں کھٹا کھٹ چل رہی تھیں۔ ساتھ میں زبان بھی فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انگلیاں زیادہ تیز چل رہی ہیں یا زبان۔

”خدارا آہستہ بولو۔ انہوں نے سن لیا تو قیامت

اٹھادیس گئے۔ ”امی نے دہل کر کہا۔
 تقی نے قہقہہ لگایا۔ ”میں نے کہا تھا آپ نے بابا کو
 ہوا بنا کر سر پر سوار کیا ہوا ہے۔ بھی! جن کے خوف
 سے دہل رہی ہیں۔ وہ گھر پر ہیں ہی نہیں۔“
 ”ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئی۔“ امی نے جھینپ
 کر کہا۔

”اچھا تو پھر چلتی ہیں؟“
 ”جانتے نہیں کیا ان کی ضد کو۔ ذرا بھی ان کی حکم
 عدولی ہوئی تو مجھے تو فوراً بے دخل کر دیں گے۔ میرے
 منہ میں خاک۔ میں اس عمر میں کوئی تماشا نہیں
 چاہتی۔“ وہ خود عاجز تھیں۔

”امی! کبھی سوچا ہے کہا ایسے کیوں ہیں؟“
 ”بس بیٹا! کچھ چیزیں قسمت میں لکھی ہوتی ہیں۔
 ہم جتنا بھی زور لگالیں، انہیں بدل نہیں سکتے۔ تمہاری
 وادی کا تو ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ سوتیلی
 ماں کے ہاتھوں پلے۔ بچپن کی کچھ محرومیوں نے
 انہیں ضدی بنا دیا۔ اپنی پہچان بنانے نکلے تو زمانے کی
 ٹھوکروں نے مزاج میں سختی بھر دی۔ اسی سخت مزاجی
 اور ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر باپ کے ترکے کو لات
 مار آئے۔ پھر اپنی پہچان تو بنائی۔ لیکن غرور آگیا کہ جی!
 جو کیا، خود کیا، جو کمایا، خود کمایا۔ باپ کا سہارا نہیں لیا۔
 وہ تم لوگ کیا کہتے ہو۔۔۔ سلف میڈ۔۔۔ ہاں!
 تمہارے ابا سلف میڈ ہیں۔ تمہارے چچا کو تو اب
 تک اس بات کے طعنے دیتے ہیں کہ انہوں نے باپ کی
 چاکری کی۔“

اسی وقت امی کے ہاتھ میں پکڑے اس کے موبائل
 فون کی بیل بجنے لگی۔ انہوں نے اسکرین کو دیکھا۔ پھر
 چہرے کے اوپر سے اسے گھورا۔

”یہ کون ہے؟“
 تقی نے ایک نظر ایل سی ڈی کو دیکھا۔ پھر مسکرایا
 کہ نمبر کے ساتھ مک کی تصویر بھی نمایاں تھی۔

”آپ کی ہونے والی ہو ہے۔“
 ”اس سہل یہ ساتویں لڑکی ہے۔ جس کے بارے
 میں تم یہی بات کہہ رہے ہو۔“

”ان چھ کے بارے میں بھی میں نے یہی کہا تو
 کیا؟“ اس نے پرسوج انداز میں پوچھا۔ پھر خود ہی ہنس
 دیا۔
 ”یہ ساتویں ہے امی! لیکن یہی آخری بھی ہے۔
 یہی آپ کی بہو بنے گی۔“ اس نے فون ان سے لے کر
 کال کٹ دی۔

”اپنے بابا کو جانتے ہونا۔ انہیں بتا چلا تمہاری
 پسند ہے تو اڑ جائیں گے۔“ امی نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”او میری بھولی ماں! جب ٹھٹھن برہ جاتی ہے تو
 ٹھنڈی ہوا کے لیے کھڑکی کھول لی جاتی ہے۔ بابا کی
 پابندیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم بھی کھڑکی کھول
 لیں گے۔“ اس کا انداز سادہ تھا۔
 ”مطلب؟“ وہ الجھیں۔

”رضی نے بھی تو پسند کیا تھا نا بھابی کو؟ لیکن
 شادی اتنی پلاننگ سے ہوئی کہ اباب تک سمجھتے ہیں
 بھابی ان ہی کی پسند کی ہوئی ہیں۔ ہم بھی کوئی ایسی
 چالاک کریں گے کہ ابا کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں
 ہوگی۔“
 وہ مطمئن سامو بائل لے کر اٹھ گیا۔

تعلق کی نوعیت بدلی تو حق بھی جتایا جانے لگا۔
 مک نے اس کے منع کرنے کے باوجود اس کا پورٹ
 فولیو مختلف ایجنسیز میں بھجوا دیا تھا اور توقع کے عین
 مطابق فوراً ہی دو ایجنسیز سے کال بھی آگئی تھی۔

”میری مانو۔ ان میں سے کسی ایک کو ضرور اوکے
 کرو۔“ مک نے کہا۔

”دیکھو! ڈراما تو تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ ہی
 کرنا ہوگا۔ لیکن یہ دونوں بھی اچھی آفرز ہیں۔ ان پر
 بھی غور کر لو۔ تمہیں زیادہ ٹائم بھی نہیں دینا پڑے گا
 اور میڈیا کی نظروں میں بھی آجاؤ گے۔“ جاسم اور مک
 مل کر اس پر دباؤ ڈال رہے تھے۔

”بابا کی نظروں میں بھی آجاؤں گا۔“ اس نے کہا۔
 ”ابا سے ڈرتے رہو گے تو ترقی نہیں کر سکو گے۔“

جاسم نے اسی کے انداز میں کہا۔
 ”اچھا! کیا اسے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔
 اب وہ تم خود نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کے لیے مجھے
 اس فورس کر رہی ہو؟“ وہ الجھا ہوا تھا۔ مک سے
 پرہیز پند۔

”کیونکہ میں تمہارے ساتھ ایک بھرپور زندگی
 گزارنا چاہتی ہوں۔“ مک نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”اچھی زندگی کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے کیا مجھے
 نہیں بتاؤ گے؟“

مک کیا کہہ رہی تھی، تقی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔
 تقی بھی کسی گئے گزرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا
 تھا۔ لیکن مک کے والد کا مقابلہ بہر حال نہیں کر سکتا
 تھا۔ وہ لوگ جدی پشتی رئیس تھے نہ صرف یہ بلکہ
 اس کے والد اور بڑے دونوں بھائی اچھے عہدوں پر
 تھے۔ مک نے اسے پسند کر لیا تھا۔ اب اسے اپنے
 اسٹیلز تک لانا چاہتی تھی۔ تقی کو اس کی باتوں سے
 سخت حسوس ہوئی۔ اس نے مک کو خوب کھڑی کھڑی
 سنائیں اور ان دونوں کا جھگڑا ہو گیا۔ لیکن دو روز بعد
 اس نے جاسم کے ذریعے اس ماڈلنگ کے لیے ہائی
 پری۔ سب باتوں پر غور کیا تھا۔ اسے ترقی تو کرنا ہی تھی
 اور کیا برا تھا کہ اپنی پسند کی فیلڈ جوائن کر لیتا۔ چھوٹے
 بڑے انٹریز اب تک بہت چلائے تھے۔ محبت پہلی بار
 کی تھی۔ سو مک سے دست برداری اسے منظور نہیں
 تھی۔

”ابا کو غصہ آئے گا۔ لیکن زیادہ سے زیادہ کیا کر لیں
 گے۔“ چنچیں چلائیں گے ہی نا۔ گولی تو نہیں مار دیں
 گے۔“

اس نے سوچا اور یوں جو کام اب تک وہ خود نہ کر سکا
 فلسفہ اس سے مک کی محبت نے کروالیا۔

فوٹوشوٹ مکمل ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے
 کہ اسے مختلف ایجنسیز کی طرف سے پیش کش
 مسلسل ہونے لگیں۔ کچھ نیوی گمرشلز تھے۔ اس کی

تصویریں بڑے بڑے بل بورڈز پر لگتیں تو وہ دنوں میں
 مشہور ہو جاتا۔ اس نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ ابا کی
 خفگی کا ڈر تو بہر حال تھا۔ لیکن ایک نئے نئے میوزک
 بینڈ کی میوزک ویڈیو کی پیش کش اسے قابل غور لگی۔
 اس ویڈیو کو مل ایسٹ میں آن ایر ہونا تھا۔ پاکستان اور
 انڈیا کے لیے اس بینڈ کے ممبرز نے کسی انڈین ماڈل کو
 لینے کا سوچ رکھا تھا۔

بینڈ نیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گانا مطلوبہ
 رینگ حاصل کر بھی سکے گا یا نہیں۔ یوں یہ گھانے کا
 سودا ہوتا، لیکن تقی کو رسک لینے کا شوق تھا۔ سو اس
 نے ہائی بھر لی۔

”تو پنے گا بھائی! تو بہت پنے گا۔“ سمیر ہر بار یہی
 کہتا۔

”تیری زبان کالی ہے سمیر! سوچ سمجھ کر بولا کر۔“
 تقی نے اس روز کہا۔

”اگر اتنی کالی ہوتی تو میری منگنی ثمر سے نہ ہو رہی
 ہوتی۔“ سمیر نے منہ بگاڑ کر کہا۔

”تصویر دیکھ لی؟“
 ”کہاں یار! ابو نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ میری تمام
 امیدوں پر پانی پھیریں گے۔ اتنی کوشش کی کہ کسی
 طرح تصویر دکھادیں۔ لیکن انہیں میری بات بھول ہی
 نہیں رہی۔“ اس کے اپنے دکھڑے تھے، جنہیں تقی
 سن ہی سکتا تھا۔ سلجھانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ سو
 وہ سنٹارہا۔

اور ہوا بھی وہی، جس کا ڈر تھا۔ عین اس لمحے جب
 وہ انگوٹھی پہنانے لگا۔ عقدہ کھلا کہ یہ ظالم وہی ہے،
 جس نے کبھی سی جان پر ظلم ڈھایا تھا۔

بد بخت فوٹو گرافر نے بھی عین اسی لمحے تصویر کھینچنا
 تھی۔ اب تصویر کچھ یوں آئی کہ ہاتھ میں ہاتھ تو تھا۔
 لیکن سمیر کا منہ بوکھلا ہٹ سے ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ شرکی
 آنکھوں میں بے یقینی اور غصہ چمک رہا تھا۔
 سمیر اسی بوکھلا ہٹ میں رک گیا۔ اس نے ثمر کا ہاتھ

چھوڑ دیا۔

”کیا ہوا سمیرا انگوٹھی پہناؤ۔“ ساتھ بیٹھے ابو نے شوکار دیا۔ لیکن وہ اس سے مس نہ ہوا۔

اس کے ابو اس کے ساتھ جبکہ ٹھیکل انکل شمر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں کی والدائیں ساتھ والے صوفوں پر۔ بہن بھائی کزنز وغیرہ بھی اسی طرح آمنے سامنے یہاں وہاں بکھرے تھے۔

سمیر نے فیصلہ کیا۔ وہ اس بد تمیز لڑکی کو انگوٹھی نہیں پہنائے گا۔ تقدیر کے اس غلط فیصلے کو وہ اپنی تدبیر سے بدل دے گا۔ لیکن اتنی ساری نظریں اس پر مچی تھیں۔ وہ سٹپٹا گیا۔ ابو بھائی تو دو تین بار اسے انگوٹھی پہنانے کا کہہ بھی چکے تھے۔ لیکن اسے لگ رہا تھا ہاتھوں میں جان ہی نہیں رہی کہ انہیں حرکت دیا جائے۔

”میرا خیال ہے سمیر خوشی کے مارے ٹرانس میں چلا گیا ہے۔ اس لیے انگوٹھی اب تک ہاتھ میں پکڑے بیٹھا ہے۔“ یہ چمکتی ہوئی آواز اس کے بڑے بھائی کی تھی۔ ”ابو! آپ ہی انگوٹھی پہنا دیں۔ پتا نہیں سمیر کا ٹرانس کتنا طویل ہو جائے۔“

اس بات پر حتمیہ گونجے تھے۔ معا ابو نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی۔

”تب تو یہ فرض میں ہی پورا کر دیتا ہوں۔“ انہوں نے خوشگواریت سے کہتے ہوئے آگے ہو کر انگوٹھی شمر کی انگلی میں ڈال دی۔ اسی طرح ٹھیکل انکل نے اس کو انگوٹھی پہنا دی۔

مبارک سلامت کے شور میں کھٹاکھٹ تصویریں کھنچواتے ہوئے وہ دونوں جیسے ایک دوسرے کا خون پی جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت خاموشی میں ہی فاصلت تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ بظاہر۔

”میں مرجاؤں گی۔ لیکن تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔“ کسی تصویر کے لیے مسکراتے ہوئے شمر نے دانت کچکا کر اچانک مست وحشی آواز میں کہا۔ اس کی آواز سمیر نے سنی تھی اور تاثرات کمرے نے کچھ کیے تھے۔

”فکر نہ کرو۔ تم سے شادی کر کے مجھے بھی زندگی برباد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ جواب دے مارنے سے وہ بھی نہیں چوکا۔ لہٰذا تو تھا نہیں۔ شوٹنگ کی وجہ سے آئیں سکا تھا۔ ہوتا تو کوئی اور مشورہ دیتا۔ ناچار اس نے سارا قصہ رو حیل سے کر سنایا اور رو حیل نے اپنی عقل کے حساب سے مشورہ بھی دے دیا۔ سمیر صاحب کو ہر کام کی جلدی رہتی تھی سو گھر آتے ہی اس کے مشورے پر عمل کر ڈالا۔

”ابو! میں اس لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ میں نے بتا دیا ہے بس۔“

”یہ بات مجھے نہ بتاؤ۔ ہال میں موجود ہر بندہ تمہاری شکل دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ تمہارے دل میں کیا چل رہا ہے۔“ اس کی بات سن کر ابو کے اندر کا جلاو جاگ اٹھا تھا۔ انہوں نے اتنی مروت بھی نہ کی کہ رو حیل بھی اس کے ساتھ انکار کی عرضی لے کر آیا تھا۔

”اچھی لڑکی ہے شمر۔ ٹھیکل سے میری کتنی پرانی دوستی ہے۔ ایک ایک فرد کو جانتا ہوں میں اس کے گھر میں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں یہ کیا سوچھی کہ انکار کرتا ہے۔“

”دھم میں دراصل۔“ وہ بوکھلا گیا۔ بے شک ابو سے اس کی دوستی تھی۔ لیکن تھے تو وہ ابو ہی نا۔ انکار کے پس پردہ اس کی حرکت کا سن کر بھڑک جانا لازمی امر تھا اور سچ بات یہ ہے کہ یہی بات اسے زیادہ بوکھلا ہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

”اچھو جی انکل! سمیر کسی اور کو پسند کرتا ہے۔“ معا رو حیل نے کہا۔ ابو تو ابو سمیر نے بھی اسے حیرانی سے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

”کیا یہ سچ ہے سمیر! ابو نے چند منٹ بعد سرد مہمی سے پوچھا۔ سمیر نے اثبات میں گردن ہلا دی کہ شاید اسی طرح جان چھوٹ جائے۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ امت ہی نہ ہو رہی تھی۔

”باب کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ سمیر نے اسے گورنر کر دیا۔ اب ایسی سخت دھمکیاں تو نہیں دی جاسکتی۔“

”ابو! اب میری بات تو سنیں۔“ وہ منمنایا۔

”نہیں! سننا کچھ بھی۔ فوراً“ چلے جاؤ یہاں سے اور انکا ایک مہینہ مجھے اپنی شکل بھی نہ دکھانا۔ ورنہ تمہاری جگہ میں خود کشی کر لوں گا۔“

سمیر کو اپنا سامنے لے کر باہر آنا پڑا۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ آخر کس دیوار سے جا کر سر پھوڑے کہ معاملہ سلجھ جائے اور اس کو کسی کے سامنے شرمندہ بھی نہ ہونا پڑے۔

”اگر میں یہ ثابت کروں کہ شمر ہی کسی اور میں شرمندہ ہے۔ اس کا کسی کے ساتھ اتنا اسٹرانگ انفرینس نہیں ہے کہ وہ مجھ سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتی۔“

اس نے اپنی سوچ کو خود ہی مسترد کر دیا۔

”شمر میں یہ ثابت کر دیتا ہوں کہ میرا کسی کے ساتھ انفرینس ہے۔“ وہ نہیں نایار۔ ”وہ دیر تک الجھا رہا اور سمجھ گیا ہوا؟“ وہ کمری نیند میں تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”ابو! کہہ رہے ہیں۔ وہ ٹھیکل انکل کو انکار نہیں کر سکا۔ بلکہ تمہیں قن کر دیں گے۔“ سمیر ہلے لی کہ کمری نیند سے جگایا گیا تھا۔ اس بات پر دل تھام کر

دوبارہ مگر گیا۔ چند لمحہ بعد احساس ہوا اس کا بھائی مذاق کر رہا تھا۔

”اگر اتنی صبح تم مذاق کر رہے ہو تو مذاق کرنے کے لیے تم نے انتہائی برا وقت چنا ہے۔“ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ جواب میں اس کا بھائی ہنسنے لگا۔

”میں تمہیں گھنٹہ بھر سے جگا رہا ہوں۔ لیکن تم تو مردوں سے شرط لگا کر سو رہے تھے۔ اسی لیے مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔“ خیر! پرسوں تم نے مجھ سے جو پولیس بی لی تھی وہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دو اور آئندہ مانگنے کی غلطی بھی مت کرنا۔ تم جیسے وعدہ خلاف آدمی کو کوئی چیز ادھار دینے سے اچھا ہے۔ انسان اپنی چیز کنویں میں ڈال آئے۔ لیکن تمہیں ادھار نہ دے۔“ وہ جو نا بھلو کر لگا رہا تھا۔ سمیر کو آگ ہی لگ گئی۔

”یہ پکڑو اپنی پولیس بی۔“ اس نے اٹھ کر اسٹڈی ٹیبل کی دراز سے پولیس بی نکال کر اس کے ہاتھ پر پٹختی۔ ”اور اب میرے جوتوں کی طرف بھول کر بھی نظر نہ ڈالنا۔“ اس نے بھی فوراً حساب برابر کر دیا۔ اس کا بھائی ناک سے مکھی اڑاتا باہر نکل گیا۔ پھر واپس آیا۔

”بائے داؤے ابو واقعی تمہیں قن کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ اس کی لگائی ہوئی آگ کی چنگاریاں تیزی سے سمیر کی طرف آئی تھیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ کر گیا۔ ”یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے۔ میرے ابو کم لہجے کے ابا زیادہ لگ رہے ہیں۔“ اس نے سوچا۔ پھر غصے سے رو حیل کے کانوں میں لگائے ہیڈ فون کا تار کھینچ دیا۔ ”کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ وہ لیپ ٹاپ پر کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ ہڑبڑا گیا۔

ایکٹ کیا اور مار کھائی۔ اب تم ہر بات کا الزام مجھ پر ڈال رہے ہو۔ بڑے ہی عجیب آدمی ہو بھی تم تو۔" روجیل کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ ثابت ہو رہا تھا۔

سمیرا دل ہی دل میں کھسیا گیا۔
"میں نے سوچ لیا ہے اب کیا کرنا ہے۔ مجھے تم جیسے کسی تالاق دوست کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے بھی خود کو منہ پھٹ ثابت کیا اور کروٹ بدل لی۔

پھر اس نے عقل مندی کی حد کر دی۔ ساری بات جا کر اماں کے گوش گزار کر دی۔
وہ کھانے پینے کی شوقین تھیں۔ اس روز وہ دو چرخے اور نان لے آیا۔ ساتھ میں راستہ سلاڈ بیٹھے میں فالو وہ دونوں ماں بیٹا نے کمرے میں بند ہو کر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اماں خوب خوش ہو چکیں تو مدعا بیان کیا۔ اماں ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیا؟ شادی شدہ ہے؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اور اپنے اماں کی مانو۔ میں تو ساری زندگی یہی دیکھتی آرہی ہوں کہ انہوں نے ایک بھی ڈھنگ کا دوست نہیں بنایا۔ یہ ٹھیک تو کالج کے زمانے سے ہی جھوٹا مشہور ہو چکا تھا۔ تمہارے ابو خود ہی مجھے ہنس ہنس کر اس کے قصے سنایا کرتے تھے۔ بتاؤ۔ اتنا جھوٹا دوست اور وہیں بیٹے کا رشتہ جوڑ دیا جو اپنی پہلے سے بیابانی بیٹی ہمارے سر منڈھ رہا ہے۔" وہ تو لال پیلی ہوئی جا رہی تھیں۔

"اماں! اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی کسی ہوئی ہر بات ہمیشہ ہی سچ ثابت ہوتی ہے۔" سمیرا نے ان کی ولایت پر سر دھنتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد ہے کئی سال پہلے ابو نے ان ہی ٹھیک انکل کے ساتھ مل کر کوئی کاروبار شروع کیا تھا اور آپ نے اس وقت بھی بہت مخالفت کی تھی۔ لیکن ابو نے آپ کی ایک نہیں مانی تھی اور بعد میں اسی کاروبار کی وجہ سے ان دونوں دوستوں میں کھٹ پٹ بھی ہو گئی تھی۔" وہ سوچ سوچ کر اور اماں کے تاثرات کن اکیوں سے دیکھ دیکھ کر بول رہا تھا۔

"ہاں تو تمہارے ابو نے کبھی میری کوئی بات نہیں کہی جو اس وقت مانتے۔ وہ تو اب تک نہیں مانے۔ لیکن خیر۔ مجھے پروا نہیں ہے۔ آخر کب تک پروا کرتی۔ اسی لیے چھوڑ دی۔"

"مجھے تو لگتا ہے اماں! ابو میرا رشتہ بھی ٹھیک کی بیٹی سے اسی لیے کر رہے ہیں۔ تاکہ اپنی بیٹی کی دوستی کو دوبارہ جوڑ سکیں۔" وہ بڑی محبت سے ان کے گھٹنے دبانے لگا۔

"اے ہے۔ اب ایسا اندھیر بھی نہیں چاکر کسی کی دوستیاں جوڑنے کے لیے میں اپنے بیٹے کو صوبہ بن جانے دوں۔" اماں نے تڑپ کر کہا۔ ساتھ ہی بائیں ٹانگ بھی اس کے آگے کر دی۔ "مجھے ذرا سوچنے دو مجھے اب کیا کرنا ہے۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ سمیرا جانتا تھا اب کچھ نہ کچھ کر کے اس مصیبت کو اس کے سر سے ہل ہی دیں گی (اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے لیے وہ بہت دیر تک ان کی ٹانگیں دبا سکتا تھا) اور اس کا گمان کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ایسا اگلے دن کو چرھنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ شام کو ہی شمر کے گھر پہنچ گئی تھیں۔

دوسری جانب شمر بھی اپنی امی کو سمیرا کے متعلق ہلکی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ لیکن فوری طور پر انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ شمر کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اپنے پیارے اس بارے میں کوئی ذکر نہ کرے۔ شمر کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوتے خاموش رہنے کی تاکید کیوں کر رہی ہیں۔ لیکن امی نے اس کے اعتراض کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی انہوں نے اسے باور کروایا تھا کہ اس کوئی ٹھیک خاموش رہنا چاہیے اور یہ کہ وہ اس کی دشمنی میں جو بھی کریں گی اس کی بھلائی کے ہر پہلو کو دیکھ کر کریں گی۔ لیکن اسی شام سمیرا کی اماں آگئی۔

فردا بھی ذرا اکھڑ مزاج خاتون تھیں۔ پھر شمر سے رشتہ بدل سے راضی بھی نہیں تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اتنے حساس موضوع پر کچھ اس طرح بات کی کہ شمر کی اسی تحمل کا مظاہرہ کرتے کرتے بھی بھڑک اٹھیں۔

"میری بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھانے سے پہلے آپ کو اپنے بیٹے کی حرکتوں کا ٹولہ لینا چاہیے تھا۔" شمر کی امی نے غصے سے کہہ دیا۔

"کن حرکتوں کی بات کر رہی ہیں؟" سمیرا کی اماں نے ٹھیکے انداز میں پوچھا۔ جواب میں شمر کی امی نے انہیں ساری بات بتا دی۔ بیٹوں کی مامیں ویسے ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ سمیرا کی اماں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ نتیجتاً ایک نہ ختم ہونے والی بحث کا آغاز ہو گیا۔ جس کا اختتام سمیرا کی اماں کی جانب سے انفرادی طور پر رشتہ ختم کرنے کی بات پر ہوا۔

"اپنی بیٹی کے طلاق یافتہ ہونے کی بات چھپانے کے لیے میرے بیٹے پر انگلی اٹھا دی۔ یہ تو میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔"

انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔ اس وقت تک شمر کے پاپا بھی آپکے تھے۔ سمیرا کی اماں کے جاتے ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"وہ اتنی باتیں سنا کر چلی گئیں اور آپ خاموش رہے؟"

"تو میں کیا کرتا؟ ان کا سر پھاڑ دیتا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی۔ لیکن آپ کو کچھ تو کہنا چاہیے تھا۔"

"مجھے اب جو بھی کہنا ہے فاروق سے کہوں گا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آخر ان لوگوں کو اتنی بڑی غلطی ہو کیسے گئی۔ کسی نے تو ان تک یہ بات پہنچائی ہوگی۔"

"ہاں! وہ کہہ رہی ہیں کہ شمر کی کسی شفا نامی سہیلی نے بتایا ہے کہ شمر طلاق یافتہ ہے۔" شمر کی امی نے غصے سے کہا تھا۔ "سوال یہ نہیں کہ کس نے بتایا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے کروت پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک من گھڑت کہانی بنا رہی ہیں۔ آپ فاروق

بھائی سے بات ضرور کریں، لیکن کسی مصالحت کے لیے نہیں بلکہ رشتہ ختم کرنے کے لیے۔ میں ایسے تھوڑے لوگوں میں اپنی بیٹی ہرگز نہیں دوں گی۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ شفا نے ایسی بات کی ہوگی۔ وہ اتنی اچھی سہیلی ہے شمر کی۔ ایسی بات کس طرح کر سکتی ہے ان لوگوں نے ضرور اپنی طرف سے من گھڑت کہانی بنائی ہوگی۔" ٹھیک صاحب نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

"میں فاروق سے بات کرتا ہوں۔ اس نے خود اگر مجھ سے شمر کے رشتے کی بات کی تھی میں اس کے پاس نہیں گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی شمر سے کرے۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت شمر کے گھر میں یہ بحث چل رہی تھی۔ اسی وقت ساہر کسی کام کے سلسلے میں ان کے گھر آئی تھی۔ شمر اس وقت چاہتی تھی۔ ساہر کسی بھی طرح اس کے گھر سے چلی جائے اور یہ گھنگو نہ سن سکے جو اس کے ماں باپ اور سمیرا کی ماں کے درمیان ہو رہی ہے، لیکن ساہر وہاں سے ٹپنے والی نہیں تھی۔

"وہ مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ شفا کوئی الٹی حرکت نہ کر دے۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں شمر کی امی سے کہا۔

"ساہر بھابھی! اب پلیز آپ کوئی الٹی بات مت کیجئے گا۔" شمر چڑ گئی۔

"شمر! تھوڑی تمیز سیکھو۔ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔ اس کی امی نے فوراً ڈنٹا۔

"اس کو مت ڈانٹیں آنٹی! دراصل اسے شفا پر اتنا بھروسہ ہے کہ یہ اس کے خلاف کوئی بات سنتی ہی نہیں ہے۔" ساہر نے ختم کیا۔

"آخر بات کیا ہے؟" شمر کی امی نے کڑی نظروں سے شمر کو گھورا۔

"میں نے شمر کو منع بھی کیا تھا آنٹی! کہ یہ اپنی منگنی

کے بارے میں شفا کو زیادہ نہ بتایا کرے یہ عمر ایسی ہے کہ لڑکیاں جلدی جھلس ہو جاتی ہیں پھر آپ شفا کی عادت سے واقف بھی ہیں۔ یاد ہی ہو گا جو وہ میرے ساتھ کیا کرتی تھی۔ اب دیکھ لیں طلاق والی بات کر کے اس نے غلط فہمی تو پیدا کر دی تھی۔

بہت معصوم اور ہمدرد بن کر اس نے اپنا دواؤ چلا دیا تھا۔ شمر کی امی سوچ میں پڑ گئیں۔

جتنی شفا اور شمر کی دوستی تھی اتنی تو نہیں، لیکن تھوڑی بہت ساہرا اور شمر کی امی کی آپس میں بنتی تھی۔ وہ تو ایک بات کہہ کر چلی گئی، لیکن شمر کی امی کے دل میں بات گڑی رہ گئی تھی۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ ایک زبان سے نکلی ہوئی بات جب کسی دوسرے کے کانوں تک پہنچتی ہے تو وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق پہنا کر آگے منتقل کرتا ہے۔ شمر کی بات کو اس کی امی نے اپنے حساب سے سمجھا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ شمر کی شادی کے بعد طلاق ہو گئی ہوگی جسے اس کے گھر والے چھپا کر اپنی طلاق یافتہ بیٹی کو ان کے بیٹے کے سر منڈھ رہے ہیں۔ انہوں نے جو سمجھا سو سمجھا ساہرا نے اس بات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ یعنی اس نے شمر کو تو نہ سہی، لیکن اس کی امی پر یہ ضرور ثابت کر دیا تھا کہ شفا ان کی بیٹی کی خیر خواہ ہرگز نہیں ہے۔

”امی! پلیز۔ اب آپ ساہرا بھابی کی باتوں میں آکر شفا سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ کو بتا نہیں وہ کتنی جھوٹی ہیں۔“ شمر نے ساہرا کے جانے کے بعد ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”خاموش رہو تم۔ ساہرا میں لاکھ خامیاں سہی، لیکن کچھ باتیں اس کی ٹھیک ہی ہوتی ہیں۔ تمہاری منگنی کی خبر سن کر شفا حسد کا شکار ہوئی ہے اور اسی چکر میں اس نے اتنی فضول بات کی۔ حسد نہ کر رہی ہوئی تو ذرا خود سوچو، تمہاری اتنی اچھی دوست ہے تو آخر منگنی میں کیوں نہیں آئی؟“

”وہ بیمار تھی امی!“

”آئے ہائے! اب ایسی بھی کیا بیماری۔ دیوار سے دیوار جڑی ہے ذرا دیر کو آجاتی تو کون سا قیامت آجانا

تھی۔“ وہ کچھ سننے کو راضی نہ تھیں مگر ساہرا نے شفا سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی، بلکہ اس کے لیے تو شمر نے بھی سوچا کہ شاید ساہرا جیسے ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ لیکن۔۔۔ چونکہ اسے شمر سے پر خاش تھی اس لیے اس نے سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا چھڑا لیا تھا ہاں یہ احساس ضرور تھا کہ اس کے بارے میں ایک غلط بات پھیلانی گئی ہے۔

”میں کب سے شمر کو فون کر رہی ہوں، بتا نہیں کہیں مصروف ہے۔ فون اٹھا ہی نہیں رہی۔“ شفا نے جھنجھلا کر کہا۔

ساہرا آئرن اسٹینڈ کے پاس کھڑی کپڑے استری کر رہی تھی جب اس نے شفا کو کہتے سنا۔ اس نے مزے کر دیکھا شفا کی دلی کے سامنے بیٹھی تھی ایک ہاتھ میں ٹی وی ریموٹ تھا دوسرے میں موبائل۔ آج کل یوں بھی موبائل اس کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا تھا۔ ساہرا مسکرائی۔

”نئے گھر میں سو مصروفیات ہوتی ہیں۔ شمر بھی مصروف ہوگی۔“

”نیا گھر؟“ شفا نے تعجب سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”ہاں نیا گھر۔ تمہیں نہیں پتا۔ شمر کی فیملی ماڈل ٹاؤن شفٹ ہو گئی ہے۔“

”ہیں؟“ وہ اپنی جگہ سے دوٹ اپھلی تھی۔ شمر لوگ ماڈل ٹاؤن کب شفٹ ہوئے؟ اور اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“

”چھا۔ نہیں بتایا۔ تعجب ہے۔“ ساہرا نے کہا۔ ”کلج کی چھٹیاں ہیں۔۔۔ میرا خیال تھا۔ تمہارا موبائل پر اس سے رابطہ ہو گا۔“ ساہرا نے کہا تو سادگی سے ہی تھا، لیکن شفا خفیف سی ہو گئی۔ اس نے لا شعوری طور پر موبائل والا ہاتھ پیچھے کیا تھا۔

”ہاں بتایا تو تھا شاید میں ہی بھول گئی۔“

آواز دھیمی تھی۔ ساہرا نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا

بریک جانتی تھی ہر انسان دھڑلے سے جھوٹ نہیں دے گا۔ وہ لوگ تو چلے گئے، شمر کی امی اچھی خاتون تھیں۔ میری اچھی بات چیت رہتی تھی ان سے۔ اب اس گھر میں ان کی دیورانی آگئی ہیں کیونکہ شمر کی دادی نے آباؤ اجداد کے چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں کسی دن چکر لگاؤں گی ان کی طرف۔“ وہ کہہ رہی تھی اسی دوران شفا کے موبائل کی بپ بجی تھی۔

”تمہیں پتا ہے شفا! شمر کی منگنی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ لڑکے والوں کو کسی نے کہہ دیا کہ شمر طلاق یافتہ ہے۔“

ساہرا نے گویا اطلاع دی تھی، لیکن شفا نے سنا نہیں وہ اپنے موبائل پر میسج میسج کھینے میں مصروف ہو گئی تھی اس بات سے بے خبر کہ اس کا بھلائی میں بولا جھوٹ ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے کیا سے کیا ہو چکا ہے۔ ساہرا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی چلی ہوئی چالیں ہمیشہ ہی کامیاب ہوتی تھیں ہاں آخر میں ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ اس کی ساری بساط الٹی جاتی۔ اس بار اس نے بہت بڑا رسک لے لیا تھا اور وہ پر یقین بھی تھی کہ اس بار اسے ناکام نہیں ہونا پڑے گا۔ کہتے ہیں آو حافان تو انسان کو اس کا باحوصلہ ہونا ہی بتا دیتا ہے وہ بھی فتح یاب سمجھنے لگی تھی خود کو اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر پتے بھی چاند لے تھے۔ اس نے دشمن کی دوستی سے پورا فائدہ حاصل کیا تھا۔

پلی ٹی شفا۔ تو آج کل وہ نئی اڑان بھر رہی تھی چند لمبے جملوں اور مختصر لگاؤٹ بھری باتوں نے جو اسے اعتماد کے خوشمار لگائے تھے ان کے بھروسے نئی دنیا کی میر کرنے لگی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا جس طرح یہ پراچانک مل جاتے ہیں اسی طرح غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایک دم۔ بس اچانک۔ ایسے جیسے کانڈ کر لکھی تحریر کسی نے مٹا دی ہو پھر انسان منہ کے بل کر رہا ہے اور چور چور ہو جاتا ہے۔ جب انسان اڑنے کے لیے بنا نہیں تو کوشش کیوں کرتا ہے؟

نا سمجھ ہوتا ہے اس لیے۔

”ماضی کا عظیم فنکار بنفس نفیس تم سے معذرت کرنے آیا ہے کہ تمہاری پہلی پہلی منگنی میں شریک بھی نہ ہو سکا۔ حالانکہ میرے نہ آنے سے تمہارا فائدہ ہی ہوا میں آجاتا تو تمہارے فنکشن کو چار چاند تو لگ جاتے تھے، لیکن پھر وہ لہا کو کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ سب نے تو میرے ہی ارد گرد ہونا تھا۔“

تقی شولنگز کی وجہ سے بہت مصروف رہا تھا فرصت ملے ہی پہلی ملاقات سمیر سے کی۔

”اگلا بندہ چاہے مرنے والا ہو، تم اپنی تعریفوں کا قصیدہ اسے ضرور سنانا۔“ سمیر جل کر بولا۔

”تم مرنے والے ہو۔ آکس پ؟“ ساہرا سے لہجے میں شرارت تھی۔

”مر رہی گیا ہوں یار! میرے ساتھ تو اتنی بری ہوئی ہے کہ کیا کسی دشمن کے ساتھ ہوتی ہوگی۔“ اس نے بے زاری سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا تھا اور پھر ساری بات تقی کو کہہ سنائی۔

”اماں کی الوالونٹ کے بعد بات اور بھی بگڑ گئی۔“

فکلیل انکل نے ابو سے بات کی اور انہیں وہ سب بتایا جو مری میں ہوا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے خود انکار کر دیا کہ وہ شمر کی شادی مجھ جیسے لڑکے سے نہیں کریں گے۔ ابو نے میری بڑی بے عزتی کی۔“

”صبر کر بھائی! ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“ تقی نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”مصلحت۔“ اس نے سلگ کر تقی کو دیکھا۔ ”جو بھی ہوا اس میں تمہاری غلطی ہے سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔“

”خیر۔ اب تم اتنے بھی کالے نہیں ہو کہ تمہیں کچھ کمائی نہ جائے۔ وہاں تو مصیبت پڑی ہوئی تھی کہ کسی طرح پتا چل جائے یہ وہی شمر ہے یا نہیں، لیکن خیر تم فکر نہ کرو میں انکل سے بات کرتا ہوں۔ بتاتا ہوں انہیں کہ جو بھی ہوا اس میں ہم سب کی برابر کی غلطی

رہی ہے۔“

195 2013

تھی۔ تم کو شرارت پر میں نے اکسایا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ان کے سامنے تم جیسے چالاک انسان کو بالکل معصوم ثابت کروں گا جو کہ تم ہو نہیں۔“
بڑا احسان نہ والا انداز تھا۔

”نہیں تم کچھ مت کہو۔ جو ہوا وہ بس ٹھیک ہے۔ مجھے شمر سے محبت ضرور ہوئی تھی، لیکن میں خود کو سمجھا لوں گا۔ سیلف ریسپیکٹ سے زیادہ اہم اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کون سی دنیا کی آخری لڑکی تھی کہ مجھے اور کوئی ملے گی ہی نہیں۔ اب تم نے ابو سے کچھ کہا تو وہ تمہارے بھی خلاف ہو جائیں گے۔ ویسے بھی آج کل مجھے اپنے ابو تمہارے ابازیاہ لگ رہے ہیں۔“

”یہ مت کہو ہمارے ابا تو ون اینڈ اونکی پیس ہیں۔ قدرت نے انہیں بنا کر سانچہ ہی تو ڈیا تھا۔“ لٹی بے ساختگی سے بولا۔ سمیر کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔
لٹی چاہتا بھی یہی تھا۔



”کدھر ہو میاں صاحب زادے! آج کل تو گھر میں نکتے ہی نہیں؟“ وہ بقول ابا بن ٹھن کر کہیں جانے کو تیار تھا جب ابا نے حسب سابق طنز یہ انداز میں پوچھا۔
”بس ابا! پانی پیٹ کے سارے جھیلے ہیں۔ بندہ یا نوکری کر لے یا گھر میں ٹک جائے۔“ وہ بھی لٹی تھا جس نے سیدھا جواب دینا نہیں سیکھا تھا۔

”تم نوکری کر رہے ہو؟“ ابا سے اپنی حیرانی بھی چھپائی نہیں گئی۔ لٹی کو اندر ہی اندر بڑی گدگدی ہوئی۔

”ہاں جی۔ کب کی۔“ بے نیازی سی بے نیازی تھی۔

”پتایا ہی نہیں کسی نے۔ کہاں کر رہے ہو؟“

لٹی نے ایک فرضی نام بتا دیا۔

”ہم۔“ ابا نے اسے دیکھتے ہوئے ایک پرسوج

پنکارا بھرا۔ ”چلو پہلی تاریخ آنے ہی والی ہے جب تنخواہ ہاتھ پر رکھو گے تب ہی پتا چلے گا۔“ شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

”میں پہلی تاریخ سے بھی پہلے تنخواہ آپ کے گھر پر رکھ دوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
ٹھیک دو روز بعد وہ ان کے سامنے کھڑا پہلے سے ہی بھرپور طریقے سے مسکرا رہا تھا۔

ابا مسکرائے نہیں، لیکن ان کی آنکھوں میں لٹی اس نے نرمی دیکھی تھی۔

”اچھی بات ہے کہ تم نے اپنی ذمہ داری سمجھ لی۔ عورت باورچی خانے میں اور مرد کھانا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔“ انہوں نے گویا سمجھایا۔ لٹی نے گردن سوڑ کر اسی کو دیکھا وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔
وہ جیسے اندر تک خوشی سے بھر گیا ہو۔

میوزک ویڈیو ان سب کی توقع سے بھی زیادہ پسند کی گئی تھی۔ گانا تو جو ہٹ ہوا سو ہوا تنقیدی حلقے لٹی کو سراہ رہے تھے اور اس کی آمد کو شو بزم میں خوش آمد قرار دیا جا رہا تھا۔

اسے دھڑا دھڑکام کی آفرز آنے لگی تھیں۔ یہ سنا کر نا مشکل ہو رہا تھا کہ کس کے لیے حامی بھرے اور کسے انکار کر دے۔ ابا کو چھوڑ کر باقی گھروالوں کے ساتھ اس نے اس خوشی کو خوب سیلبرٹ کیا۔
مہک کو بھی بلوایا۔ اسی مل کر بہت خوش ہو میں پھر رضی نے چکر چلایا اور مہک کے پیپا سے ابا کو ملوایا۔
بتایا یہ کہ وہ اس کے حلقہ احباب میں سے تھے۔
ابا لٹی کی جانب سے مطمئن ہو چلے تھے۔ لوگ بھی پسند آئے رضی کی ٹرک کام کر گئی۔



جری کامیڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تو ابا نے گھر میں فنکشن رکھ لیا۔ سارا خاندان مدعو کیا مہک کے گھر والوں نے معذرت کر لی ان کے اپنے خاندان میں کوئی تقریب تھی۔ سب گھر والے بے حد خوش تھے جری بھی گردن اکڑائے گھوم رہا تھا۔ لٹی اسے دیکھتا اور بار بار افسوس سے سر ہلاتا۔

”کیسا دور آگیا ہے۔ شکل سے عطائی بھی نہ آئے والے اب ڈاکٹر کہلائیں گے۔ گورکھ دھندا ہے یہی“

گورکھ دھندا جری خوش تھا سونہس کرنال دیتا۔

”میرے بہت سے دوست بھی آرہے ہیں۔ آپ نے ان سب سے خوش اخلاقی سے ملنا ہے اور اچھے اچھے آٹو گراف بھی دیئے ہیں کیونکہ ان میں سے آدھے تو اسی شوق میں آرہے ہیں کہ آپ سے ملاقات کا موقع ملے گا۔“ اس نے تلی سے کہا۔

”ٹھیک ہے اب میں اپنے بھائی کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔ ویسے تو ریت پچاس ہزار ہے، لیکن تم میرے بھائی ہو تو دس ہزار دے دیتا۔“ اس نے سیدھے سیدھے کہا۔

”ہیں۔ کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”بھئی سیدھی سی بات ہے، میں تو اب سیلبرٹی بن گیا ہوں کوئی لٹو بچو تو ہوں نہیں کہ منہ اٹھا کر کوئی بھی ملے آئے اور میں ہنس ہنس کر ملتا رہوں۔ ہاں اگر تم بے منت کرو تو بات دوسری ہوگی۔“

”اوہو۔ سیلبرٹی تو دیکھو۔ میرے دوستوں سے تو ملنا ہی بڑے گا ورنہ یاد رکھنا جب ایک دن جیو کے ساتھ کی ٹیم آپ کا انٹرویو لینے آئے گی تو میں بھائی بن کر آپ کے سارے راز فاش کر دوں گا اور اس وقت آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔“

”آئے بڑے تم میرے راز فاش کرنے والے۔ میں نے تمہارے بچپن کے سارے کارناموں کو راز بنا کر اپنے سینے میں چھپا رکھا ہے۔ اتنا بوجھ ہے ان رازوں کا کہ بعض دفعہ مجھے سانس لینا تک مشکل لگتا ہے۔“

”اٹھ۔ ایسے کون سے راز ہیں؟“ بھابھی نے بھی دلچسپی لی۔ تلی جری کو چڑا رہا تھا۔ انہیں پتا تھا، گفتگو دلچسپ ہی ہوگی۔

”چلو جی۔ آپ لیں دلچسپی۔ تلی بھائی نے خود سے بنا کر ایسے قصے سنائے ہیں کہ آپ کے منہ جتنے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔“ جری آج کل کچھ زیادہ ہی پراعتماد تھا۔

”او میرے منے لاڈلے بھائی! میں کیوں خود سے قصے بناؤں گا تمہارے ہی کھلائے ہوئے گلوں کی

خوشبو ہے جس نے میرے ذہن کو معطر کیا ہوا ہے۔ تلی مسکرایا۔

”آپ کو پتا ہے بھابھی! یہ جواب شکل سے معصوم بنا پھرتا ہے بچپن سے ہی اندر سے پورا ہے یعنی مہینا گھٹا۔ پہلا عشق چار سال کی عمر میں کر لیا تھا وہ بھی بڑوس کی منزل سے جس کی ناک چومیں کھینچ رہی تھی اور یہ اپنی شرٹ کے ڈامن سے اس کی ناک پونچھا کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں ایک بار تو اسی کی انگوٹھی چوری کر کے اسے پروپوز کرنے بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ تو میں نے عین وقت پر چھاپ مار کر لیا کی عزت کو داغ دار ہونے سے بچالیا۔“ وہ تان اسٹاپ بول رہا تھا جری ساری بات پر مسکراتا رہا، لیکن اس بات پر ہلکا سا گیا۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے بھائی! تم ایک کو چار سے ضرب دے کر نہ سناؤ۔“

”اس میں شرمانے کی کیا بات ہے جری! محبت ہی کی تھی تم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا اور بچپن میں تو ایسے چھوٹے موٹے عشق سب کو ہو جایا کرتے ہیں۔ تلی نے ناصحانہ انداز میں کہا تھا۔

”میں نہ شرمایا ہوں نہ مکر رہا ہوں۔“ جری نے تیزی سے کہا تھا پھر جھجک کر بولا۔ ”ہاں اچھی لگتی تھی وہ مجھے، لیکن میں کوئی اس کی ناک نہیں پونچھتا تھا اور نہ ہی میں نے اسی کی انگوٹھی چرائی تھی۔“ وہ سینکڑوں وضاحتیں دینے لگا۔

”تو اس دوپہر کیا درخت کے نیچے بیٹھ کر اسے گرامر سمجھا رہے تھے جب میں نے تمہیں رکتے ہاتھوں پکڑا تھا۔“ تلی آنکھیں منکا کر بولا تھا۔

”وہ تو میں تو۔“ اس سے کوئی بات نہ بن پڑی ایک تو تلی کی باتیں اوپر سے سینکڑوں ہنس ہنس کر جھجکا دوہری ہوئی جارہی تھی۔ تلی نے تو اپنی بات جھجکا کر کے چھوڑی۔ جری جب اسے جھوٹا ثابت نہ کر سکا تو واک آؤٹ کر گیا۔

”اس کی باتوں میں نہ آنا سین! جانتی ہونا جری کو چڑانے کے لیے اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا ہے۔“

بھی مسکرا رہی تھیں۔

”آپ رہنے بھی دیں ای! اپنے لاڈلے چھوٹے بیٹے کی حرکتوں پر پردہ نہ ڈالیں۔“ تلی باز نہ آیا۔

”جری کو رہنے دو۔ وہ میرا بڑا بیباک ہے۔ پردے تو ہماری حرکتوں پر ڈالنے لگتے تھے۔ کیا بتاؤ میں تمہیں کس قدر شرارتی ہوا کرتا تھا۔ بڑوسیوں نے مرغیاں پالیں تو جا کر ان کے انڈے چرائے۔ سامنے والوں نے آئینہ میں طوطے پالے ہوئے تھے۔ یہ ایک روز پنجو کھول کر سارے اڑا آیا وہ لوگ شکایت لے کر آئے تو میں نے کتنی دقتوں سے بات سنبھالی پھر بھی تمہارے خالو جان کے کان میں بات پڑ گئی۔ سوہ ناراض تو ہوئے سو ہوئے مجھے بھی غلط تربیت کے طعنے دے ڈالے۔ یہ جری بے چارہ تو میری انگوٹھی سے کھیلتا پھر ہاتھ منہ سے اس کی دوستی تو بہت تھی تلی کی نظر پڑ گئی تو کہانی بنی۔ وہ دن اور آج کا دن ہے اسے چڑا رہتا ہے۔“ وہ سینکڑوں باتیں کہیں۔

”آپ دیکھیے گا امی! میں تو عین اس جری کی شادی والے روز اس کی بیگم کو بھی یہی قصہ سناتا ہوا پایا جاؤں گا۔“ تلی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تقریباً اچھی تھی۔ جری ویسے کا دلہا بنا پھر رہا تھا اس نے بڑے شوق اور فخر کے ساتھ تلی کو اپنے دوستوں سے ملوایا تھا، لیکن ابھی کھانا بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ لودھی صاحب کا سویا ہوا جلال جاگ اٹھا۔ انہیں کہیں سے تلی کے شو بزوائن کرنے کی خبر مل گئی تھی۔ پھر انہوں نے مہمانوں کا لحاظ نہیں کیا۔ تلی کو بھری محفل میں وہ بے بھادگی سنائیں کہ محفل میں موجود اکثر احباب کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

تلی کا سر جھکا ہوا تھا۔ بہت سارے اعتراضات کے باوجود خاموش رہا اور لیا کو بھڑاس نکال لینے دی، لیکن اس کی برداشت اس وقت بالکل ختم ہو گئی۔ جب لیا نے اسی کی تربیت کو بھی الزام دیا، کچھ نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے۔

”آخر ایسا کیا کر دیا میں نے جو آپ اس قدر واویلا کر رہے ہیں۔“ اس کی آواز دھیمی تھی علحدہ سخت۔

لودھی صاحب کی پیشانی پر بڑے بل بڑھے۔ غصے سے کپٹی کی رگ اس قدر پھڑکنے لگی کہ گمان گزرا، ابھی پھٹ ہی جائے گی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی پر گرفت مضبوط کر لی۔ مبادا ہاتھ اٹھ ہی نہ جائے، لیکن کئی بار پیش بندی بھی بے سود رہتی ہے۔ غصے نے کچھ اس طرح سے حواس پر غلبہ پایا کہ وہ تلی پر ہاتھ اٹھا بیٹھے۔ چھڑی کی پے درپے ضربیں اس کے کندھوں اور سر پر پڑ رہی تھیں۔ شدید طیش کے عالم میں وہ اسے مار رہے تھے اور زور زور سے گالیاں بک رہے تھے۔ بھری محفل میں سناتا چھاچھا تھا۔ صرف ان کی زبان اور چھڑی کے چلنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ تلی منہ سر کے گرد بانڈ لپیٹ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سب ان کے غصے سے خائف تھے کسی میں ہمت نہ تھی کہ انہیں روکے حتیٰ کہ ان کے گے بھائی میں بھی نہیں پھر رضی نے ہمت کی۔

”بس کر دیں لبا! وہ مرجائے گا۔“ اس نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

”مر جانے دو، ایسی نافرمان اولاد کا مرجانا ہی اچھا ہے۔“ وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بولے۔

”دنیا کیا کہے گی۔“ باقر لودھی کا بیٹا، عبدالباری لودھی کا پوتا، میرانی بنا گھوم رہا ہے۔ اس کے شوق کے لیے میں اپنی خاندانی شان و شوکت پر حرف نہیں آنے دوں گا۔“

”اس نافرمان سے کہو ابھی کے ابھی اس گھر سے دفع ہو جائے اور پھر ساری زندگی مجھے اپنی شکل نہ دکھائے۔ اس کے بعد میرانی بن کر ناچتا پھرے یا ڈرامے کرے۔ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔“

وہ زور دار لہجے میں حکم سنا کر خاموش ہو گئے۔ محفل میں ایسی خاموشی تھی جیسے کسی کی موت کی خبر آگئی ہو اور تلی جس طرح مار کھا کر زمین پر پڑا تھا یوں لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حور کو کدو کا لہجہ

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فٹن لطیفہ اور دیگر فٹن سے گہرا شغف ہے، تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شہناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ملی تھی۔ سعد کی فیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔



شہزاد سلیم، بلال سلطان کا پرستل سیکرٹری تھا، شہزاد کے اپنے پاس سے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے کسی باپ کے اپنے ماتحت سے ہوتے ہیں۔ وہ بلال سلطان کی شخصیت کو کام کی حد تک خوب سمجھتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ کون سی صورت حال پاس کے موڈ پر کیا اثر کرے گی اور صورت حال سے مراد کاروباری صورت حال تھی۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ کس قسم کے کاروباری دوستوں اور پارٹنرز کے ساتھ پاس کا رویہ کیا ہو سکتا ہے۔ بلال سلطان کاروبار کے معاملے میں ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا اور شہزاد کا خیال تھا کہ یہی خوبی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔ بڑے سے بڑے نقصان اور بڑے سے بڑے نفع کی خبر سننے ہوئے بھی بلال کے رد عمل ایکسٹہ ہوئے تھے۔ نقصان کی خبر سن کر بھی وہ سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

“Now we have to see how to reverse it”

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس صورت حال کو ہم فائدے کی طرف کیسے موڑ سکتے ہیں)
اور بڑے سے بڑے فائدے کی خبر سن کر بھی وہ سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

“Now we have to see how to double it”

(اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اسے دوگنا کیسے کر سکتے ہیں)

شہزاد نے کبھی بھی بلال کو کسی بڑے فائدے کے دوران ترنگ میں آکر بڑی بڑی باتیں کرتے اور نقصان کے دوران ڈپریشن کے دورے پڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے پاس کا یہ انداز بہت پسند تھا اور وہ کوشش کرتا کہ وہ اپنے مزاج کو بھی اسی مزاج میں ڈھال لے اور بلال کی شخصیت کی تقلید کرے۔

اتنے برسوں میں صرف ان دنوں اس نے پاس کو آپے میں نہ رہتے ہوئے پایا تھا جب سعد سلطان اچانک منظر سے غائب ہو گیا۔ اس صورت حال میں بھی شاید ایک دو دن اس نے انتظار میں گزارے۔ تیسرے دن وہ کسی نامعلوم اغوا کار کی فون کال کا انتظار کرتا رہا جو اس سے تاوان میں بڑی رقم مانگتے والا تھا۔ چوتھے دن تشویش اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہوئی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شہزاد پاس کا ایک نیا روپ دیکھتا رہا۔ پاس کے ”لوگ“ حرکت میں آنا شروع ہوئے اور پھر جیسے کنوئیں میں بانس ڈالنے کا عمل شروع ہو گیا۔ پل پل کی رپورٹیں مختلف کونوں سے آنے لگیں تمام بزنس میٹنگز کینسل ہوئیں کاروبار کا پیسہ ایک سو کم رک سا گیا۔

ان دنوں پہلی بار شہزاد کو محسوس ہوا کہ بلال سلطان ایک میکا کی روٹ نہیں گوشت پوست کا ایک ایسا انسان ہے جس کے سینے میں دل بھی ہے اور وہ دل دنیا میں موجود اتنے سارے لوگوں میں سے صرف ایک شخص کے لیے دھڑکتا ہے۔ شہزاد کو بلال کا یہ روپ دیکھ کر اچنبھا بھی ہوا، خوشی بھی ہوئی اور شاید ہلکی سی مایوسی بھی۔ میکا کی کھلونے سے کون توقع کر سکتا ہے کہ وہ انسانوں جیسے جذبات کا اظہار کرنے لگیں گے، لیکن پاس کی یہ صورت حال زیادہ دن نہیں چلی سعد سلطان کی گاڑی وصول کرنے کے بعد وہ یوں سکون پذیر ہوا جیسے کبھی اس کے لیے پریشان ہوا ہی نہیں تھا۔

”کمال ہے یار! گاڑی ہی ملی ہے سعد سلطان تو نہیں ملا۔ پاس اس پر ہی مطمئن ہو گیا، بھلے سعد سلطان کو کسی نے قتل کر کے پھینک دیا ہو اور گاڑی وہاں کھڑی کر کے چلا گیا ہو۔“ شہزاد بھی اس طرح کی چہ میگوئیاں کرنے والوں میں شامل نہیں ہو سکتا تھا بلال سلطان کا پرستل سیکرٹری تھا اور مرکزی دفتر میں بیٹھا روٹ انسانی چولا انداز کرتا رہنے کے بعد اسے واپس رکھ چکا تھا۔

”اب وہ صرف اور صرف بزنس کرے گا۔“ کی سختی اس کے چہرے پر موجود سنجیدگی کے پیچھے چھپی نظر آ رہی تھی۔

شہزاد وہ ”گوسپ نیبل“ چھوڑ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ اس روز پاس کی آفس آمد کے بعد خوش گوار حیرتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ پاس نے آفس آتے ہی شہزاد کو اپنے پاس بلا کر اس دفتر میں موجود تمام عملہ کی اگلی تنخواہوں کے ساتھ ایک صحت مند اضافی رقم بونس کے طور پر لگا کر چھوڑنے کی ہدایت کی تھی۔ دفتر عرب ریاستوں کے کاروباری اداروں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اتوار کو تعطیل کے لیے بند ہو سکتا تھا نہ ہی یورپی ممالک میں کاروباری تعلق ہونے کی وجہ سے جمعہ کو بند رکھا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اس مرکزی دفتر میں مرکزی کام ہوتا تھا، یہاں کا عملہ محدود، لیکن سب کا سب اعلا تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھا جس کے ہر رکن کی تنخواہ لاکھوں میں جاتی تھی۔

بے وقت، غیر متوقع بونس حملے کے ہر رکن کا کتنے کلو خون برہانے والا تھا، شہزاد کو بخوبی اندازہ تھا اسی لیے وہ جلد سے جلد اسٹاف کو یہ خبر سنانے کے لیے بے چین تھا۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ مسلسل پاس کے ساتھ مصروف رہا اور اس دوران اس نے محسوس کیا کہ پاس نے پہلو بدلتے ہوئے دو سے تین بار آفس میں لگے والے کلاک اپنے فون کی اسکرین آن کر کے اور اپنی کلائی پر بندھی پیش قیمت رسٹ وچ پر نظر دوڑائی تھی۔ یقیناً ”وہ وقت کے کسی حصے کے معاملے میں بے چین تھے۔“

”شہزاد! کافی منگواؤ، کچھ دیر میں ہی سعد یہاں پہنچتا ہے۔“ ایک قائل پر سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے انہوں نے اچانک رک کر کہا تھا۔

”س۔ سعد! شہزاد نے ٹھنک کر پوچھا تھا۔ ”مطلب سعد سلطان؟“

”ہاں!“ انہوں نے سر ہلایا اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیوں کوئی اور سعد بھی ہے کیا ہمارے یہاں کے اسٹاف میں؟“

”نہیں۔ نہیں سر!“ شہزاد نے اپنی ہکلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”دراصل سعد صاحب کافی دنوں سے آ نہیں رہے تھے نا۔“

”ہاں، نہیں آ رہا تھا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے پھر ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھری۔ ”لیکن آج سے اس کی وہ ہی پرانی والی روٹین شروع ہو جائے گی۔“ انہوں نے شہزاد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اوہ اچھا!“ شہزاد اپنی بوکھلاہٹ پر قابو ہی نہیں پا رہا تھا۔ ”میں ابھی کافی کا کہہ کر آتا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انٹر کام پر کافی کا کہنے کے بجائے خود دفتر سے اٹھ کر باہر آنے کا مقصد صرف اور صرف اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانا تھا۔

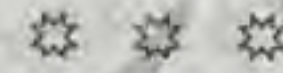
شہزاد کی منگوائی کافی آئی، گوئین این کی قیمتی طشتی میں رکھے سفید کافی کہیں میں موجود میکا کی خوشبو اپنی طرف کھینچتی تھی اور اس کی بھاپ اپنے ساتھ اس کی خوشبو بھی سارے میں بکھیرتی تھی، لیکن پھر شہزاد نے دیکھا اس کے اپنے کپ کے علاوہ دوسرے دو کپ یونہی بھرے بڑے بڑے ٹھنڈے ہونے لگے بھابھ معدوم ہوئی اور پھر اٹھنا بند ہو گئی، کپ کی اوپری سطح پر تیرنے کافی آرٹ کے شاہکاروں کی ہیئت بگڑتی اور پھیلتی چلی گئی اور اس سارے عمل کے دوران پاس کے چہرے پر موجود تاثرات نے بھی کئی رنگ بد لے۔

سعد سلطان کو دن کے گیارہ بجے تک آفس پہنچنا تھا۔ گیارہ سے بارہ بجے تک پاس کا بے ہنگام وقت پر نظر ڈالتا رہا اور اس کے بعد ہی کافی کی رنگت خوشبو بھابھ پاس کی کیفیات کی طرح بدلتے لگے تھے۔

ایک کے بعد ایک فون کال پاس کے چہرے کی تشویش اور زاویے پر بڑھانی اور بدلتی چلی گئی۔ سعد سلطان کو گھر سے ڈرائیور کے ساتھ نکلتا تھا، ڈرائیور کو گھر پر بیٹھا چھوڑ کر اکیلے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر سے نکلتا تھا۔ اس کو آفس کے راستے میں سرجن ڈاکٹر عبداللطیف کے کلینک پر رکنا تھا، جہاں اس کے لیے خصوصی اپائنٹمنٹ ملی

گئی تھی وہ وہاں مقرر وقت پر نہیں پہنچا تھا۔ اس کی وہ گاڑی جس پر وہ گھر سے نکلا تھا کمپنی کے ایک انسپٹر چھوٹے ذیلی دفتر کے باہر کھڑی تھی دفتر کے باہر کھڑے گاڑی نے سعد سلطان کو وہاں گاڑی لاتے نہیں دیکھا۔ گاڑی سے نکلنے کے بعد سعد سلطان ایک بار پھر غائب تھا۔ شام تک ہر ممکنہ جگہ پر تلاش کر لینے کے بعد بھی اس کوئی سراغ نہیں مل پایا تھا۔

”بولس کی نیوز تو بریک ہونے سے پہلے ہی واپس لے لی گئی شاید۔“
اس رات بلال سلطان کی ذہنی کیفیت سے بے خبر شہزادے سونے سے پہلے آخری بات سوچی تھی۔



”ہاں۔ بد قسمتی سے وہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔“

ماہ نور کو یہ بات بتاتے ہوئے ابراہیم کا لہجہ اور انداز ایک ایسے مجرم کا سا تھا جو اعتراف کر رہا ہو کہ سارا جرم صرف اسی کا تھا۔

”کمال ہے۔“ ماہ نور کے تیور بگڑ گئے۔ ”پانچ دس منٹ میں ہی وہ پھر سے غائب ہو گیا جیسے ہی تم نے بتایا کہ وہ مل گیا ہے اور اس کا فون آن ہے میں نے اسے کال کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا اس وقت بھی اس کا فون بند جا رہا تھا۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں؟ کیا اس کی گم شدگی کے بعد اس کے مل جانے کا وقفہ اس کی دوبارہ گم شدگی سے پہلے صرف تمہارا خواب تو نہیں۔“

”اب تو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ابراہیم نے سر جھکا کر کہا۔ ”جیسے وہ خواب ہی تھا مگر۔“ اس نے سر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ”مگر وہ خواب نہیں تھا یقین جانو میں نے خود تین گھنٹے تک اس کے ساتھ مغز ماری کی تب جا کر وہ میرے ساتھ اپنے گھر آنے پر رضامند ہوا۔ میں نے اس سے غلط بیانیاں کیں اور یقین دہانیاں بھی اور میں بڑا خوش تھا کہ سعد جیسے چھلاوے کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا مگر پہنچنے کے بعد وہ مجھ پر گرم ہوا ناراض ہو گیا آئندہ کبھی بات نہ کرنے کی دھمکی بھی دی لیکن میں پھولے نہیں سہا رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے میں اور انکل کے سامنے لانے میں کامیاب ہو چکا تھا میں اس کی گم شدگی کے دوران انکل کی حالت دیکھ چکا تھا اور اسے ڈھونڈ لینے کے بعد خود اس کی اپنی حالت بھی میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ صدیوں کا تھکا ہارا انسان خورہ اور پریشان حال نظر آ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ زخمی تھا لباس شکنوں سے بھرپور جس پر گرد کے آثار بھی تھے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے نہ جانے کب سے سویا نہ ہو۔“

ابراہیم نے کچھ یاد کرتے ہوئے سر جھٹکا اور پھر ماہ نور کی طرف دیکھنے لگا۔
”میں اسی بات میں خوش تھا کہ میں جھوٹ بول کر غلط بیانی کر کے ہی باپ بیٹے کو ایک دوسرے سے الگ چکا تھا وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور میں ہنس رہا تھا پھر وہ نارمل ہو گیا انکل سے باتیں بھی کرنے لگا۔ اس کے بعد میں وہاں سے آگیا۔ اگلے روز جب میں نے ہمیں مسیج کیا اس روز اسے آفس جانا تھا ڈاکٹر کے پاس جانا تھا مگر وہ دونوں جگہ ہی نہیں پہنچا۔“

ابراہیم نے رک کر لمبا سانس لیا۔

ماہ نور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے آگے سننے کی منتظر تھی۔

”وہ شاید چند سیکنڈز میں حساب لگا چکا تھا کہ اسے آئندہ کیا کرنا تھا انکل اس کی آمد پر خوش تھے ۴ بجے خوشی کی فوری طور پر اس کی نقل و حرکت کو آہستہ کرنے کی ڈیوٹیاں لگانے کا ان کو خیال بھی نہیں آیا ہوگا لیکن وہ جانتا تھا اور خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگلی صبح تک وہ اپنا پلان مکمل کر چکا تھا۔ اس نے انکل کے ساتھ نارمل انداز میں

پہنچا کیا ان سے گپ شپ لگا تا رہا مہی مذاق کرتا رہا یوں کہ ان کو اس کے انداز میں ذرا سا بھی کچھ انہوٹا لگانا ہی کوئی کھٹکا محسوس ہوا۔“
”لیکن پھر وہ گیا کہاں؟“ ماہ نور کو اس تفصیل سے زیادہ اس سے آگے سننے میں دلچسپی تھی۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔“ ابراہیم نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔

”پہلے تمہیں وہ کہاں ملا تھا؟“ ماہ نور نے پوچھا۔

”وہ۔“ ابراہیم کچھ کہتے کہتے رکا اور ماہ نور پر ایک نظر ڈال کر نظر چرا تے ہوئے بولا۔

”ایک ایسی جگہ جہاں کے بارے میں میرا اپنا خیال تھا کہ وہ وہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔“

”وہ کون سی جگہ ہے؟“ ماہ نور نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں مری سے ذرا سا آگے۔“ ابراہیم بول

بولا جیسے اسے سعد کے اس فعل پر شرمندگی محسوس ہو رہی ہو۔

”میں نہیں جانتا کہ اس لڑکی سے سعد کا کیا تعلق ہے۔“ میں بس اتنا جانتا تھا کہ وہ وہاں جایا کرتا تھا ہر طرف سے مایوس ہو کر شخص ایک بار دیکھ لینے کی خاطر وہاں گیا تھا اور۔“

”اور وہ وہاں موجود تھا۔“ ماہ نور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ابراہیم کو لگا جیسے ماہ نور ایک دم ٹرانس کی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

”تم یوں ہی خوار ہوئے تمہیں سب سے پہلے اسی جگہ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے تھا۔“ وہ یوں بولی جیسے کسی ناموجود شخص سے مخاطب ہو۔

”اور ابھی بھی۔“ اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ”ابھی بھی تمہیں دینا جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے۔“

”نہیں۔“ ابراہیم نے ماہ نور کی کیفیت دیکھ کر سکتے میں آتے ہوئے کہا۔ ”وہ وہاں نہیں ہے ہی تیز لفٹ ڈی

کٹری وہ ملک چھوڑ چکا ہے۔“

”پھر وہ بھی ساتھ ہی ہوگی اس کے۔“ ماہ نور نے یقین سے کہا۔ ”اسی کی خاطر ملک چھوڑا ہوگا اس نے۔“

”نہیں۔“ ابراہیم ابھی بھی ماہ نور کے اس بدلے ہوئے انداز پر بے چینی سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ لڑکی اور خاتون یہیں ہیں اور اس کے بارے میں بے خبر ہیں۔“ اس نے ماہ نور کو تسلی دینے کے لیے

انداز میں کہا۔

جواب میں ماہ نور نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ”آؤ بننے سے روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اس کے ہونٹ اس کوشش میں کپکپا رہے تھے اور ذہن میں کئی قسم کے خیال اٹھ رہے تھے وہ دونوں اس وقت

ابراہیم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے آواکل سہا کی وہ سہ پہر خاموش اور اداس تھی۔ اس نے شیشے کی دیوار کے پار

سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھا یہ اس شخص کا شہر تھا جس کے لیے وہ اپنا شہر چھوڑ آئی تھی مگر سیکڑوں

ہزاروں کے اس ہجوم میں وہ خود کہیں بھی نہیں تھا اس کی آنکھوں سے چند آنسو لڑھکے اور اس کی گود میں

جا کر اسے وہ اپنے دل میں اسے ہر صورت کہیں ڈھونڈ نکالنے کا عزم کر کے آئی تھی مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا

جس کی خاطر اس نے اپنا شہر چھوڑا وہ ملک ہی چھوڑ گیا تھا۔

”ایک معذور لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر خاتون رہتی ہیں مری سے ذرا آگے۔“ وہ کہہ کر اس کے

کہنوں میں ابراہیم کا یہ جملہ گونج رہا تھا۔

”تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

تو یہ تو ایک بالکل متوقع سی بات ہے پھر میں اتنی حیران کیوں ہو رہی ہوں۔ اسے وہیں ملنا چاہیے تھا بالکل

وہیں ملنا چاہیے تھا۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے جیسے خود کو یقین دلایا۔

”بھئی تمہیں یہ خیال بھی آیا ابراہیم کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے وہ کیوں سب سے بھاگ اور چھپ رہا ہے۔“ پھر دیر بعد ماہ نور نے ابراہیم کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”جتنا میں اس کو جانتا ہوں اس کے حساب سے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہے، لیکن جو بھی وجہ ہے اس سے اس معذور لڑکی سارہ کا کوئی تعلق نہیں ہے، یقین کرو۔“ ابراہیم نے اپنے تئیں ماہ نور کو تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

”ہوں! ماہ نور کے چہرے پر بے بس سی مسکراہٹ ابھری۔ ”یہ تم کہہ رہے ہو تا جبکہ میں جانتی ہوں کہ اس لڑکی کا اس کی زندگی میں کیا مقام ہے۔“ ابراہیم نے اس کی بات سن کر سر جھکا لیا۔

”جو بھی ہے۔“ وہ ٹیبل پر رکھے چھری کانٹوں سے کھیلنے ہوئے بولا۔ ”جلد ہی پتا چل جائے گا وہ کہاں ہے اور ایسا کیوں کر رہا ہے۔ تم جانتی ہو ماہ نور۔“ پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ”سعد کے فادر انکل بلال ویل کیونڈ (well composed) انسان ہیں۔ پچھلی بار سعد کے عائب ہو جانے پر وہ گھبرا گئے تھے، لیکن اس بار اگر وہ گھبرائے ہوئے بھی ہیں تو ظاہر نہیں ہونے دے رہے۔ وہ یقیناً اس کے اس رویے کی وجہ جانتے ہیں کیونکہ اس بار اس کی تلاش کا ان کا اپنا انداز ہے وہ مجھے بھی اس میں انوالو نہیں کر رہے ہیں جو کوشش کر رہا ہوں اسے تم اپنی سی کوشش کہہ سکتی ہو۔“

ماہ نور ابراہیم کی بات سن کر جواب دینے کے بجائے خاموشی سے شیشے کے باہر سڑک پر نظر آنے والے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اوائل سرما کے وہ دن چھوٹے ہو چکے تھے دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی پھیلنے لگی تھی اور برقی قمقمے جا بجا روشن ہو رہے تھے۔

”وہ ایسی ہی ایک شام تھی جب تم نے مجھے چیئرمین باکس میں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔“ اس نے روشنی کی اس لکیر نظریں جھمکاتے ہوئے یاد کیا جو لمب پوسٹ سے اتر کر سڑک پر کچھ گئی تھی۔

”اور یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے کہا تھا کہ اگر تم کسی بات کے بارے میں شیور نہیں ہوتے تو اس کی طرف جاتے ہی نہیں اور یہ بھی کہ اگر تم مجھے ایک اچھی دوست مان لینے کے بارے میں یقین نہ ہوتے تو کبھی اپنے پرستار بچہ سے شیئر نہ کرتے۔“ نجانے اسے کیوں ایسا لگا جیسے بلیک ڈریس پینٹ اور اسکاکی بلو ڈریس شرٹ میں لمبوس سعد وہیں سامنے کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”التباس“ اس نے ہونٹ دانتوں تلے جا کر اپنی سسکی روکی۔ ”مجھے التباس کیوں نظر آتے ہیں جبکہ مجھے معلوم بھی ہے کہ تم میری رسائی سے بہت دور ہو۔“

”آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو، جتنی بار میں نے تم کو دیکھا ہے ان سے بہت مختلف، بہت اچھی خاصی sane لک ہے آج تو۔“ اس کے کانوں میں سرگوشی کی طرح آواز گونجی۔

”جھوٹ“ اس نے پہلے کی طرح سر ہلایا۔

”میرے دل میں جو بات ہوتی ہے میں کہہ دیتا ہوں میں نے تم سے کہا تھا میری یہ عادت نوٹ کر کے رکھ لو۔“ پھر وہی سرگوشی جیسی آواز۔

”میری نوٹ بک کے تمام صفحے بھر گئے تمہاری عادتیں نوٹ کرتے کرتے، لیکن تم ابھی بھی التباس ہی ہو رہی کہ ہاتھ بڑھانے پر بھی ہاتھ نہ آؤ۔“ وہ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”اُس کے ماہ نور کسی یوسم اور ٹائم See you some other time ابراہیم نے پارکنگ میں کھڑا اس کی گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔“

”ہوں!“ اس نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔ لاک اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے وہ ایک خیال آنے پر مڑی اور ابراہیم سے مخاطب ہوئی۔

”ابراہیم! کیا کسی وقت میں سعد کے والد سے مل سکتی ہوں؟“ اسے محسوس ہوا اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”دیکھو۔“ ابراہیم نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”میں فوری طور پر یقین سے ہاں نہیں کہہ سکتا میں کوشش کروں گا کہ ان سے تمہاری ملاقات کرا سکوں۔“

”ہاں پلیز۔“ کوشش کرنا اور اگر ایسا ممکن ہو تو فوراً مجھے انفارم کرنا میں فی الحال ادھر ہی ہوں اسلام آباد میں۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا اور ابراہیم کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی اشارت کرنے لگی۔



”میں تو کپ آف ہیملاک سے ہی چونک گئی تھی۔“ ضوفی نے اپنی جینز سے ناہیدہ گرد جھاڑنے کے بعد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے کہا۔

”کپ آف ہیملاک جانتے ہو کیا مطلب؟“ اس نے دانش مندوں کی طرح رازی کی طرف دیکھا جو صوفی پر پھیل کر بیٹھا منہ پر ہاتھ رکھے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”مجھے بھی پتا نہیں تھا۔“ رازی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ضوفی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور جب مجھے پتا نہیں تھا تو تمہیں تو خیر کیا علم ہو گا۔“ اس کے لمحے میں اپنی معلومات کے بارے میں یقین اور فخر اتر آیا۔

”میں نے گوگل پر سرچ کیا تو معلوم ہوا ایک قسم کا زہر کلاتا ہے ہیملاک۔“ اس نے رازی کی طرف دیکھ کر سرگوشی سی کی۔

”کیا کہا؟“ اب کے رازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یعنی کہ زہر۔“

”یعنی کہ زہر۔“ ضوفی نے رازی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کی بات کی تائید کی۔

”اور وہ سعد سلطان زہر کو ڈنر منیو میں شامل کر رہا تھا۔“ رازی کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ”اور ڈنر سرو کرنے سے پہلے تم یا میں اسے چکھتے اور کوچ کر جاتے۔ اسے فٹ ٹوایٹ کا سرٹیفکیٹ دیتے دیتے۔ اوہ خدا یا!“ وہ جیسے کسی انجانے خطرے کی زد سے باہر نکل آنے پر شکر کرتے ہوئے بولا۔ ”شکر ہماری جانیں بچ گئیں۔“

”اور اگر ہم حسب معمول ڈنڈی مارتے ہوئے اسے کھکھے بغیر فٹ ٹوایٹ کا سرٹیفکیٹ دے دیتے تو بلال سلطان اور ابراہیم دونوں کا قتل ہماری گردنوں پر آجاتا۔“ اس کے لمحے دوسری سوچ پر خیال آرائی کرتے کرتے اس کی آواز گھٹ سی گئی۔

”حق ہو تم تو۔“ ضوفی نے اسے ڈپٹا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کپ آف ہیملاک یوں مارکیٹ میں کھلے عام ملتا ہو گا کہ طلب کرنے پر فوراً میبلڈ پیکنگ میں دستیاب ہو جائے گا۔“

”تو پھر؟“ رازی نے ڈپٹے جانے پر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”یہ صرف ایک metaphorical phrase تھی محترم۔“ ضوفی نے ایک بار پھر دانش مندوں والا انداز اپنایا۔ ”جس کا مقصد یہ اشارہ دینا تھا کہ سعد سلطان باس اور ابراہیم کو ختم کرنا چاہتا تھا اب ختم کرنے سے مطلب ان کی وہ خوشی ختم کرنا تھی جو اس کی گمشدگی کے بعد مل جانے پر پیدا ہوئی تھی یا کچھ اور اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”لیکن کچھ مرنے مارنے کا سلسلہ تو تھا نا یار۔“ رازی خوف زدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بہت ہی پیچیدہ اور پراسرار

ہوتے جارہے ہیں اس فیملی کے معاملات بھی۔

”فیملی! ضوفی نہی۔“ ایک باپ اور ایک بیٹا۔ اسے فیملی کہتے ہو تم؟

”باپ بیٹا ہی سہی پوری ایسا رہتا رکھی ہے دونوں نے بڑس میں اور یہ گھر۔“ رازی نے چاروں طرف دیکھ کر ہونے کہا۔ ”اسٹیٹ ودان اسٹیٹ“ لیکن حالات دیکھو بیٹا باپ سے دور بھاگتا ہے اور باپ بھاگے ہوئے ہے پکڑنے کے لیے اپنے بندوں کو بھگاتا ہے۔ یہ بھی اپنی طرز کی انوکھی میرا تھن ہے۔ ان کی میرا تھن میں ہم بے چاروں کی مفت میں سانس پھول پڑتی ہے۔ کل سے اب تک مواصلاتی رابطوں پر لگا ہوا ہوں۔ پل کا چین نہیں۔ رازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”پھر کچھ کامیابی بھی ہوئی کہ نہیں۔“ ضوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے پوچھا۔

”بس اتنی ہی کہ وہ اس دن گیارہ بجے کسی ایک فلاٹ سے رہی اڑ گیا۔ وہی میں کہاں ہے فی الحال پتا نہیں۔“ رازی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ اور تیز قدموں سے چلتا کرے سے باہر نکل گیا۔

”یقیناً“ سعد سلطان۔ کو داعی دورے پڑنے لگے ہیں۔ جب ہی گھر سے بھاگتا ہے۔“ ضوفی نے رازی کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ ”بڑے لوگوں کے داعی دورے بھی خوب ہوتے ہیں۔ گھر سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پہنچا دیتے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”نو بھی۔“ اس دن کاؤنر جب سے سبوتاڑ ہوا ہے۔ ڈنر، لنچ کا جھنجٹ ہی ختم ہوا۔ کچن اسٹاف اور باقی عملے کا کیا ہے۔ آوائنڈے، آلو بیٹنگن اور ایک سادہ سا چکن بنوالو۔ گزارہ ہو جائے گا۔ باس تو گیا اپنی ملٹی وٹامن گولیوں پر واپس۔ کھانا وانا فی الحال موقوف باس کو چاہیے بیٹے کی واپسی تک ”مرن بھرت“ کا اعلان کر دے۔ خوب نام کیا جائے گا۔“ وہ خود کلامی کرتی اٹھی اور پکن کی طرف چل دی۔



”میرا دل ایک نئے (چھوٹے) جے کٹورے کی طرح ہو گیا ہے۔ بھائی رضوان الحق بات بات پر بھر آتا ہے کٹورا بھر جاتا ہے تو دو گن (بنے) لگتا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ہو گیا ہوں۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ چاہتا ہوں سارا دن تھتہ تھتہ (ہاتھ پر ہاتھ) رکھ کے بیٹھا رہوں۔ اکھاں سامنے (نظروں کے سامنے) کچ (کچ) بھی نہ ہووے پر میں نکدار ہوں (دکھتا رہوں)۔“

رضوان الحق منہ پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کھاری کی باتیں سن رہا تھا اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ جس کھاری کو جانتا تھا یہ وہ کھاری نہیں تھا۔ کھاری کی معصوم باتیں جن میں بعض اوقات وہ انجانے میں ہی بہت گہری بات کر جایا کرتا تھا۔ اس کا بات بات پر ہنس دینا۔ اس کی بے نیازی سب یک دم کہیں غائب ہو چکی تھی۔ یہ کھاری جو اس کے سامنے تھا بہت الجھا ہوا، تھکا ہوا، شکست خوردہ اور غم زدہ تھا۔ یوں جیسے اس کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ گزر چکا ہو۔

اپنی شادی سے اگلے دن تو یہ بہت خوش تھا۔ پھر اب اسے کیا ہوا۔“ اس نے سوچا۔ اس کی کال میں کوئی ایسی ہی بات محسوس ہوئی تھی۔ جیسے یہ بہت مشکل میں ہے۔ جب ہی تو میں فوراً اس کی طرف بھاگا آیا۔ مگر وہ دیکھ رہا ہوں اس کا اندازہ تو نہیں تھا مجھے۔

”تمہاری بیوی کہاں ہے افتخار؟“ اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ اپنے رستے سیدھے کرنے گئی ہے۔ ساڑے جئے (ہمارے جیسے) لوکاں (لوگوں) کے ساتھ بھی عجیبی ہوئی گزرتی ہے بھائی رضوان الحق! پہلے نہیں انگلی سے پکڑ کر ایک راستے پر چلایا جاتا ہے۔ چلتے جاتے ہیں پچھلے

جاتے ہیں کوئی موڑ آتا ہے تو آسپاسے (ادھر ادھر) دیکھتے ہیں۔ راستے پر چلانے والا کدھر گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تو غائب ہے۔ اب کیا کریں۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے کی طرف اشارہ کیا۔ جب کتنا ہی آسپاسے کوئی نہیں ملتا تو خود ہی موڑ مڑ جاتے ہیں۔ پتا ہوتا نہیں کہ کبھے (بائیں) مڑتا ہے کہ سجے (دائیں) موڑ مڑ کر۔ جب کتنا ہی آگے پہنچ جاتے ہیں تو رستے پر چلانے والے کہیں سے نکل آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اوہو ہوو یہ کدھر نکل آئے تم یہ تو تمہارا راستہ نہیں تھا۔ چلو واپس پھر سے شروع کرو۔“ کھاری کے چہرے پر دھک بھیل رہا تھا۔ ”تسہی دسو۔“ بھائی رضوان الحق پھر سے شروع کرنا آسان کام ہے کیا۔ جو راستے تسہی لنگ آئے (جو عبور کر چکے ہو)۔ ان پر سے گزر کر واپس شروع ہو جانا سوکھا (آسان) کام ہے کیا؟“ اس نے رضوان الحق کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

رضوان الحق نے جھرجھری لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”کتنا اوکھا کام ہے جی یہ۔“ کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

”سعد یہ آج کل یہ ہی اوکھا کام کر رہی ہے۔ پھر سے اشتارٹ (اشارٹ) اپنے راستے سیدھے کرنے پر لگی ہوئی ہے جی۔“

”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے رہنمائی ملنے لگی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔“ اگرچہ رضوان کو کھاری کی اس مہمل سی بات کی پوری طرح سمجھ نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

”اس کی اچھی بات میں کھاری تو مفتے میں مارا گیا ناجی!“ کھاری نے سر جھٹکا۔

”نہ میں نہیں رہا نہ اس دا (اس کا) بندہ (شوہر)“ ایک اور مہمل بات۔

”کیوں۔“ خیر تو ہے نا؟“ رضوان گھبرا کر بولا۔ ”کیا وہ تمہیں چھوڑ گئی ہے؟“

”نہیں۔“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”بھی تے نہیں چھوڑا پر لگتا ہے چھوڑ جائے گی۔ میں کل بھی اس کے قابل نہیں تھا۔ آج تو ہو رہی ناقابل ہو گیا ہوں گا۔ وہ بھل بھلا کچے (انجانے میں) میرے سینے ٹال آ گئی تھی۔ اب جب اسے اپنا راستہ سیدھا نظر آیا تو میرا سینہ اور اینٹ گارے کی دیوار ایک برابر ہو جائے گی۔ آپ ہی بتاؤ بھلا اینٹ روڑے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کوئی کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔“ کھاری نے سوال کیا۔

”جنہیں تحفظ اور سایہ درکار ہوتا ہے۔ ان کو بعض اوقات دیوار بھی کافی ہوتی ہے سارا لینے کے لیے میرے بھائی۔“ رضوان نے کہا۔

”نہیں بھائی رضوان الحق!“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”یہ بس کہنے کی باتیں ہیں۔“

”دیکھو جب تک تم مجھے تفصیل سے سیدھی اور مکمل بات نہیں بتاؤ گے مجھے شاید سمجھ نہ آئے کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہوا ہے؟“ رضوان نے کہا۔

”میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسئلہ ہوا کیا ہے پر مسئلہ ہے ضرور۔“ کھاری نے فلسفوں کے سے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”صل میں بھائی رضوان الحق۔ کڑفوژن بڑا ہے۔“ اس نے رضوان کی طرف دیکھا۔ ”میں پہلے کھتا تھا کلا (اکیلا) میں ہی کڑفوژن ہوں۔ پر اب لگتا ہے ہر منہ ہی کڑفوژن ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”آپ کو سعد باؤ صاب یاد ہے؟“ اس نے رضوان سے پوچھا۔

”وہ جو تمہاری شادی پر آئے تھے اور جن کی آواز بہت اچھی تھی۔“ رضوان نے کہا۔

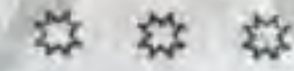
”ہاں وہی۔“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”کتنے اچھے (بڑے) بندے ہیں وہ۔ پیارے بھی ہے۔ عزت نام سب کچھ مجھے لگتا تھا اچھے (اونچے) ہی نہیں سچے (صاف) بندے بھی ہیں وہ۔ نہ غم نہ کوئی فکر نہ فاقہ پڑتا۔“ اس نے ایک دفعہ پھر سر ہلایا۔ ”میں نے کمانا ہر منہ ہی کڑفوژن ہے۔ نہ نور باجی نے بھین جی نول دیا کہ سعد صاب کی والدہ کدھرے

گواچ (گم) گئی ہیں۔ وہ ہر طرف اپنی ماں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ "اس نے رک کر اپنی بات پر رضوان کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔

"پر کڑیوژن اتنا زیادہ ہے کہ شادی کے دنوں میں کتنی بار بھین جی کو انہوں نے دیکھا اور سمجھ نہ سکے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوں۔ میں جو جنگلوں بیابانوں میں، میلوں ٹھیلوں میں، بازاروں میں، پھاٹوں میں ڈھونڈتا ہوں ہوں۔ جہاں ملنے کی آس ہوتی ہے وہاں پوچھتا پھرتا ہوں۔ میری منزل تو میرے سامنے کھڑی ہے۔ بس ایک قدم آگے بڑھاؤں تو سراغ تو سامنے ہے۔ پر ستیاناس جائے اس کڑیوژن کا۔ عقل کا روہ اپنی جگہ سے اوجھی اپنی (آدھا لہجہ) بھی نہ ہٹا۔ ادھر بھین جی تڑپتی رہ گئی۔ ادھر سعد باو صاحب گڈی کا اسٹیرنگ (اسٹیرنگ) سنبھال کر یہ جاوہ جا۔"

"کیا پسلیاں بھجوا رہے ہو بھائی افتخار؟" اب کے رضوان الحق کو لگا جیسے کھاری کے داغ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی جو وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔

"او ٹھہرو جی۔ میں آپ کو سناتا ہوں ساری تفصیل۔" کھاری کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ رضوان کو کوئی راز کی بات بتانے کے بجائے کنفیوژ کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رضوان کے قریب بیٹھ گیا۔



وہ کمرے کے درمیان۔ اکیلے کھڑے تھے۔ اس کمرے میں آنے سے پہلے وہ وطن اس شش و پنج میں رہے تھے کہ انہیں ادھر آنا بھی چاہیے یا نہیں۔ شش و پنج کی یہ کیفیت بھی نہ جانے کتنے عرصے کے بعد ان پر وارد ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اپنے معاملات میں پر یقین اور اٹل رہتے تھے کہ ایک کے علاوہ کوئی دوسری سوچ ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی تھی۔

"چاہے انسان اعلان کرتا پھرے یا عمر بھر اسے راز رکھے۔ جو بھی چیز اس کی کمزوری بن جائے اس کے ہاتھوں کھانا ہے۔" کمرے کے درمیان کھڑے کھڑے انہوں نے سوچا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے کسی اشارے، کسی سراغ، کسی سبزیتی کو ڈھونڈتے ہوں۔ جس کو پانے پر وہ اپنی تلاش میں آگے بڑھ سکیں۔

سامنے کی دیوار پر ایک پورٹریٹ سائز تصویر موجود تھی۔ لیکن وہ دانستہ اس تصویر سے نظریں چار رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہی اس تصویر پر ان کی نظر پڑی۔ ان کا چہرہ عیاں آہنی خول آن کی آن میں ٹوٹ جائے گا۔

"اور یہ بھی کتنی عجیب سی بات ہے کہ جب سے وہ بڑا ہوا ہے، میں پہلی بار اس کے کمرے میں آیا ہوں۔ مجھے علم ہی نہیں کہ اتنے برسوں میں اس کے کمرے کا اثیریر کتنی بار بدلا۔ کس نے انتخاب کیا اور جس نے انتخاب کیا اس کا ذوق کیسا ہے۔" انہوں نے سوچا۔

"جو دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔ وہی اتنے فاصلوں پر کھڑا رہا اور میں فاصلے کے اس طرف کھڑا ہی نظروں کی پیاس بجھاتا رہا کہ تعلق جیسا بھی ہے۔ وہ نظروں کے سامنے تو ہے نا۔" انہوں نے کھڑکی پر برابر کیے ہوئے پردے ہٹاتے ہوئے سوچا۔

"کتنی بار اس کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے باہر دیکھا ہو گا۔" انہیں خیال گزرا۔ شاید اکثر یا شاید کبھی بھی نہیں۔

"لیکن سوچنا تو یہ ہے کہ وہ آخر کیوں بھاگ رہا ہے؟ اور بھاگ کر گیا کہاں ہے؟" وہ واپس کمرے کی طرف

مڑے۔ جہاں کھڑکی سے پردہ ہٹنے کے بعد روشنی ہی پھیل گئی تھی۔ انہوں نے کمرے کے فرش، فلور میٹس، بیڈ، کرسیوں، اسٹڈی ٹیبل اور دیوار کی دیوار ڈروپ پر نظر دوڑائی۔

"خیر بھاگ تو وہ جتنا بھی لے جائے گا کہاں۔ ایک وقت تو اسے ہاتھ آتا ہی ہے۔" وہ سعد کے غائب ہو جانے پر خود کو خود دلاسا دینے میں مشغول تھے۔ لیکن ان کا دل کسی انہونی کے ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق وہ دینی سے اگلی فلائٹ پر اسپین چلا گیا تھا۔ اسپین میں ان کے چند بندے اس کا پیچھا کرنے کے لیے حرکت میں تو آچکے تھے۔ لیکن وہ اس کے پلان پر ششدر تھے۔ اس نے انہیں محسوس بھی نہیں ہونے دیا اور ایک رات میں انہیں چمکے دے گیا۔

انہیں رہ رہ کر ناشتے کی میز پر ہونے والی آخری گفتگو یاد آرہی تھی۔ وہ معنی خیز باتیں کر رہا تھا اور وہ اسے جان بوجھ کر طرح دیے جا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایسی معنی خیز باتوں اور ایک دوسرے کے خلاف گفتگو کے پوائنٹ اسکور کرنے کا سلسلہ عرصے سے جاری تھا۔ اس روز بھی وہ اسے معمول کا حصہ جان کر محفوظ ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ابراہیم کے ہاتھوں پکڑے جانے پر تپا ہوا تھا۔ اسی لیے ایسی باتیں کر رہا تھا جن سے اس کا غصہ اور رد عمل جھانک رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ وہ ان سے فرار حاصل کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ فرار حاصل کرنا چاہ رہا تھا اور حاصل کر چکا تھا۔

"کیسی غیر فطری زندگی گزاری ہم نے۔" وہ شل ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ قہر میں فاصلے، فاصلوں میں قہر، اوپر اوپر سے ایک دوسرے کو جانا کبھی دل کے اندر جھانکنے کی کوشش نہ اس نے کی نہ میں نے۔

اور ایسا اس لیے ہوا کہ میں خوف زدہ تھا۔ میرا دل خوف زدہ تھا۔ میرا اندر نظریں چراتا تھا۔ جو کبھی اس خاص سطح سے آگے بڑھ کر اس نے کچھ پوچھ لیا تو کیا میں خود کو جسنی فائی کر پاؤں گا۔ کیا میں اس کو وہ وضاحت دے پاؤں گا جو میں آج تک خود کو نہیں دے پایا۔ کیا میرے اقرار اور میرے انکار مجھے اس کے سامنے ایک کٹھن میں نہ لا کھڑا کریں گے۔ جہاں جرح ہوگی اور اپنی صفائی میں کہنے کے دلائل، مگر کیا وہ دلائل قابل قبول ہوں گے۔ کیا وہ اس گہرائی تک جاسکے گا جو حالات کے رخ موڑ سکتی ہے۔"

انہوں نے گردن پیچھے کرتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے نکالیا۔

"شاید نہیں۔" اس شاید نہیں کے خوف نے ہی تو فاصلوں کو قہرتوں میں ڈھلنے نہیں دیا۔

انہوں نے سراٹھا کر یوں جھٹکا جیسے اپنے ہی نظریے سے متفق نہ ہوں۔

"اور اب جو اس کی ناشتے کے ٹیبل والی گفتگو یاد کرتا ہوں تو وہم آتا ہے کہ اس کے فرار کا تعلق ان ہی باتوں سے ہے جو ایک خاص سطح سے پار کی ہیں۔ اگر صرف کسی ایک اشارے کا نتیجہ یہ فرار ہے تو پوری داستان کا رد عمل کیا ہو گا صابر اویس کی طرف سے۔"

انہوں نے بے دھیانی میں اسٹڈی ٹیبل کی دراز کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوچا۔ بے دھیانی میں باہر نکلی دراز میں ان کے لیے کیا موجود تھا۔ اسے باہر نکالتے ہوئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اشارے تھے۔ سبزیتی تھی۔ وہ اس میں موجود سراغ، اشاروں اور سبزیتی کو دیکھنے میں یوں محو ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا۔



"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا یہ کیا ہو رہا ہے؟" سیسی آئی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیوں آئے روز ہمیں تفتیش کے لیے سامنے بٹھالیا جاتا ہے۔ سعد سلطان کہاں چلا گیا ہے جو ہم سے ہمارے پوچھا جاتا ہے کہ بتائیں وہ کدھر ہے۔“

سیسی آنٹی کی آواز لرز رہی تھی اور اچھے خاصے خوش گوار موسم میں بھی ان کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے متوحش نظروں سے سارہ کو دیکھا جو چہرے کو ہاتھ پر لٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”سارہ!“ انہوں نے سارہ کا بازو جھنجھوڑا۔ ”کیا تمہیں کوئی فکر نہیں ہے؟ کیا تم ذرا سا بھی پریشان نہیں رہیں؟“

”پریشان ہونے یا پریشانی دکھانے سے کیا فرق پڑے گا سیسی آنٹی۔“ سارہ نے چہرہ ہاتھ کے اسٹینڈ سے لٹکاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ”بھی تو صورت حال ہی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ کیا ہوا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ کیا پتا ہے ہمیں۔“

”یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ سیسی نے جھلا کر کہا۔ ”تم نے اس روز اس سے کیوں کرید کر نہیں پوچھا کہ وہ جو تمہیں بینک اکاؤنٹس کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کی تفصیل سنا رہا تھا تو کیوں سنا رہا تھا۔ تم نے تو اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس روز وہ اتنے رف حلیے میں کیوں تھا۔ میں نے ہاتھ کی چوٹ کا پوچھا تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ اس کے ہر انداز میں اس روز کچھ غیر معمولی تھا۔ لیکن تم نے نوٹ کیا؟ نہ مجھے کچھ پوچھنے دیا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے وہ مجھے میرے کسی ایسے سوال کا جواب دیتا جو ہم سے باہر اس کی جنرل زندگی سے متعلق ہوتا۔“ اس نے سوال کیا۔

”ہمارے لیے ہمارے سامنے اس کا صرف ایک ہی روپ نمایاں ہے۔“ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”بینکی کے فرشتے کا روپ۔ اس سے آگے وہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کون ہے۔ میں اور آپ نہیں جانتے۔ پھر اس سے کیا سوال کرتے آخر ہم؟“

”تو پھر اتنا تو سوچو کہ آئندہ کیا ہوگا۔“ سیسی آنٹی کے سامنے مستقبل کسی خوفناک بھتنے کی طرح ناچ رہا تھا۔ ”ہمارا کیا ہوگا۔ یہ فلیٹ؟ یہ سامان۔“ انہوں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ ”زندگی گزارنے کے تمام وسائل“ ان کے چہرے پر وحشت دوڑنے لگی۔ ”سعد تو کہیں چلا گیا۔ وہ تو رابطے میں بھی نہیں ہے۔ سوچو ہم کیا کریں گے؟“

”حیرت ہے سیسی آنٹی! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔“ سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ سعد کے یوں چلے جانے پر آپ کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔“

سیسی آنٹی اسی طرح وحشت زدہ چہرے کے ساتھ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کو وہ دن شاید بھول گیا۔“ سارہ کے لہجے میں تلخی اتری۔ ”وہ گفتگو بھول گئی۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ کیونکہ آپ کی اس گفتگو نے ہی مجھے باغ عدن سے دشت ظلمت میں لاپھینکا تھا۔ یاد کریں ذرا۔“ اس کے لہجے کی تلخی بڑھی۔

”آپ نے کہا تھا سعد تمہاری زندگی میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور جب وہ چلا گیا تو سوچو ہم کیا کریں گے؟“ سارہ کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

”مبارک ہو آپ کو۔“ پھر اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ وہ مبارک وقت آن پہنچا جب سعد ہماری زندگیوں میں نہیں ہے۔“ اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو روکنے کے لیے لہجہ بھر کو سر جھکایا۔

”مگر آپ کو کیا فکر۔“ آپ کے تو دونوں ہاتھ سلامت ہیں اور ان دونوں ہاتھوں کو کام کرنے کی عادت بھی ہے۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی اور ناک اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”آپ جائے جاکر کوششیں اور ان سلائی کے شاہکار بنا کر بیچیں سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کیجئے۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں کہ ہمارا کیا ہوگا۔ اس کے بجائے آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ سارہ اب تمہارا کیا ہوگا؟“ اس نے بتانے کے سے انداز میں اس جملے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتے ہوئے کہا۔

”میرے ہاتھ۔“ اس نے اپنے کمزور ہاتھ میز پر پھیلائے۔ جن پر نیس ابھری ہوئی تھیں اور جن کی ہتھیلیوں کا رنگ زرد تھا۔ ”اور میری ٹانگیں اس نے میز کے نیچے سے اپنی ٹانگیں باہر نکال کر پھیلائیں۔ ”معذور ہیں کمزور ہیں کچھ کرنے کے قابل نہیں لیکن پھر بھی مجھے سعد کے یوں چلے جانے پر یہ غم نہیں ستا رہا کہ آگے میرا کیا ہوگا۔“ اس کی آواز بھرانے لگی۔

”میرا دل یہ سوچ کر کٹنا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا جو اس کے اپنے اس کو ڈھونڈنے یہاں چلے آئے۔ میرا ذہن یہ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا ہے کہ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا۔ اس روز جب وہ یہاں آیا تھا تو کتنا ٹوٹا ہوا اور دکھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط تھیں اور متنی خیز بھی۔ مجھے ان کے معنی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور اس روز سے ہی نہ جانے میرا دل کیوں اس خدشے میں تھا کہ اب شاید ہی کبھی میں اسے دیکھ پاؤں۔“ سبکی آنٹی سارہ کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پریشانی بھول گئیں۔

”مجھے اس وقت سوائے اس کے غم کے کوئی اور غم یاد نہیں سبکی آنٹی! اب اس کی آواز پست ہونے لگی۔ ”جو دنیا کے لیے پیسے والا آدمی ہے جس کے پاس پیسہ ہے اور بہت ہے۔“ اس نے سبکی کو طنز سے دیکھا۔ ”مگر مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ دل والا آدمی ہے۔ اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا ہے۔ وہ ہے۔ جس کی آمد میرے لیے زندگی کا پیغام اور جس کی رخصت اس کی دوبارہ آمد کی امید دیتی رہی ہے۔ اب جس کے یوں چلے جانے سے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے زندگی رخصت ہوئی۔ صرف سائیں باقی ہیں۔“ سبکی آنٹی پھٹی پھٹی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”باقی رہا زندگی گزارنے کا معاملہ اور آئندہ آنے والے وقت کا انتظام۔“ وہ سانس لینے کے وقفے کے بعد بولی۔ ”تو میں نے کہا تھا وہ صرف پیسے والا نہیں دل والا آدمی ہے۔ پچھلے ایک عرصے سے وہ مجھے خود اپنے آپ پر انحصار کرنے کے سبق یوں ہی نہیں پڑھا رہا تھا۔“ اس نے سبکی آنٹی کی طرف دیکھا۔ جس نے اس کے یوں دیکھنے پر شرمساری سے سر جھکا لیا۔

”یہ جو میرے ہاتھ کام کرنے لگے ہیں اور میری ٹانگیں چلنے لگی ہیں۔ ان کو کس نے کام کرنے اور چلنے کا حوصلہ دلایا۔ میں تصویروں میں رنگ بھرنے سے شروع ہو کر سولی دھاگے کے کام تک کس کے کہنے پر پہنچی۔ اسی دل والے کے کہنے پر جس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے۔ یوں ہی تو وہ اس روز مجھے بینک اکاؤنٹس کے لی ایم اور کریڈٹ کارڈ کی تفصیل لکھ کر مجھے نہیں دے گیا۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”لیکن ان بے حقیقت چیزوں کے سامنے دنیا کی سب سے بڑی حقیقت مجھ سے نظریں ملانے کو میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ وہ نہیں ہے سبکی آنٹی۔ وہ کہیں نہیں ہے۔“ اس نے اب اپنے آنسوؤں کو روکا نہیں انہیں بہنے دیا۔

”آپ لے لیں وہ سب وہ سب تفصیلات آپ لے لیں۔ اکاؤنٹ کارڈز پیسہ سب آپ لے لیں۔“ بغیر کہ وہ پیسہ اس نے مجھے کس مد میں دیا۔ زکوٰۃ کی مد میں یا خیرات کی مد میں۔ اسے اس وقت تک استعمال نہیں کی سبکی آنٹی! جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا۔“ وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بولی۔

”روزگار کا غم میرا روگ نہیں ہے۔ اس کی جدائی کا غم منانے دیں مجھے۔ وہ جو کہیں نہیں ہے۔ وہ جو کہیں گم ہو گیا ہے۔“

سبکی آنٹی سارہ کو روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنی وقتی پریشانی بھول بیٹھی تھیں۔

”بھی یہ صرف اس کے نہ ہونے کا غم منا رہی ہے۔ یہ اس بات سے بے خبر ہے کہ سعد کے لواحقین جو اسے ڈھونڈتے ہم تک آپہنچے ہیں وہ ہمارے اس کے ساتھ تعلق کی نوعیت کے بارے میں کتنے مقلوب ہو رہے ہیں۔“

جہانمیدہ سبکی آنٹی کی سوچ سارہ سے بالکل مختلف سمت میں سفر کر رہی تھی۔ انہیں وہ رہ کر سعد کے متعلق سوال کرتا وہ گول مٹول لڑکایا دہا تھا جو یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ دونوں یقیناً ”جانتی تھیں کہ سعد کیوں اور کہاں گیا تھا۔ کیونکہ آخری بار اس نے سعد کو ان ہی کے فلیٹ کے نیچے پکڑا تھا۔“

”اور اگر وہ ہمارے پیچھے پڑ گئے تو یہ فلیٹ یہ اکاؤنٹ اور یہ پلاسٹک منی سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر کھلا آسمان ہوگا اور ہم ہوں گے۔ یہ تو سو فیصد درست بات ہے کہ میں اپنے جینے کا سامان کر سکتی ہوں۔ مگر تمہ۔ تمہارا کیا ہوگا سارہ۔“ سبکی کے دل میں سوال اٹھ رہے تھے ”کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ کسی کے سہارے کے بغیر تمہارا بوجھ اٹھا سکوں؟“ وہ سوچ رہی تھیں۔



اس نے کمرے میں روشنی کا کوئی ذریعہ آن نہیں کیا تھا۔ وہ دوپہر سے صوفے پر ٹانگیں سمیٹے اپنے سامنے میز پر رکھی ان چیزوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی جو اسے کوریئر کے ذریعے موصول ہوئی تھیں۔ دوپہر گزری سہ پہر نے سورج کا رخ بدل دیا۔ پھر شام کے سائے اترنے لگے اور کمرے میں روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی کم ہوتے ہوئے تاریکی میں بدلنے لگی۔ لیکن اس کی ساکت نظریں میز پر رکھی ان چیزوں سے نہیں ہٹیں پھر کمرے کے دروازے کے اوپر لگی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ گھنٹی کی اس آواز نے اس کے ذہن کو چونکایا، لیکن یوں ہی بیٹھی رہی۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور اس کی آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی تھی۔ مجبوراً اسے اپنی نظریں اس جگہ سے ہٹانی پڑیں اور اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا۔

”فہ! کیا مصیبت ہے۔“ وہ بلند آواز میں چلائی اور تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔ ”کون ہے؟“ بلند اور غصیلی آواز ساکت فضا میں پھیلی۔

”دودھ لے لیں میڈم! اور دودھ کاٹل بھی دے دیں۔ آج ڈیوڈسٹ ہے مل کی۔“ باہر سے آواز آئی۔ ”مگر تم آج مل نہ گئے تو کیا قیامت آجانی؟“ اس نے گیٹ کھول کر اسی درستی سے کہا۔

”ملک شاپ پر پیسے جمع کروانے ہوتے ہیں میڈم! وہ انتظار نہیں کرتے۔“ سامنے کھڑے لڑکے نے جواب دیا۔ وہ ان میڈم صاحبہ کے غصے اور درستی سے واقف تھا۔ لہذا اس رویے سے بالکل بھی نہیں گھبرا یا۔

”اس وقت میرے پاس گھر میں کیش بالکل نہیں ہے۔ کل لے لیتا۔“ اس نے دودھ کے پیکٹ پکڑتے ہوئے اس درستی سے کہا جو اس کی عمومی شخصیت کا خاصا تھی۔

”میں معذرت خواہ ہوں میڈم! پیسے تو مجھے لے کر ہی جاتے ہیں۔“ لڑکا تحمل سے بولا۔ اس کے لیے ایسے بلانے روز مرہ کا معمول تھا۔

وہ کچھ دیر غصے میں پھنکارتی شعلہ بار نظروں سے لڑکے کو گھورتی رہی اور پھر زور سے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے اپنی مڑکی۔ سات منٹ کے بعد گیٹ پر واپس آکر اس نے پیسے سج لڑکے کے منہ پر مارتے ہوئے بلند آواز میں

اسے دفع ہو جانے کو کہا تھا۔

”تھینک یو میڈم! ہواے ٹائس اونٹنگ!“ لڑکے نے اپنی بی کیپ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس مڑ کر اپنی موٹر بائیک اشارت کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ٹھاہ کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ میڈم کے گیٹ بند کرنے کا انداز تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر مسکرایا اور بائیک کی سیٹ پر بیٹھ کر اسے سڑک کی طرف موڑتا اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔

”افوہ دنیا! انسان کو تمہارے اور تمہاری زندگی کیوں گزارنے نہیں دیتی۔“ اس نے بلند آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ جس پر ننھے ننھے ستارے جا بجا بکھرے پڑے تھے۔

”اسی لیے تو میں اپنی ذات کے دروازے بند کیے سب سے چھپ چھپا کر بیٹھی تھی کہ نہ کسی کو میرا پتا معلوم ہو نہ کوئی آئے اور دستک دے۔“ اس کے چہرے کے نقوش غصے کے مارے بگڑنے لگے تھے۔

”براہو اس دوستی کا جس نے لوگوں کو میرے راستے دکھا دیے۔“ اس کا دماغ اٹنے لگا۔

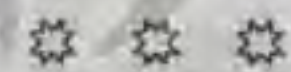
”ہو گیا نا سب پھر سے درہم برہم۔“ میز پر رکھی چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے ”لگ گئے سراغ۔ اوہن ہو گئے سب کلوڑ چھپوڑ“ جیسے میں نے اپنی پہلی انعامی معمرے میں چھپوائی تھی کہ جو بوجھ لے گا اسے انعام ملے گا۔“ اس نے شعلہ بار نظروں سے ان چیزوں کو گھورا۔

”نہیں چاہیے مجھے کوئی کلیو“ نہیں چاہئیں مجھے کی ورڈز“ نہیں چاہئیں مجھے گشدرہ پتے اور ان پتوں پر موجود حقیقتوں کا سامنا۔“ آگے بڑھ کر میز پر رکھی چیزوں کو ہاتھ مار کر ادھر ادھر گراتے ہوئے وہ بلند آواز میں چلائی تھی۔

اس کے ہاتھ مارنے سے کچھ چیزیں قریب ہی اور کچھ دور جا گری تھیں۔ گرنے والی چیزوں میں وہی یاداموں کا ایک پیکٹ بھی تھا جو فرش پر گرنے کی چوٹ کھاتے ہی پھٹ گیا تھا اور اس میں موجود یادام ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ اس پیکٹ پر چسپاں پرچی پر سیاہ روشنائی میں ایک دلچسپ عبارت درج تھی۔

”آپ کی بے لوث میزبانی کا عوضانہ وہی یادام یقین جانے یادام گوئی ہیں گو تاہ قامت اور ناقابل انتہا“ لیکن اصلی ہیں۔ اس لیے کہ اپنے ہیں خالص اپنے۔“

وہ اس عبارت کو پڑھ چکی تھی اور شاید اس کا مفہوم بھی سمجھ چکی تھی۔ لیکن وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے سفید اور سیاہ امتزاج والے گھنگھریالے بالوں والا سروونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔



”میں نے تمہیں اپنی کہانی سنائی بھائی افتخار! اور تمہاری کہانی تم سے سنی۔ اب بتاؤ کس کا بوجھ زیادہ ہے کون زیادہ خوار ہوا؟“

”سبغول تے کج نہ پھول۔“ کھاری نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”جس کو پھولو وہی دکھی جس نوں سنو ادھی سچا بھائی رضوان الحق! میں نے کہا تھا نا یہی کڑو ٹوٹن ہے۔“

”ہر کوئی کسی دوسرے کی تلاش میں لگتا ہے۔ میری اور تمہاری کہانیوں کے سب کردار بھٹکتے پھرتے اور خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔“ رضوان نے سراٹھا کر خود پر جھکی درخت کی شاخوں کے چھدرے چوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

دن بھر کے جس کے بعد آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ جس کے ساتھ درخت کے پتے بھی آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

”سچ آکھیا بھائی رضوان الحق! کس کا سرا کس سے جا کر ملتا ہے کون جانے۔“ کھاری نے ٹھنڈی کوبھرتے

ہوئے کہا۔ وہ اپنے تئیں اپنی ذات کے دکھ بیان کرنے بیٹھا تھا۔ مگر رضوان کی داستان سن کر اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ کم از کم اس کے سر پر اور کسی کا نہ سہی چوہدری سروار کا سایہ تو تھا ہی۔

”تم ایک کام کرو بھائی افتخار۔“ رضوان نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جتنے ہی رہتے ہیں یہ جپانی اور چینی گڈے۔“ کھاری کو اس کی چھوٹی آنکھیں اور چھوٹی سی چٹنی ناک دیکھ کر خیال آیا۔ ”شکلوں سے بہت معصوم لگتے ہیں۔ بھانویں (چاہے) اندر سے کتنے مکار ہی کیوں نہ ہوں۔“ اسے اپنے ہی خیال پر ہنسی آنے لگی۔

”ہاں جی! کیا کام؟“ وہ اس بے اختیار ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے رضوان سے پوچھنے لگا۔ ”لگدا اے پتا نہیں کتنے سالوں بعد ہنسا ہوں۔“ اسے خیال آ رہا تھا۔

”نورا“ سے پہلے اپنی بھین جی اور سعد صاحب کی ملاقات کا انتظام کرو۔ یہ بہت ضروری ہے بھائی! کوئی پتھرا ہوا تو کسی سے ملے نا تمہاری داستانوں میں۔“ رضوان نے سنجیدگی سے کہا۔

”کتنے چھوٹے چھوٹے بال ہیں اس کے۔“ کھاری بے دھیانی سے رضوان کی بات سنتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”مشین ہی پھیسوار کھی ہے بے چارے نے۔ لگتا ہے کھاس آگئی ہوئی ہے ٹکی ٹکی۔“

”میری بات غور سے سن رہے ہو بھائی افتخار؟“ رضوان کو اس کی غائب و غای کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ”آہو جی! کھاری چونکتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو بتایا تو ہے کہ مہ نور باجی اسی ویلے واپس چلی گئی تھیں سعد باؤ صاحب سے بات کرنے۔“

”تو پھر اب تک ان کی کوئی اطلاع تو نہیں آئی نا۔“ رضوان نے کہا۔ ”ان سے کسی نے پوچھا کہ سعد صاحب کی کیا خبر ہے؟“ بھین جی کے بارے میں سن کر ان کا کیا رد عمل تھا؟

”نہیں جی۔“ کھاری نے کان کھاتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ”آپ نوں بتایا تو ہے میں نے سعدیہ والی بات۔ مجھے تو اپنی پڑ گئی تھی جی۔ میں نماٹا بڑا برا پھنسا بھائی رضوان! اپنے دیکھنے کی عمر تھی پڑ کبھی دیکھے نہیں تھے۔ چوہدری صاحب انگل سے پکڑ کر سپنوں کی دنیا میں لے گئے۔ ابھی پوری طرح دیکھے وی نہیں تھے کہ دھکے نال جگا دیا کسی نے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”ضروری نہیں کہ بھیا تک خوابوں کی تعبیر بھی بھیا تک ہی ہو بھائی افتخار! کبھی کبھار خوابوں کی تعبیریں ان سے الٹ بھی ہوتی ہیں۔“ رضوان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی بیگم کی واپسی کا انتظار کرو۔ واپس نہ آئے تو بہت کرو اور جا کر اس سے پوچھو کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ گوگو میں پڑے رہنے سے بہتر ہے انسان حقیقت سے نظریں چار کر لے۔“

”کوئی آسان کام بتاؤ رضوان بھائی! حقیقت نال نظریں چار کر لو۔ واہ جی واہ!“ کھاری نے اس کی بات دہرا کر کہا۔ ”پہاڑ تے چڑھ کر دوسرے پاسے اترنا آسان کام ہے۔ حقیقت نال نظراں ملانا بڑا اوکھا کام ہے میرے بھائی۔“

”تو کیا پھر یوں ہی ادھر ادھر چھپتے پھوگے خود سے بھی اور لوگوں سے بھی؟“ رضوان نے اب کے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”کیا فائدہ ہو گا اس چھپن چھپائی کا؟ ایک نہ ایک روز تو حقیقت تمہارے سامنے کسی کوئے سے نکل کر آ کر کھڑی ہی ہوگی۔“ کھاری خاموشی سے سر جھکائے زمین پر آگے سبزے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

”اتنے بزدل ہو تو اسے کس برتے پر ہلا شیری دے رہے تھے کہ وہ ڈاکٹر بننے کی تیاری کرے۔ تم اس کے پتہ کی تلاش نہ جاؤ گے۔“

کھاری نے کچھ گیلی کچھ سوکھی زمین سے چند ٹوٹیاں نونچ کر اکھاڑیں۔

”خزانے کا چوکیدار بننا آسان کام ہے کیا؟“ رضوان نے اس کا بازو ہلا کر کہا۔ ”دس دفعہ دل بے ایمان ہونا ہے بندے کا۔ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ چرانا نہیں تو خزانے کو ہاتھ لگا کر ہی دیکھ لیا جائے کہ یہ ہوتا کیسا ہے۔“

”بس ہتھ لگانے سے پہلے ہی خزانہ، خزانہ ہوتا ہے بھائی رضوان! ہتھ لگا لو تو خزانے کی ڈھیری بھی مٹی ہو جاتی ہے۔“ پیروں کے بل اکڑوں بیٹھے کھاری نے خود رو بوٹیوں کا ایک اور پچھا اکھاڑتے ہوئے کہا۔

”خیر! ایسا بھی نہیں ہے۔“ رضوان نے کہا۔ ”سو نے کے کچھ ڈھیر ہاتھ لگانے سے کنڈن بھی بن جاتے ہیں۔“

”پریمیاں اچیاں باتیں نہ کرو بھائی صاحب! میری سمجھ وچ کتابوں کی باتیں کہاں آتی ہیں۔“

”سمجھنے کی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ بس بھابھی کی واپسی کا انتظار کرو۔“ رضوان نے کہا۔

”اگر راستہ دیکھ رہے ہو آپ؟“ کھاری نے نظر کے سامنے پھیلے ایک راستے کی طرف اشارہ کیا جو کچھیں کے درمیان پگڈنڈیوں کی شکل میں بل کھاتا، سیدھا ہوتا، مڑتا پھیلا تھا۔

”ایسوا ہی راستہ آگے جا کر مسجد کے پاس سے گزر کر کچے مڑتا ہے اور پھر مولوی جی کے گھر تک چلا جاتا ہے۔“ اس نے راستے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بڑا سبب راستہ نہیں ہے جی پر آج کل گلدراستہ نہیں اے بندہ چلنے لگے تو ختم ہی نہیں ہوگا۔ ساہ چڑھ جائے رستہ نہ سکے۔“

”یہ راستہ نہیں ہے بھائی افتخار! انتظار کی کیفیت ہے جو تمہیں تھوڑا سا فاصلہ میلوں پر پھیلا نظر آ رہا ہے۔“ رضوان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں اس کیفیت سے واقف ہوں۔ کیونکہ میں انتظار ہی نہیں کر رہا۔ معجزے کا بھی خطرہ ہوں اور میرے سامنے تو نہ کوئی راستہ ہے نہ منزل۔ بس سرب ہی سرب ہے۔“ وہ شاید خود سے مخاطب تھا۔ اسی لیے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔

”مگر تم فکر مت کرو۔ تمہارے پاس راستہ بھی ہے۔ منزل بھی۔ بس مقدر کو نظروں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آنا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک لوگوں کے مقدر ایک عرصے کے انتظار کے بعد جب یاوری کرنے ہیں تو اگلے پچھلے کئی ریکارڈ ٹوٹ جاتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”نہیں۔“ آسمان پر جمع ہوئے گہرے بادلوں سے ٹپکی ٹپکی پہلی بوند کھاری کے چہرے پر گری۔

”اوئے! اندر چلو۔ باطل برسنے لگا ہے۔“

پہلی بوند کے احساس نے کھاری کے اندر ایک عجیب سی سرشاری بھری۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح چیخ کر بولا اور رضوان کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتا ہوا فارم ہاؤس کی طرف آگیا۔

”جے تے میرا مقدر اچھا ہوا تو پھر بھائی رضوان الحق! ہم مل کر تمہارا معجزہ بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ ویسے اس کا نام بڑا عجیب سا ہے بھی۔“ فارم ہاؤس تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں اچھے خاصے بھیگ چکے تھے۔ کھاری نے اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے ہنس کر رضوان کو یقین دلایا۔

”تم سعد صاحب اور بھین جی کی فکر کرو پہلے۔“ رضوان نے اپنے سر پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

”پچلو ٹھیک ہے۔“ کھاری نے سر ہلایا اور سر جھکا کر مسکرایا۔ ”تو دسو بھلا، پر یا رانی بھی کسی لڑکی کا نام ہوتا ہے؟“ وہ دل میں محفوظ ہو رہا تھا۔ ”جپانی گڈے بھی پیار کے نام جپانی زبان میں ہی نکالتے ہیں۔ نام بھانوس، بدین اختر ہوا اس کا، پیار نال بلاؤ پر یا رانی۔“ اسے بلاوجہ ہنسی آئے چلی جا رہی تھی۔

”پچلو! شکر ہے ہم مسکرائے تو۔“ رضوان نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے موسم بھی موڈ بدل ڈالتا ہے انسان کا۔“

”میرے جیسے بندے کا تو دل کا بوجھ نکل جائے، تے وہ مسکرانے لگتا ہے۔“ کھاری مسکرایا۔ ”نہیں یہ۔“

بلانے پر آگئے، میرے دل کی سن لی میں بھلا چنگا ہو گیا۔“

”بڑے خوش قسمت ہو بھائی! اتنی جلدی بھلے جگے ہو جاتے ہو۔“

”پچلو! آپ کہتے ہو تو ہوں گے خوش قسمت۔“ کھاری نے سر ہلایا۔ ”او! آپ نول سٹڈو کھاؤں۔“

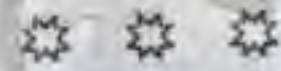
”سٹڈو؟“ رضوان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سٹڈو نہیں سمجھدے۔“ کھاری نے بے یقینی سے کہا اور پھر ہاتھوں میں فرضی باگیں پکڑ کر بانڈھلاتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ ”نگانگ نگانگ۔ گھوڑے والا فارم۔“

”او! اچھا۔“ رضوان نے سمجھ میں آنے پر کہا۔ ”تمہارے چوہدری صاحب کو چاہیے دو تین شیر بھالو، چیتے بھی رکھ لیں اور اپنا سر کس کھول لیں۔“

”سر کس ہی تے لگا ہے چار طرف۔“ کھاری نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی دیکھتے تے تالیاں بچائے نہ۔“

”بکھی بکھی تم سادگی میں بھی بڑی گہری بات کر جاتے ہو بھائی افتخار!“ رضوان نے کہا اور کھاری کے پیچھے چل دیا۔



”طیفی نے سنا ہے، قسم کھالی ہے۔“

”اچھا! کس بات کی بھلا؟“

”میرے منہ میں خاک بڑے سنا ہے، کہتا ہے اس دن بارات کے دو لے کی گردن اتار کر رکھ دوں گا۔“

”ہاہاہاہ۔ ارے واہ! لیکن گردن اتار کر رکھے گا کہاں؟“

”آپ مذاق سمجھ رہے ہو جی، طیفی نے سنا ہے، کبھی جھوٹی قسم نہیں کھائی۔ جو کہتا ہے پورا کر کے رہتا ہے۔“

”تو گردن میری اترنے جا رہی ہے، آنسو تمہارے بننے لگے، ٹانگیں بھی لگتا ہے کانپ رہی ہیں۔“

”تو ایسی باتیں سن کر میں جھومر گانے لگوں اور لڈی ڈالوں کیا؟ ٹانگیں تو دھشت کے مارے کانپ رہی ہیں۔“

”اچھا تو پھر تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟“

”آپ ادھر زیادہ آنا جانا بند کروں جی، سو دشمن کے ارادوں پر آگ برے پر آپ کی جان کی سلامتی چاہیے۔“

”ارے بھئی! میں آنا جانا کیسے بند کروں۔ یہاں میری بی بی رہتی ہے۔ جو آج کل دوسرے جی سے ہے۔“

”اور؟“

”اور کیا؟“

”اور یہاں تم رہتی ہو جو مجھے جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی ہو۔ تم کہتی ہو کہ مجھے بھاگ لگیں تو پھر دیکھ لو کیسے بھاگ لگے مجھے۔ کاروبار ایک دم اوپر جا رہا ہے۔ بس وہ فارغ ہو جائے خیر سے تو یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔“

”اللہ آپ کے شملے کو اور بھی اونچا کرے، اللہ اونچے دروازوں اور کڑی دیواروں والے محل عطا کرے۔ اللہ سے خیر الیٰں رکھے جی، لیکن مجھے بڑی فکر ہے۔ اس کی تو حالت ہی ایسی ہے۔ اس کے سامنے میں یہ باتیں نہیں کر سکتی، لیکن آپ کو سمجھاتی ہوں، اپنی جان کی سلامتی کا لحاظ کریں۔ نہ آیا کریں ادھر زیادہ۔“

”اچھا! اگر اتنا ہی خطروہ ہے اور حفاظت کا تردد ہو نہیں سکتا تو یہ پہلوان سراج سرفراز کیا کر رہا ہے ادھر؟ اس کی بیب میں دو ڈھائی سو روپے کیوں جھونکے جاتے ہیں ہر مہینے؟“

”آگ لگے اس ناس پیٹے کو تو جی۔ مشنڈا چار چار روٹیاں کھا کر بس ڈکار مارنے اور اپنے بڑے ہاتھ پاؤں

پھیلا کر لیٹے لیٹے چار پائی توڑنے کو ادھر بڑا رہتا ہے۔

”ستغفر اللہ توبہ کرو۔ نمازی پر ہیزگار بندہ ہے۔ اتنے برے برے الفاظ مت بولا کرو اس کے لیے۔“

”بولانہ کروں تو اور کیا کروں۔ طیفالائز سامنے والے چوبارے پر کھڑا لال لال آنکھیں نکالے مگر بیان کھولے ادھر جھانکتا رہتا ہے دن بھر اور یہ کم بخت سر نہچا کیے وضو کے لیے پانی اور کھانے کے لیے روٹی سالن مانگنے کے سوا کچھ کر نہیں سکتا۔ آپ کی زوجہ محترمہ بھی اپنے نام کی ایک خاتون ہیں۔ دل کی تسلی کو یہ مشتہاد ادھر بٹھا چھوڑا ہے۔ اناج کا دشمن۔ ہمیں تو گھر سے پڑ رہا ہے کم بخت۔“

”ہوں۔ سنا ہے، محلے والوں کو بھی اس کے ادھر پڑے رہنے پر اعتراض ہے؟“

”اعتراض نہ ہو تو اور کیا ہو۔ وہ تو کہیں گے ہی اور ٹھیک ہی کہیں گے کہ دو جوان جہان لڑکیوں کے گھر میں بیباہر کا مشتہاد کیا کر رہا ہے۔ نامحرم آگ لگتا۔“

”ہاں! یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔“

”آپ سمجھائیے اپنی زوجہ کو۔ اسے تو انگلی سے پکڑ کر نکال باہر کریں اور خود آپ کے سامنے تو۔ یہ لیں میرے ہاتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ادھر آنا کم کریں۔“

”نہ بھی! میں ادھر آنا نہیں چھوڑ سکتا۔ ہفتے کے شروع میں جب تک تمہاری دعاؤں کا کوئی نہ سمیٹ لوں مجھ سے کاروبار نہیں ہوتا۔“

”میری دعاؤں کا تو بہانہ ہی ہے۔ اصل میں تو سرکار اپنی زوجہ کی من موہنی صورت اور بیٹھی آواز سننے تشریف لاتے ہیں۔“

”کیا سولے آنے سیانی بات کی ہے تم نے۔ یاد کرو جب میں پہلے پہل یہاں آنا شروع ہوا تھا تو مجھ سے دس بیس روپیہ بخشش لے کر تم کتنی دعا میں دیتی تھیں مجھے۔ اونچی شان، اونچے بھاگوں کی۔ دیکھ لو! تمہاری دعا میں لگ گئیں مجھے۔ جس کی خاطر طیفالائز گردنیں اتارنے کو باؤلا ہوا پھرتا ہے وہ میرے عقد میں آگئی۔“

”ہاں! یہ تو ہے۔ مگر بڑا خونی فیصلہ۔ طیفے جیسے بندے کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک چھوٹے دس گردنیں اتار سکتا ہے وہ۔ پہلے بھی کتنی ہی اتار چکا ہے اور پھر بھی کھلا پھرتا ہے۔“

”چلو! تم دعا کرو یہ خیر سے فارغ ہو جائیں۔ پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔“

”میں نہ کروں گی دعا تو اور کون کرے گا۔ یہاں سے نکل چلیں گے تو اس مولوانوں کے لہلہے سے تو نجات ملے گی کم از کم۔“

”بھی! تمہاری کھٹکوز سمجھ میں نہیں آتیں مجھے۔ تمہیں طیفالائز زیادہ برا لگتا ہے یا یہ سراج سرفراز؟“

”طیفابرا نہیں لگتا۔ اس سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ لیکن اس سراج سے تو ایک عجیب سی چیز ہے مجھے۔ مگر آپ مجھے اس بار طیفوں اور سراجوں کی باتوں میں الجھا کر بچ نہیں سکتے۔ خیر سے لڑکا ہوا تو بچے سونے کے کنگن لٹا دیں۔“

”سچے سونے کے نہیں، سچی چاندی کے۔“

”ارے جائیں صاحب! بڑے کاروباری بنتے ہیں۔ سونے کو چاندی میں بدل دیا۔ جائیں جائیں ہم کچھ بھی نہیں لیتے۔ میرے لیے چاند جیسا لڑکا ہی بہت ہوگا۔“

”اوہو! تم تو برا مان گئیں۔ اچھا چلو سونے کے کنگن فائل ہو گئے اور بتاؤ۔“

”اور کچھ نہیں بتانا۔ شش۔ اب خاموش ہو جائیں۔ آ رہی ہے آپ کی زوجہ۔ جو سن لی نا اس نے طیفے والی بات تو مار جوتوں کے فرش کر دے گی مجھے۔“

”تمہاری بولتی بھی اسی کے سامنے بند ہوتی ہے۔“

”بھاگ لگے رہیں اسے۔ سلامتی ہو اس کی۔ اللہ شان اونچی رکھے اس کی۔ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ بھئی تمہارے اندر کی میراثیں نہیں مرنی۔ جتنی مرضی کو شش کر لو تم ریفائن ہونے کی۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ میرا بچہ تمہا لوگی تو یہ جراثیم اس میں بھی ٹرانسفر کر دوگی۔“

”دیکھ لینا صاحب! جو ماں باپ سے زیادہ مجھ پر بڑے گا۔ دن رات تو میں ہی ساتھ ہوں آپ کی زوجہ کے۔“

”جب ہی مجھے ڈر ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی ”بھاگ لگے رہیں“ کے لرے نہ مارنے لگے۔“

”میراثیوں کی سنگت میں بیٹھنے والے میراثی نہ بنیں تو بھی میراثی پن آتی جاتا ہے ان میں بچ کر رہیے گا سرکار۔“

”بچ نہیں سکتا نا تمہارے تیرے کا شکار ہو چکا ہوں جب تک لے نہ لوں پھین نہیں آتا۔“

”شش، شش، شش۔ چپ۔ آ رہی ہے وہ سار نہ کھا لینا کہیں۔“

”میں اس پر بیٹھی معذرت خواہ ہوں انکل!“

”پوچھو گے نہیں کیوں؟“ انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”یقیناً“ اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی۔ ”ابراہیم نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ ان کی طرف دیکھنا چاہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس روز ان کے سامنے اگر ان پر نظر پڑتے ہی اسے فوری طور پر ایک ہی خیال آیا تھا۔ وہ ان چند دنوں میں ہی اچانک بوڑھے اور کمزور لگنے لگے تھے۔“

”شاید انہوں نے بال ڈائی نہیں کیے۔ یا شاید انہوں نے صحت مند خوراک لینا چھوڑ دی۔“ اس نے سوچا۔

لیکن نجانے کیوں اس پہلی بار کے بعد وہ ان پر دوبارہ نظر ڈال نہیں پایا۔ اسے لگا وہ جس بلال سلطان کو دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر وہ بلال سلطان اسے دکھائی نہیں دے رہے تھے تو وہ اس شخص کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی لڑکی ہے جسے وہ بہت چاہتا ہے۔“ وہ پوچھ رہے تھے اور وہ ایک ایسی بات پوچھ رہے تھے جو ابراہیم کے لیے غیر متوقع تھی۔

”میں آپ کو یہ بات کیسے بتانا انکل! جبکہ میں خود ایسی کوئی بات نہیں جانتا تھا۔“ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”غلط بیانی مت کرو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”کم از کم اب تو مت کرو اور اس لیے مت کرو کہ مجھے تم سے غلط بیانی کی امید نہیں ہے۔“

”میں بہت سوچوں۔ بہت یاد کروں۔ تب بھی مجھے یاد نہیں پڑا کہ اس کی زندگی میں ایسی کسی لڑکی کی موجودگی کے بارے میں میں نہیں جانتا ہوں۔“ ابراہیم کو ان کے لہجے کے یقین پر حیرت ہو رہی تھی۔

”جہاں سے آخری بار تم اسے لے کر آئے تھے وہاں اس کے علاوہ کون تھا۔“

”نہ۔“ ابراہیم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”ہاں! اب بھی کہو۔ تم نہیں جانتے تھے۔“

”اس نے اس وقت ایسی کوئی بات مانی نہیں تھی اس کا کہنا تھا وہ ان لوگوں سے یوں ہی واقف تھا۔“
 ”خیر! میں اس سے زیادہ اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔“ انہوں نے گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نکل! وہ بار سلونا میں ہے۔ اس نے تین دن پہلے وہاں ایک ٹورسٹ کمپنی سے رابطہ کیا ہے۔ شاید وہ کاروبار جانا چاہ رہا تھا۔“ ابراہیم نے تیزی سے کہا۔

”ہم اس کے پیچھے جاسکتے ہیں۔ آپ اجازت دیں۔ میں جاتا ہوں اس کے پیچھے۔ ہم ابھی اسی وقت اس کو ٹریس کر سکتے ہیں۔“

ابراہیم کے خاموش ہونے کے بعد کمرے میں سوئی گرنے کی آواز تک سنائی دینے جیسے خاموشی چھا گئی۔ ابراہیم کے کان ان کے جواب کے منتظر تھے۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اپنے ذہن میں ترتیب دیا کوئی ایسا منصوبہ سنانے والے تھے۔ جس کے ذریعے سعد کی پھرتیاں اور قرار ایک بار پھر دھرا کا دھراہ جانے والا تھا۔ وہ اس ان سے منصوبے پر دل ہی دل میں پر جوش بھی ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بلال سلطان کا ذہن کیسا پختہ منصوبہ بنانے کا اہل تھا۔
 ”نہیں۔“ اپنی توقع کے خلاف لفظ کان میں پڑنے پر اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ ان کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”نہیں۔“ ابراہیم سے نظریں چار ہونے پر انہوں نے وہی لفظ دہرایا۔
 ”کوئی بھی اس کے پیچھے جائے گا۔ نہ ہی اس سے رابطہ کرے گا۔ نہ ہی اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے گا۔“

”مم۔ مگر۔“ ابراہیم ان کی اس بات پر ششدر رہ گیا۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹھیک سے نکل نہیں پارے تھے۔

”لوگ چلے جاتے ہیں۔ ان کے چلے جانے سے زندگیاں رک نہیں جاتیں۔ زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے لیے کسی کا اس میں سے مٹتی ہو جانا کسی کا اس میں جمع ہو جانا معمول کی بات ہے۔“

”مم۔ مگر انکل۔ ہم لوگوں کی بات تو نہیں کر رہے۔ ہم سعد کی بات کر رہے ہیں۔“
 ابراہیم کے منہ سے الفاظ ابھی بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہے تھے۔ وہ شاک میں تھا۔

”میں بھی اسی کی بات کر رہا ہوں صاحب زاوے۔“ ان کے لہجے میں وہی یقین تھا جو ان کے لہجے کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

”لیکن وہ۔“ ابراہیم سٹپٹا گیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ آپ اس کے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔“
 ”میں سمجھتا تھا کہ تمام تر نظریاتی اختلافات کے باوجود وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اس نے ایسا کر لیا۔“ وہ

پیرورٹ میز پر رکھ کر اسے عور سے دیکھتے ہوئے اس پر انگلی پھیر رہے تھے۔
 ”اور یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ اور ظاہر ہے اپنی طرح سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا اس نے یہ فیصلہ۔“ ان کے

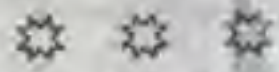
چہرے پر ایک بے بسی مسکراہٹ ابھری۔ ”اسے اس فیصلے پر عمل درآمد کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔“ انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

”مگر وہ غلط کر رہا ہے۔“ ابراہیم نے تیزی سے کہا۔ ”وہ کنویں میں چھلانگ لگانے جائے گا تو کیا آپ اور میں اسے لگانے دیں گے؟“

”اس کا کینوس کنویں سے بڑا ہے مائی ڈیر سن۔“ وہ اسی بے بسی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائے۔ ”اس کے سامنے سمندر ہے اور وہ خود کو ایک ماہر تیراک سمجھتا ہے۔ اسے اپنے بازو آزمانے دو۔“ انہوں نے یوں کہا جیسے

ختم کرنا چاہتے ہوں۔

ابراہیم جانتا تھا اس سے آگے وہ اس موضوع پر ایک بھی بات نہیں کریں گے، سو جواب میں انہیں صرف دکھائی رہ گیا۔ چند لمحوں بعد وہ انٹر کام اور فون پر اپنے کاروباری رابطوں کے ساتھ مصروف تھے۔



دو دن زادے، ایرانی النسل تھا، لیکن اس نے آنکھ امریکا میں کھولی تھی۔ انقلاب ایران کے زمانے میں اس کے دادا، وادی ترک وطن کے بعد پہلے ہالینڈ اور پھر امریکا کی ریاست نیویارک میں جا بسے تھے۔ دو دن زادے کے باپ نے اپنی ہی طرح ترک وطن کر کے نیویارک پہنچی ایک ایرانی خاندان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ایک نکتہ مشترک تھا۔ دونوں ہی خاندان شاہ کے وفادار تھے۔ شاہ کے ساتھ جلا وطنی میں کیا جاتی پیچھے وطن میں بیچ رہے خاندان کے ساتھ کیا گزری، دونوں ہی خاندانوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کی نئی دنیا پر کشش تھی اور وہ اس میں رہتے ہوئے آزاد زندگی کے مزے لے رہے تھے۔

دو دن زادے پیدا انکی امریکی تھا۔ اس کی زبان، رہن سہن، تہذیب، ثقافت سب امریکیوں کی سی تھی، مگر دو دن زادے اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنے دادا، وادی اور نانا سے مانوس تھا۔ ویک اینڈ ز اور لمبی تعطیلات کے دوران وہ اپنے دادا یا نانا کے پاس جا کر رہا کرتا تھا، جو اس وقت اس عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جب ترک وطن کر کے آئے لوگوں کو وطن کی یاد ستانے لگتی تھی۔ دادا اور نانا اس کو ”ہوم“ کی کہانیاں سناتے اور وہ ایک ان دیکھے وطن کی رونماں پرور کہانیوں کا اسیر ہوتا رہا۔ اس کے دادا کا انتقال اس وقت ہوا، جب وہ تیس برس کا تھا۔ دادا کو وطن کی یاد کے علاوہ ایک اور چیز بہت مرغوب تھی۔ وہ چیز ”سکی انگ“ (Skiing) کہلاتی تھی۔ دادا کا یہ شوق بھی دو دن زادے کو خصل ہوا۔ جس وقت دادا کا انتقال ہوا، وہ ایک انٹرا سٹیٹ سکی ڈائیونگ مقابلے میں شرکت کر رہا تھا۔ دادا کی آخری رسومات میں تو وہ شریک نہیں ہو سکا۔ لیکن اس نے وہ مقابلہ جیت کر اس جیت کو دادا کے نام معنون کرتے ہوئے انہیں ایک طرح کا خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

دادا کے جانے کے کچھ عرصہ بعد نانا اور وادی بھی دنیا سے چلی گئیں۔ دو دن کے ماں اور باپ میں شادی کے ستا میں برس بعد علیحدگی ہو گئی۔ دو دن اس کے دو بھائی اور ایک بہن ہالی اسکولز، کالجز سے نکل کر غم روزگار میں مصروف ہو گئے۔ دادا کا ”ہوم“ اور ”سکی ڈائیونگ کا خبط“ ایک خوب صورت خواب بنتے چلے گئے۔

دو دن کو ایک مقامی سافٹ ویئر کمپنی میں معمولی سی نوکری ملی۔ اپنی محنت پسند مزاج کی وجہ سے اگلے پانچ سالوں میں وہ اسی کمپنی میں ترقی کرنا کرتا ایک اچھے عہدے پر پہنچ گیا۔ زندگی میں ذرا سی سہولت آنے کے بعد اسے دادا کا

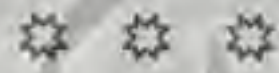
”ہوم“ کم ٹیلیکس ”سکی ڈائیونگ“ پھر سے یاد آنے لگے۔ کسی زمانے میں وہ ایک پیشہ ور سکی ڈائیونر بننا چاہتا تھا۔ مگر مالی مسائل نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔ جب مالی آسودگی آنے لگی تو اس کا وقت آگے جا چکا تھا۔ وہ مشق نہ

ہونے کے باعث مہارت کی حد سے باہر جا چکا تھا اور اب یہ جنون صرف شوق کی حد تک ہی پالا جاسکتا تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر سال موسم سرما میں کسی ایک ایسے ٹرپ کا اہتمام ضرور کرتا جس میں مختلف

یورپین ملکوں میں اسے سکی ڈائیونگ کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔ اس سال وہ اسی سلسلے میں انگلینڈ میں تھا اور اس بار ڈیڑھ سکی ڈائیونگ ایونٹ اس کے شوق کی منزل تھا۔ ڈیڑھ میں اس کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو دادا کے ”ہوم“ کے ہمسایہ ملک سے آیا تھا اور پہلی بار کسی سکی ڈائیونگ ایونٹ میں شامل ہو رہا تھا۔

”میں دو دن زادے ہوں نیویارک سے۔“ موٹیل میں ناشتے کی میبل پر بیٹھے اس نوجوان سے دو دن نے اپنا تعارف کرایا۔

”دو دن زادے اور نیو یارک۔“ جواب میں اس نوجوان نے ایک چمکتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
 ”دونوں ناموں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔“
 ”اس لیے کہ میرے آباؤ اجداد کا وطن ایران تھا۔“ دو دن زادے اس کی بات پر بلند آواز میں ہنستا ہوا بولا۔
 ”اوہ! خوشبوؤں اور پھولوں کا ملک ایران۔“ اس کے مخاطب نے بے اختیار کہا تھا۔
 ”ہو سکتا ہے۔“ دو دن نے شانے اچکائے۔ ”میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں وہ بہت کم ہے۔“
 ”لیکن میں اس کے بارے میں جو جانتا ہوں وہ کافی زیادہ ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ایران میرے وطن کا سرسبز ہے۔“
 ”میں پاکستان سے سعد سلطان ہوں۔“
 پاکستان اور سعد سلطان سے دو دن کا یہ پہلا تعارف تھا۔

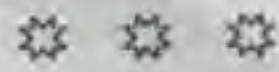


”میں ابھی یہاں کے سب ایسے انسٹی ٹیوٹ دیکھ رہی ہوں جہاں سے مجھے واقعی کچھ سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ابھی میں نے باقاعدہ کوئی انسٹی ٹیوٹ جوائن نہیں کیا ہے مگر۔“ ماہ نور کان سے فون لگائے فائزہ کو بتا رہی تھی۔
 ”نہیں! مجھے نہیں لگتا میرا یہاں قیام زیادہ لمبا رہے گا۔ جس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے میں یہاں آئی تھی وہ پراجیکٹ کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔ میں تو بس اب رہی کسی معلومات ہی حاصل کر رہی ہوں اس کے متعلق۔“ اس نے نیچی آواز میں کہا۔
 ”میں جانتی ہوں آپ کو میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہوگی۔ دراصل یہ ساری ٹیکنیکل باتیں ہیں۔ آپ کے واقعی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سمسٹر شروع ہونے سے پہلے آجاؤں گی۔ یہاں میں یہاں بہت مزے میں ہوں۔ ماما امریکا گئی ہوئی ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے فرقان ماموں نے مجھے ہر طرح کا کھانا دیا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی گاڑی انہوں نے مجھے دے دی ہے۔ تاکہ مجھے آنے جانے میں آسانی رہے۔ کھانا وانا سب ٹائم پر ملتا ہے۔ آپ فکر مت کیا کریں۔“
 اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابراہیم کے لیے ہوئے ٹائم پر اس کے جم میں پہنچ گئی تھی اور یہاں پہنچنے پر فائزہ کا فون آنے پر اسے ان سے تسلی بھری گفتگو کرنی پڑی تھی۔ سامنے سے آتے ابراہیم کو دیکھ کر اس نے فائزہ کو خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

”ہیلو! ابراہیم نے اس کے قریب آکر کہا۔ ”تم وقت کی خاصی پابند لگتی ہو۔“
 ”ہاں! شاید۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ وقت پھر بھی میرے ہاتھ نہیں آتا۔ آگے نکل جاتا ہے۔“

”چھا! ابراہیم کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ اس لیے وہ بس مروتی ہی میں ہنسنے لگا تھا۔
 ”آؤ! کوئی کولڈ ڈرنک جو وغیرہ لیتے ہیں۔ پھر چلتے ہیں۔“ وہ مین ہال سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں! کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس چلتے ہیں۔“ وہ بھاگتی ہوئی ٹریڈ مل پر نظر پڑی جہاں سے ہوتے ہوئے بولی۔
 ”یہ ٹریڈ مل جو تم دیکھ رہی ہو۔ یہ سعد کے لیے ریزرو تھی۔“ ابراہیم کو یاد آیا۔ ”وہ ہمیشہ اسے ہی استعمال کرتا تھا۔“

”چلیں؟“ ماہ نور نے اس کی بات سن کر دل کی تیز ہوتی دھڑکن کو نظر انداز کر کے کہا۔
 ”ہاں! چلو! چلتے ہیں۔“ ابراہیم اس سے آگے چلتا ہوا جم سے باہر نکل آیا۔



”اللہ اللہ بھائی کے۔ کان کانوں نائی کے۔“
 ”ہاں۔“ بھئی اپنے بچے کو ہلاتے ہلاتے نائی کے کان کیوں کاٹنے لگیں؟
 ”نائی کم بخت نے ہی تو سر کے پہلے بال اتارتے اتارتے لگتا ہے زخم لگا دیا ہمارے شہزادے کو۔ جب ہی روئے چلا جا رہا ہے۔“
 ”نہیں! جب سے تم نے اسے گود میں لیا ہے تب سے روئے چلا جا رہا ہے۔“
 ”پھر تو نائی کے نہیں میرائی کے کان کٹنے چاہئیں۔“
 ”زالو! زانداق تم دونوں میرا تھوں کا۔ ایک دن دیکھنا! یہ میرائی ہی ہوں گے تمہاری طرف بڑھتے وار اپنے بننے پر لینے والے۔“

”نسن لو۔ بہادری اور وفا داری کے دعوے کر رہی ہیں محترمہ۔“
 ”اس کی باتیں رہنے دیں۔ اسے اپنے علاوہ ساری دنیا کم بخت ہی لگتی ہے۔ ہر وقت مولوانوں کے بے چارے لعلے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ وہ کم بخت نائی کم بخت دکان والے کم بخت، مہترائی کم بخت اللہ جانے کوئی بلند بخت بھی ہے اس کے نزدیک کہ نہیں۔“
 ”ہے کیوں نہیں بلند بخت۔ ہمارا یہ شہزادہ ہے نابند بخت۔ اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ اس کی شان اونچی کرے۔“

”جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے اٹھائے اٹھائے پھرتی رہتی ہو۔ اسے گود کی عادت ہو گئی نا تو بستر پر ڈالنا دشوار ہو جائے گا۔“

”چھا! ابھی تو اسے مجھے دے دو۔ میں دو گھنٹی اٹھالوں گود میں۔ پھر میرے جانے کا ٹائم ہو جائے گا۔“
 ”یہ لیں بھئی عجیب والد پائے ہیں ہمارے شہزادے نے۔ بے چارہ دنیا میں جس وقت آیا ابا اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے کان میں اذان دینے کی سعادت بھی اس جیٹی پہلوان سراج سرفراز کو ہی ملنی تھی۔“
 ”ابا موجود ہوتے۔ ضرور موجود ہوتے۔ تم ہی نے بھگایا تھا اسی شام طہلے لاڑکی سناؤ نیاں سنا کر۔“
 ”ہاں تو ٹھیک ہی کیا تھا نا۔ خود اپنی آنکھوں سے اسے منگا لیجئے۔ بڑھکیں مارتے سنا تھا۔“
 ”میں نہیں گیا پھر وہ کسی کی گردن کاٹنے۔ تم خواجہ خواہ ہی میرے محسوم سے شوہر کو یہاں سے بھگانے کے چکر میں رہتی ہو۔“

”احتیاط لازم ہے بیگم صاحبہ۔“ اور آپ نے نویلے ابا جان! صرف باتوں پر نہ ٹرخائیے، روکڑا نکال لے، دکان میں بوندی کے لٹو منگواؤں شیریں محل سے منہ توڑٹھا کر لیتے۔ نکلن کی بات بعد میں کروں گی۔“
 ”ہاں! ہاں! جتنے چاہے لٹو کھاؤ۔ یہ لو پیسے۔ اب بتاؤ بھلا لٹو منگوانے کے لیے سراج سرفراز کے سوا کوئی دوسرا ہے تمہارے پاس؟“

”اتنا پیسہ نہیں کرے گا تو صبح سے شام بڑا چارپائی ہی توڑے گا کیا؟ چلیں جی! میں چلی لٹو منگوانے۔ تم دونوں کال ٹی بی محبت، اخلاص کی باتیں کر لو چند گھنٹیاں۔ اور میرا شہزادہ مجھے دے دو۔“ اس نے اسے لینے کے لیے اٹھ بڑھائے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



مکمل ٹافل

۱۲۔ چودھویں قسط

اور پھر نہایت یکسوئی سے نماز پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی کاریٹ پر بیٹھا رہا۔
کیا دعا مانگے؟ امی ابو سے ملاقات کی دعا۔ جو اس دنیا میں نہیں۔ اپنے گناہوں کی معافی۔ لیکن کیا اللہ اسے معاف کر دے گا۔ اس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اپنے والدین کا دل دکھایا۔
اس نے ہاتھ اٹھائے۔
”یا اللہ! مجھے معاف کر دے ان غلطیوں پر جو مجھ سے جانے انجانے میں سرزد ہوئیں اور ان ملعونوں کو تباہ و برباد کر دے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔“

”اور کون ہے جسے ہدایت دے۔ سوائے اللہ کے۔“
اس کے کانوں میں آواز آئی تو دل ہی دل میں اس نے کہا۔ ”ہاں! اللہ۔“
”اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کو ہدایت دیتا ہے اور ہاتھ پکڑ کر اٹھالیتا ہے۔ اس وقت جب وہ گمراہی کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں۔“
”تو کیا اللہ مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر اس گڑھ سے نکال لے گا جس میں میں میں گر گیا ہوں؟“
اس نے سوچا اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ لیکن اس نے پلکیں جھپک کر اس نمی کو باہر نکلنے سے روکا اور نیت کرنے لگا۔



نگہت سیما

دیکھ کر لکھو

سے پوری نمازیں پڑھے گا۔ لیکن پھر سستی ہو جائی تھی۔
اس نے پھر نیت کے لیے ہاتھ اٹھائے اور یونہی چند لمحے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔
”اور کیا میں ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔“
اس نے ہاتھ پھر نیچے گرادیے۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھا لیے۔

کچھ دیر یوں ہی متذبذب سا کھڑا رہا۔
”دوست! دو فرض۔“
وہ دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔
اسے یاد تھا۔ پانچ سال کوئی زیادہ لمبا عرصہ تو نہیں ہوا۔ پانچ سال پہلے وہ پوری پانچ تو نہیں۔ لیکن تین نمازیں تو باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور جو رہ جاتیں ان کے لیے شرمندہ ہوتا رہتا تھا اور ہر روز عہد کرتا تھا کہ کل

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو جو رخساروں سے پھسل کر ہونٹوں پر لچھ بھر نکلنے کے بعد ٹھوڑی سے ہوتے اس کی گردن کو بھگور رہے تھے۔
”یا اللہ! وہ انگلیاں مفلوج ہو جائیں۔ جنہوں نے وہ خاکے بنائے تھے۔“

اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی اور دعا کے لفظ اندر ہی کہیں چکر اکر رہ گئے۔
اس نے ایک دم ہاتھ نیچے گرا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں نہ دعا مانگنے کے قابل ہوں نہ معافی کے۔ پھر کیوں ہاتھ اٹھائے بیٹھا ہوں۔“

کچھ دیر وہ مضطرب سا دھڑلہ دار تھا۔ پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔ شاید اس طرح اندر کی بے چینی ختم ہو جائے اور دھیان بٹ جائے ٹی وی پر سحری کے پروگرام چل رہے تھے۔ ایک قاری صاحب سورۃ النساء کی تلاوت کر رہے تھے۔ چند آیات پڑھ کر انہوں نے ترجمہ کیا۔

”اور جو شخص کوئی برا کلم کر بیٹھے یا پھر اپنے حق میں ظلم کر لے اور پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشے والا اور مہربان پائے گا۔“

”بے شک۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”لیکن میں۔ میں نے تو۔“

اس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت میں پینل بدل رہا تھا۔

”دیکھو! شیطان کا کمانہ ماننا۔“ ایک مولوی صاحب کہہ رہے تھے۔

”وہ تمہیں تنگ دہشتی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔ اور اللہ نے تم سے بخشش اور رحمت کا وعدہ کیا ہے، اس مبارک مہینے میں۔“

اس نے غیر ارادی طور پر ریموٹ پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔

”در قبولت ہر اس کے لیے کھل جاتا ہے جو سچے

دل سے توبہ کرتا ہے۔“

”کیا میرے لیے بھی؟ میں جو مرتدوں کا ساتھی ہوں۔ کیا میری توبہ بھی قبول ہوگی۔“

”سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 268 میں ہے اور اللہ بیشک کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“

”اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ میری توبہ ضرور قبول کر لے گا۔“

دل میں امید کی لوچ مچی تو وہ پھر اٹھا اور زمین پر روزالہ بیٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیے۔

”یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ توحید اور شرک کے بیچ مجھ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، معاف کر دے۔“

آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے اور وہ بہت جذب سے دعا مانگ رہا تھا۔

”اے اللہ! توبہ مست رحیم و کریم ہے۔ مجھ پر بھی رحم کر۔ مجھ پر ترس کھا۔ مجھے معاف کر دے۔ میری گناہ بہت زیادہ ہیں۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو برف کے پانی سے اور اولوں سے دھو دے اور میرے دل کو گناہوں سے پاک کر دے۔ جیسے میلا کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ یا اللہ! مجھ پر ترس کھا۔ مجھ پر رحم کر۔ مجھے معاف کر دے۔“

اب وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے حلق سے ایک ہی جملہ نکل رہا تھا۔

”یا اللہ! مجھ پر رحم کر۔ مجھے معاف کر دے۔“

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہاتھ نیچے گر گئے اور سر سجدے میں جھک گیا۔

”رب اغفر لی۔ ربی اغفر لی۔“

اس کی زبان پر ایک ہی تکرار تھی۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر تک وہ یوں ہی سر سجدے میں رکھے رہتا رہا۔ معافی مانگتا رہا۔ پھر اسے لگا جیسے اس کے حلق میں کانٹے پھنس گئے ہوں۔ سر میں جسم کا سارا خون اکٹھا ہو رہا ہو۔ اس نے سجدے سے سر اٹھالیا۔ اٹھا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ رات بھر وہ بہت

چین رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خود کو پرسکون محسوس

کرتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمیرا کے حلق سوچنے لگا۔

”پتا نہیں ابونے اس کی شاہی اتنی جلدی کیوں کر دی۔ اسے تو ڈاکٹر بننا تھا۔ ڈاکٹر سمیرا رضی۔“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن بند آنکھوں میں نمی پھیلتی گئی۔

اور اسے بھی تو اچھینتر بننا تھا۔ وہ یوں ہی سوچتے بیٹھے سو گیا۔ پھر اس کی آنکھ صبح گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی۔ وہ تیار ہو کر رات کے لکھے ہوئے صفحات لے کر باہر نکلا تو ثمنہ حیدر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”سراپائے میں کیا لیں گے۔“

”کچھ نہیں۔ میرا روزہ ہے۔“

اس نے ثمنہ حیدر اور ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کی آنکھوں میں حیرت کو بہت واضح طور پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اور گاڑی کی چابی لے کر باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ثمنہ حیدر کو بتا دیا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر جا رہا ہے اور وہاں سے جنید کی طرف چلا جائے گا۔ اگر وہ نہ پاتا تو ثمنہ حیدر خود پوچھ لیتی۔ اب تو اسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے ثمنہ حیدر کو بتا دیتا تھا۔ اپنا آرٹیکل میل کرنے کے بجائے اس نے خود لے کر جانا مناسب سمجھا تھا۔ اخبار کے دفتر سے وہ جنید کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ جتناہ عصر کے بعد ہے اور جنید چند عزمیوں کے ساتھ میت وصول کرنے ایئر پورٹ گیا ہوا ہے۔ جنید آیا تو جنازے

کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ جنید نے دو تین بار اسے منظر نظروں سے دیکھا تھا۔ گھر کے اندر کھرام چا

قلم پتا نہیں جنید کی فیملی میں کون کون تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ جنید نے صرف اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا تھا جو بیسہ کمانے کا خواب لے کر گھر سے نکلا تھا۔

البتہ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور وہ جیل چلا گیا۔ یہ انسانوں کے اسمگلر نہ جانے کتنے گھروں کے مال گھل کر چکے تھے اور کتنے لوگ جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے اور ایک دن جنید کے بھائی کی طرح وہیں

رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمیرا کے حلق سوچنے لگا۔

”پتا نہیں ابونے اس کی شاہی اتنی جلدی کیوں کر دی۔ اسے تو ڈاکٹر بننا تھا۔ ڈاکٹر سمیرا رضی۔“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن بند آنکھوں میں نمی پھیلتی گئی۔

اور اسے بھی تو اچھینتر بننا تھا۔ وہ یوں ہی سوچتے بیٹھے سو گیا۔ پھر اس کی آنکھ صبح گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی۔ وہ تیار ہو کر رات کے لکھے ہوئے صفحات لے کر باہر نکلا تو ثمنہ حیدر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”سراپائے میں کیا لیں گے۔“

”کچھ نہیں۔ میرا روزہ ہے۔“

اس نے ثمنہ حیدر اور ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کی آنکھوں میں حیرت کو بہت واضح طور پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اور گاڑی کی چابی لے کر باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ثمنہ حیدر کو بتا دیا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر جا رہا ہے اور وہاں سے جنید کی طرف چلا جائے گا۔ اگر وہ نہ پاتا تو ثمنہ حیدر خود پوچھ لیتی۔ اب تو اسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے ثمنہ حیدر کو بتا دیتا تھا۔ اپنا آرٹیکل میل کرنے کے بجائے اس نے خود لے کر جانا مناسب سمجھا تھا۔ اخبار کے دفتر سے وہ جنید کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ جتناہ عصر کے بعد ہے اور جنید چند عزمیوں کے ساتھ میت وصول کرنے ایئر پورٹ گیا ہوا ہے۔ جنید آیا تو جنازے

زندگی بار بیٹھیں گے۔ اس نے کتنی تکالیف اٹھائیں۔ کیسے گرفتار ہوا۔ اس پر کیا جاتی۔ وہ دل میں ہی لے کر چلا گیا تھا۔ اور یہ جنید علی یہ بھی شاید ایسا ہی کوئی خواب لے کر ان لوگوں کے جال میں پھنسا تھا۔

اپنے گھر والوں کو خوش حال دیکھنے کا خواب۔ لیکن اس کا تو ایسا کوئی خواب نہیں تھا۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ حسن رضائے کبھی کوئی تنگی نہیں ہونے دی تھی۔ اس کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا۔ پھر وہ کیوں ان کے جال میں پھنسا۔ مزید کی طمع۔ لالچ۔ ہوس۔

جنازے کے بعد افطاری کا انتظار کیا جا رہا تھا اور یہ سب انتظام آس پاس کے گھروں کے لڑکے کر رہے تھے۔ بزرگ بدایات دے رہے تھے۔ جانے والوں کو روک رہے تھے۔

”بھی اس ملک میں پاس محبت اور مروت باقی ہے۔“

اس نے سوچا اور معذرت کر کے گھر آ گیا۔ وہ بے حد محکمان محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے روزہ افطار کر کے وہ مغرب کی نماز کے لیے کھڑا ہوا تو جی چاہ رہا تھا نماز نہ پڑھے اور سو جائے۔ اس کے کانوں میں جنید کے گھر کی عورتوں کے رونے کی اور بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے فجر پڑھی تھی۔ لیکن پھر ظہر نہیں پڑھ سکا تھا اور پہلے کی طرح دل میں کتا رہا تھا۔ ”کل ضرور پڑھوں گا۔ آج نہیں پڑھ سکا تو کل ضرور۔“

عصر کی نماز جنید علی کے گھر کی قرسی مسجد میں سب لوگوں کے ساتھ پڑھی تھی۔ لیکن میکا کی انداز میں وہ ہاتھ اٹھاتا رکوع اور سجدے میں جاتا رہا تھا۔ مغرب کی نماز بھی اس نے اسی انداز میں پڑھی اور پھر بیڈ پر گر گیا۔ محکمان سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ تیل کی آواز سے کھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے کلاک پر نظر ڈالی دس بج رہے تھے۔

”او۔“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سونے سے پہلے وہ

229

228

229

228

229

228

229

228

229

پتا نہیں کب کا پڑھا ہوا جملہ اس کی زبان پر آیا۔
"مجھے بھی مر جانا چاہیے تھا اس وقت۔ جب میں
رجی سے وہ بریف کیس کے رہا تھا۔ اس وقت جب
اس نے مجھے ایس۔ ڈیپو کی چابیاں دی تھیں۔ یا پھر
اس وقت جب الونٹا کی قبر کی خواہش میرے اندر
جوش مارتی تھی اور میرا دل کسی آگ پر چڑھی ہانڈی کی
طرح ابلتا تھا۔ اس وقت جب میں نے مزید کی چاہ
کی۔" پھر اسے برائے وقت یاد آیا۔
"وہ سب کتنا قیمتی تھا۔ کتنا انمول۔ وہ چھوٹی چھوٹی
سنی منی خوشیاں۔ وہ خوبصورت لمحے۔ وہ ان سب
سے زیادہ قیمتی تھے۔"
اس نے ایک بار پھر زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو
حقارت سے دیکھا۔
اس کا سبیل فون پتا نہیں کب سے بچ رہا تھا۔ اس
نے بیڈ پر پڑا ہوا فون اٹھایا۔ دوسری طرف جنید علی تھا
"وہ اسے بدایات دے رہا تھا۔
آئندہ کوئی بھی کالم کوئی بھی آرٹیکل چھپوانے سے
پہلے وہ اسے چیک کرنے کے لیے دے گا۔
اس نے حیرت سے جنید علی کی بات سنی۔
یہ جنید علی تھا جو رات بھائی کے غم میں غڈھال
تھا۔
جس نے برسوں بھائی کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔ وہ
واپس آیا۔ لیکن تابوت میں بند اور وہ کبھی جان نہیں
سکے گا کہ اس کے بھائی پر کیا جاتی۔ کیا ایک ہی رات میں
اس کا غم ختم ہو گیا۔ نہیں ابھی تو اس کے بھائی کی قبر کی
منی بھی خشک نہیں ہوئی ہوگی۔
"لیکن ارباب حیدر کتنا ہے۔ ہم صرف ملازم
ہیں۔ اور جنید علی نے بھی میری طرح اپنی روح ان
کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ ان سے یہ نہیں کہہ
سکتا۔ ابھی رات ہی تو اس نے برسوں سے پھٹنے
بھائی کو دفنایا ہے۔ ابھی تو۔ لیکن شاید ہم کبھی آزاد
نہیں ہوں گے۔" مایوسی نے اس کے دل میں پچنے

پھر اس نے وارڈروب کھولا۔
یہ جارج اربانی کے گلاسز۔ "وائس طرف لگے
گلاسز پھینکنے کے بعد کپڑوں کی باری آئی تھی۔ یہ
شرٹ Gucci کی۔ یہ رالف لورین کے
ڈریسز۔" وہ ہینگر اتارتا ایک ایک کپڑے کو دیکھتا
اور اچھال کر پھینک دیتا۔
"ان کے لیے۔ ان کے لیے کیا میں نے سب۔
یہ سب میری خواہش تھی۔ من میں چھپی خواہش۔
اور ان حقیر چیزوں کے لیے میں نے انہیں چھوڑ دیا۔
جو میرے تھے۔ میرے اپنے۔ اور مرد کھلوانا پسند
کیا۔ میں نے سوچا کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر کوئی مجھے مرد
سمجھ رہا ہے میں مرد ہوں تو نہیں۔ میں پورے دل و
جان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی آخری نبی
مانتا ہوں۔" اس نے سر جھٹکا۔
"لیکن فرق پڑتا تھا۔ بہت فرق پڑتا تھا۔۔۔ لیکن
میں نہیں سمجھتا تھا۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکا اور ان
حقیر چیزوں پر خوش ہوتا رہا۔"
اس نے پاؤں سے سامنے پڑے جوتے کو ٹھوکر
ماری۔
"کیا میرے پاس جوتے نہیں تھے؟ کیا میرے پاس
گھڑی نہیں تھی؟ کیا میں لباس سے محروم تھا۔ پھر گھڑی
میرے اندر ان برانڈڈ کپڑوں کی ہوس تھی۔ گھڑی میں
چھپی ہوئی؟"
وہ پھر وارڈروب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور باقی ماندہ
کپڑے نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ تب ہی دروازے
پر دستک ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شرٹ کو
حقارت سے دیکھا اور نیچے پھینک کر ذرا سا دروازہ
کھولا۔ باہر شینہ حیدر تھی۔ جس نے ادھ کھلے
دروازے سے زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو حیرت سے
دیکھا۔
"مجھے ناشتا نہیں کرنا۔"
احمد رضا نے اس کی بات سنے بغیر کہا اور دروازہ بند
کر دیا۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر بکھری ہوئی چیزوں
کو دیکھنے لگا۔

اسے سمجھا رہی تھی۔
وہ خاموشی سے سن رہا تھا کہ ارباب حیدر نے الونٹا
سے فون لے لیا۔
"الونٹا صحیح کہہ رہی ہے۔ تمہیں ہلکا سا کلمہ
چاہیے تھا۔ جیسے کئی اور کالم نگاروں نے لکھا ہے
لیکن تم نے تو یوں لکھا۔ جیسے تم نے ہاتھ میں قلم
بجائے بندوق تھام رکھی ہے۔ رجی اور چیف۔
ناراض ہوں گے۔ تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔"
"تم تو مسلمان ہو ارباب حیدر! تم بھی کہہ رہے
ہو؟"
احمد رضا نے آہستگی سے کہا تو ایک لمحہ کے لیے
ارباب حیدر خاموش ہو گیا اور پھر سمجھانے کے لیے
انداز میں بولا۔
"میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ایک
ایمپلائی (ملازم) ہوں اور مجھے وہ ہی کرنا ہے جو
میرے پاس کا حکم ہے اور تمہیں بھی وہ ہی کرنا ہے جو
تمہارے پاس چاہتے ہیں۔"
وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ ارباب حیدر نے بات
ختم کر کے فون رکھ دیا۔ مگر وہ کتنی ہی دیر تک ریسور
ہاتھ میں پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔
"میں نے بھی اپنی روح شیطان کے پاس گروی رکھ
دی ہے اور میں غلام ہوں ان کا۔ کس لیے۔ کس لیے
کیا میں نے۔ کس کے لیے؟"
"یہ۔ اس نے ہاتھ میں بندھی گھڑی کو حقارت سے
دیکھا۔
"یہ کہہ جی ڈار کی۔" اور اسے اتار کر نیچے
پھینکا۔
"یہ مونٹ بلیک کا والٹ۔" اس نے تکیے کے
پاس پڑا والٹ اٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینکا۔
"یہ جارج اربانی اور پلے بوائے لومانی کے پرفیومنز۔"
اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ایک پرفیوم کی
شینٹ اٹھاتا اور ایک ایک کر کے انہیں پھینکنا جاری
تھا۔ "یہ جوتے۔ یہ سینٹ مارٹین کے" کب وہ جوتوں
کے ریک کے پاس کھڑا تھا اور اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔

عہد کر رہا تھا کہ اب کوئی نماز مس نہیں کرے گا۔
لیکن پھر عشاء وہ گئی اور اب فجر بھی۔
ٹیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر
سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف
الونٹا تھی اور بہت غصے میں بول رہی تھی۔
"یہ کیا لکھا ہے تم نے! حق آدمی! کیا تمہیں فری
ہینڈ اس لیے دیا تھا کہ تم۔ ہمارا خیال تھا کہ تم پوری
طرح ہمارے سانچے میں ڈھل چکے ہو۔ لیکن تم تو اندر
سے وہ ہی ہو و قیانوسی خیالات کے مالک۔ اپنے باپ
کی طرح۔ رویت پسند! حق! بے وقوف۔"
احمد رضا حیران سا اس کی بات سن رہا تھا۔ لیکن
سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
"تم نے ان کی شخصی آزادی پر حملہ کیا ہے۔ ان
کا رائٹ تھا احمد رضا! ہر شخص کو دوسروں کے متعلق
آزادی رائے کا حق ہے۔"
"وہ دوسرے نہیں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جن کی سیرت طیبہ پر کوئی انگلی
نہیں اٹھا سکتا۔"
احمد رضا کو بہت دیر بعد اس کی بات سمجھ میں آئی
تھی۔ لیکن الونٹا نے اس کی بات سنی نہیں وہ بدستور
اس پر چلا رہی تھی۔ الونٹا جو چند دن پہلے اس سے محبت
کا دعوا کر رہی تھی اور ابھی تین دن پہلے کی ہی بات تھی
رات کو اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے الونٹا کی
مہربانیوں کو یاد کرتے ہوئے سوچا تھا۔ الونٹا اس کی زندگی
میں آنے والی پہلی عورت ہے۔ اگر وہ اس سے محبت
کرتی ہے اور اس نے واقعی طلاق لے لی ہے تو پھر وہ
کیوں نہ اس سے ہی شادی کر لے۔
"ٹھیک ہے ابیہ آج کا ایٹھ ہے۔ تمہیں اس پر
ضرور لکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ ان میں شامل رہو۔" الونٹا
کہہ رہی تھی۔
"یہود و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں
ہو سکتے" وہ سوچ رہا تھا۔
"تمہیں اتنے جارحانہ انداز میں نہیں لکھنا
چاہیے تھا۔ بلکہ ہلکے ہاتھ سے۔ لائٹ سا۔" اب وہ

گاڑے۔ "ہماری روحیں ہمیشہ کے لئے ان کی غلام ہوئیں۔"

"ایسا کیا لکھ دیا ہے تم نے جس پر سب اتنے خفا ہیں؟ طیب خان کا بھی فون آیا تھا بہت بول رہا تھا۔ جنید علی پوچھ رہا تھا۔"

اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے ریسور کو دکھا۔ "میں نے وہ لکھا ہے جنید علی! جو ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ جب میں نے ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا تو مجھ سے میرے مسلمان ہونے کا اعزاز چھن گیا۔ خیر! تم اسے چھوڑو مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔ کیا تم میرے والدین۔"

"سوری احمد رضا! حیدر علی نے اس کی بات کالی اور شرمندگی سے کہا۔ "میں پتا نہیں کروا سکا تھا۔ دراصل رچی کو نہ جانے کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں تمہارے والدین کے متعلق پتا کروا رہا ہوں۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور میں رچی کی حکم عدو کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو نا۔"

"تو تم نے رچی کو نہیں بتایا کہ وہ۔۔۔" احمد رضا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ مایوسی کے اندھیرے میں ایک دم امید کی کرن چمکی تھی۔

"اوکے جنید علی! میں اب کچھ بھی تمہیں دکھا بغیر نہیں چھوڑاؤں گا۔" اس نے بات مکمل کرتے ہی فون بند کر دیا۔

"تو رچی نے میرے ساتھ جھوٹ بولا۔ بالکل ایسا ہی جھوٹ جیسا میری موت کی خبر چھپوا کر بولا تھا۔ میں خود تلاشوں گا انہیں۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ مجھے ان سے ملا دے اور اللہ ضرور میری دعا سنے گا۔ مجھے ایک بار پھر سمن آباد جانا چاہیے۔ کیا پتا ان پانچ سالوں میں ابو وہاں کسی سے ملے آئے ہوں اور انہیں اپنی موجودہ رہائش کے متعلق بتایا ہو۔ اور پھر قاضی صاحب اور ملک صاحب کی بیٹیاں بھی تو سمیرا کی مسہیلیاں تھیں۔ کیا خبر سمیرا کا ان سے رابطہ ہو۔ کمال ہے مجھے پہلے کیوں اس کا خیال نہیں آیا۔"

وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس رات کے لباس میں۔ اس کی گھڑی اور والٹ لپوں ہی کمرے کے وسط میں پڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی پہلی بھی نہیں لی تھی۔ اس کے پاؤں میں سلیپر تھے۔ حیدر نے اسے اندرونی گیٹ کھول کر بہت حیرت سے باہر جاتے دیکھا اور موبائل پر تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

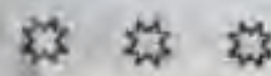
وہ گیٹ سے نکل کر بے دھیانی میں چلنے لگا تھا۔ اسے سمن آباد جانا تھا اس کا والٹ کمرے میں رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔

"Die When Life Demands Too Much"

اس کے کانوں میں کوئی مسلسل کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ چل رہا تھا وہاں سے پیدل سمن آباد نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن وہ چلا جا رہا تھا۔

"احمد رضا۔ احمد رضا۔ احمد رضا کو پلیز۔" کسی نے اسے پکارا تو وہ چونک کر رک گیا اور سڑک دیکھا۔ احمد رضا کو اسے پہچاننے میں چند لمحے لگے تھے وہ ابراہیم تھا۔

"ابراہیم! اس کے لبوں سے نکلا اور وہ اسے قریب آتے دیکھنے لگا۔



رائیل دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔ کل ماہرہ نے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد وہ گھٹنوں روٹی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ماہرہ نے ایسا کہا۔ بھلا ماما ایسے کیسے کہہ سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کہا تھا اور صرف اس کی ہی نہیں ایک کی بھی توہین کی تھی۔ حفصہ مرثیہ منیبہ سب ہی ایک سے بے تکلفی سے بات کرتی تھیں۔ لیکن کبھی ناچچی مسما یا راحت چچی نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ماہرہ ایک سے رات بات کر کے اگرچہ وہ کچھ مطمئن

ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکتی تھی۔ بار بار اسے خیال آتا کہ "ایک کیا سوچتا ہو گا کہ کیسی لڑکی ہوں میں کہ میری ماں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے کہ ایک کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر وہ بھڑک اٹھیں۔"

پھر خود ہی خود کو تسلی دیتی۔ "میں! ایک ایسا نہیں ہے۔ ایسی سطحی سوچ رکھنے والا۔ وہ اس کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ ماما کو اس سے انکل اور عمارہ پچھو سے چڑ ہے۔"

وہ رات کھانے کے لیے بھی نیچے نہیں آئی۔ عمر اسے بلانے آیا اور اسے بری طرح روٹا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ تب اس کے بار بار پوچھنے پر وہ ضبط نہ کر سکی اور اسے سب کچھ بتا دیا۔

عمر خود بھی شاکد رہ گیا کیونکہ وہ اس گھر میں ایک کا سب سے بڑا قدر دان تھا۔

"ماما نے ایسا کیوں کیا رانی آپ! ایک بھائی ایسے نہیں ہیں۔" وہ روہنا سا ہو گیا تھا۔

"یہ تو تم جا کر ماما سے ہی پوچھو۔" اس نے کہا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور وہ شاید ماما سے ناراض بھی ہوا تھا۔ لڑا بھی تھا۔ لیکن ماہرہ کا موقف ایک ہی تھا کہ اس نے کچھ غلط نہیں کیا اور یہ بات عمر نے ہی اسے بتائی تھی۔ عمر کے بے حد اصرار پر بھی رات وہ کھانے کے لیے نیچے نہیں گئی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مولیٰ اور رینا نے بھی تو سنا ہو گا۔ مولیٰ تو کچن میں ہی تھی اور ماما اتنے زور زور سے بول رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تب ہی ماہرہ دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ رائیل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ ماہرہ اس کے پیڑ پر ہی بیٹھ گئیں۔

"تم ناشتے کے لیے نہیں آئیں۔ رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا۔ تم ٹھیک تو ہونا؟"

رائیل نے ماہرہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور یونہی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیڈ شیٹ کو دیکھتی رہی۔ "میں نے جو کچھ بھی کہا۔ تمہارے بھلے کے لیے

ہی کہا تھا رانی۔"

ماہرہ کا لہجہ نرم تھا۔

"میرے بھلے کے لیے" رائیل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "نہیں ماما! میری انسلٹ کے لیے۔" اس کی آنکھیں نم تھیں۔ ماہرہ نے تڑپ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"میں تمہاری ماں ہوں۔ دشمن نہیں ہوں رانی میں تمہاری انسلٹ کیوں کرنا چاہوں گی؟ تم جانتی ہو میں تم سے عمر اور زبیر سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ شادی کے کتنے سالوں بعد تم پیدا ہوئی تھیں۔ تم میری دعاؤں کا حاصل ہو۔ میں تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتی رانی!"

"نہیں! آپ نے بہت غلط کیا ماما۔ بہت برا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "وہ کوئی غیر نہیں تھا۔ دشمن نہیں تھا۔ عمارہ پچھو کا بیٹا تھا ماما! جیسے ہمدان ہے۔ جیسے عادل ہے۔ اگر میں نے اس سے بات کر لی تھی تو کیا حرج تھا! اس کی آواز بھرا گئی۔ "دشمن ہی تو ہے۔" وہ آہستہ سے بڑبڑاتی تھیں لیکن رائیل نے سن لیا۔

"کیا صرف اس لیے کہ وہ عمارہ پچھو کا یعنی آپ کی نند کا بیٹا ہے۔ ماما آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ پھر آپ کیوں روایتی نند بھانج کا جلا پاول میں لیے بیٹھی ہیں۔ اور پھر عمارہ پچھو تو اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں۔ وہ "لربیان" نہیں آئیں۔ پھر بھی۔؟"

"ہاں! پھر بھی۔ میں وہ سب کچھ نہیں بھول سکتی جو تمہاری عمارہ پچھو نے میرے ساتھ کیا۔ میں روایتی بھابھی نہیں تھی۔ لیکن وہ روایتی نند تھی۔ جتنا عرصہ بھی وہ یہاں رہی۔ اس نے مجھے بہت زچ کیا۔" "مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ دونوں تو اتنے شفیق اور محبت کرنے والے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے پچھو پاپا کی محبت کو تقسیم ہوتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پاپا سے سب بھائیوں سے زیادہ قریب تھیں۔" رائیل نے ہاتھوں کی پشت سے

اپنی میلی آنکھیں صاف کیں۔

”مما! آپ وہ سب کچھ بھول نہیں سکتیں جو عمارہ پھپھو نے آپ کے ساتھ کیا؟“

”نہیں۔“ ماڑہ کا لہجہ سخت تھا۔ رائیل نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”اب غصہ تھوک دو میری جان! اٹھو منہ ہاتھ دھولو۔ میں شمو سے کہتی ہوں۔ وہ تمہارا ناشتا اور یہی لے آئے۔“ ماڑہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

”ماما مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے اس طرح غصے سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ لیکن ایک کو تم سے بات کرتے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا نا ایک سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں؟“

”آخر اس میں برائی کیا ہے؟“ رائیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”یقیناً اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن اس کا باپ۔۔۔ وہ کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ اور میں۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے رابی کہ بیٹا بھی کہیں باپ جیسا نہ ہو۔“

”لیکن ممما! رائیل کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”بس! اب اور کچھ نہیں۔ یہاں ۳ لڑیاں“ میں سب لوگ اسے صرف عمارہ کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں۔ ورنہ جیسا اس کا کریکڑ تھا۔ کوئی اسے ۴ لڑیاں“ میں گھسنے ہی نہ دیتا۔“

”پھر بابا جان نے پھپھو کی شادی ان سے کیوں کی ممما؟“ رائیل کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

”یہ سب۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کے کردار کے متعلق شادی کے بعد پتا چلتا تھا۔ اب اٹھو شاباش۔“ رائیل نے پاؤں بیڈ سے نیچے رکھے۔

”اور ہاں! آئندہ میں تمہیں ایک سے بات کرتے نہ دیکھوں۔ وہ اتنا ڈھیٹ ہے کہ اس بے عزتی کے بعد

بھی ضرور بابا جان سے ملنے کے بہانے ۵ لڑیاں“ میں آتا رہے گا۔ تم خود ہی محتاط رہنا۔“ رائیل نے پھر پاؤں اوپر کر لیے۔

”مما پلیز! آپ جائیں۔ رات مجھے ٹھیک سے نہیں آئی تھی۔ میں کچھ دیر سوؤں گی۔ اٹھوں گی تو پتا کر لوں گی اور پلیز آئندہ مجھے ایک سے بات کرنے سے مت روکیے گا۔“

”کیوں نہ روکوں؟“ ماڑہ کو غصہ آیا۔ لیکن اس نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ ”ماں ہوں میں تمہاری اور تمہیں برے بھلے کی پہچان سمجھانا میرا فرض ہے۔“

”میں اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں۔ بچی نہیں ہوں۔ ماسٹرز کر چکی ہوں۔“

”پنا برا بھلا سمجھتیں تو ہمدان سے شادی سے انکار نہ کرتیں۔ ساری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔ کتنی خواہش تھی ہماری کہ تمہاری شادی ہمدان سے ہوئی۔“ ماڑہ نے غلطی سے اسے دیکھا۔

”ہم اس موضوع پر پہلے ہی بہت بات کر چکے ہیں ممما! وہ بے زار ہوئی۔

”لیکن موضوع ختم نہیں ہوا رابی! شادی تو ہونا ہی ہے ایک دن۔ ہمدان سے نہ سہی کسی اور سے سہی۔ تمہاری ممائی نے طاہر کے لیے بھی کہا ہے اچھا لڑکا ہے۔ کوئی کی نہیں ہے ماشاء اللہ۔ میں اور تمہارے پاپا اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔“

”لیکن مجھے شادی نہیں کرنا ممما! نہ طاہر سے نہ ہمدان سے۔“ اس کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔

”یہ کیا بچپنا ہے رابی؟“ ماڑہ نے اسے پٹپٹا۔ ”شادی تو تمہاری کرنا ہی ہے اور طاہر دیکھا بھالا لڑکا ہے۔“

”مما پلیز۔“ رائیل نے التجا کی ”مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“

”اوکے! ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم سو جاؤ۔ نیند پوری ہوگی تو تم فریش ہو جاؤ گی۔“

رائیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ ماڑہ نے کمرے سے باہر نکل کر آہستگی سے دروازہ بند کیا اور پر سوچ انداز میں بیڑھیاں اترنے لگیں۔

”کیا رابی کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ وہ سوچ رہی تھیں۔ ”اس روز اس نے کہا تو تھا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہے۔ لیکن کیا واقعی؟ مگر کون ہو سکتا ہے؟ اس کا کوئی یونیورسٹی فیلو؟ لیکن کبھی ایسا کچھ محسوس تو نہیں ہوا پھر۔ ضرور اس نے غصے میں کہا ہو گا۔“

احسان شاہ ابھی تک لاؤنج میں اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بیڑھیوں سے اترتی ماڑہ کو دیکھا اور مسکرائے۔

”ہو گئے بیٹی سے مذاکرات؟“

ماڑہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور انہیں مسکراتا دیکھ کر ان کے اندر دور تک اطمینان اتر گیا۔ گویا احسان کا موڈ ٹھیک ہے اب۔

”بہت ناراض ہوگی تم سے؟“

”ہاں! لیکن میں نے مٹالیا۔“ ماڑہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ ”میری غلطی تھی۔ بس پتا نہیں کیوں آج کل مجھے غصہ بہت آتا ہے۔“

”چلو! تم نے اپنی غلطی تسلیم تو کی۔ ویسے غصہ حرام ہے۔“ احسان شاہ بہت لگاؤٹ سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”ارے! ایک دم وہ چونک کر سیدھے ہوئے اور اخبار اپنے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

”مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تمہیں بتانا۔ وہ تمہاری ایک دوست تھی۔ کیا نام تھا اس کا رابی۔ وہ مجھے اسپتال میں لی تھی اس روز۔“

”ہاں! لیکن وہ لوگ اب پاکستان میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی وغیرہ کے سلسلے میں۔“

”کیا وہ اسی پرانے گھر میں رہتے ہیں؟“ ماڑہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔

”یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔“

”تمہیں پتا تو ہے وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی۔ اکلوتی فرینڈ۔ لیکن اس کے کینیڈا جانے کے بعد پھر رابطہ ہی نہیں رہا۔ کم از کم تم اس کا فون نمبر تو لے لیتے۔“

”وہ کہہ رہی تھی کہ دو تین روز میں تم سے ملنے آئے گی۔“

”لیکن تمہیں اس سے نمبر لینا چاہیے تھا۔ میں فون کر کے اسے کھانے پر انوائٹ کر لیتی۔“ ماڑہ کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔

”خیال نہیں رہا سوری یار!“ احسان شاہ بہت دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ماڑہ اب بھی ویسی ہی خوبصورت تھیں۔ وہ آج بھی ان کے عشق میں مبتلا تھے اور وہ ان کے لیے اتنی ہی اہم تھیں۔

”تم اب بھی ویسی ہی ہو ماڑہ! لیکن تمہاری دوست بہت بدل گئی ہے۔ ایک نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہیں پایا۔ اس نے مجھے پہچان کر آواز دی اور بتایا کہ وہ روٹی ہے تو تب پہچانا۔ اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔“

احسان شاہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

ماڑہ نے ان کی طرف دیکھا اور دل گرفتگی سے سوچا۔

”اگر اللہ مجھ پر مہربان ہوتا تو۔۔۔ آج میں یہاں نہ ہوتی۔ اور فلک شاہ میری محبت کو نہ ٹھکراتا۔“

دل میں آج بھی بھانسی سی انگلی تھی اور اندر کہیں اس آگ سے ہی شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ جودل و جان کو بھسم کرتے تھے۔ پتا نہیں یہ آگ کبھی بجھے گی بھی یا نہیں۔

”افسردہ مت ہو ڈیر۔ میری غلطی میں نے اس سے نمبر نہیں لیا۔ میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ لیکن برا مس کہ تمہاری دوست نہ آئی تو اسے ڈھونڈ لیں گے۔ تمہیں اس کے میکے کا ایڈریس تو یاد ہو گا نا؟ وہاں

سے پتا کریں گے۔" مانہ کے چہرے پر چھا جانے والے بادل احسان شاہ کی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے۔ مانہ نے سر ہلا دیا۔ اس وقت ان کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ جس سے احسان شاہ آج بھی بے خبر تھے۔

"اب خوش ہو جاؤ یار! میں کچھ دیر بلا جان کے پاس بیٹھوں گا اور پھر مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ واپس آکر تمہاری سہیلی کو تلاش کرتے ہیں۔"

احسان شاہ اٹھ کر عبدالرحمن شاہ کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ مانہ نے اخبار اٹھا لیا۔ لیکن اخبار سامنے رکھے وہ مسلسل روٹی کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ روٹی اسکول کے زمانے سے ہی ان کی دوست تھی۔ دونوں نے ایک ہی اسکول اور پھر ایف۔ اے تک ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ پھر روٹی کے والد لاہور سیٹل ہو گئے۔ لیکن دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تھا اور پھر دو سال کی جدائی کے بعد انہوں نے روٹی کے اصرار پر ہی لاہور سے ماسٹرز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں مزید دو سال انہوں نے اکٹھے گزارے تھے۔ وہ ہر ایک اینڈ پر روٹی کے گھر چلی جاتی تھیں۔ فلک شاہ سے محبت اور احسان شاہ سے شادی تک وہ ہر بات سے آگاہ تھی۔ مانہ کی شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی بھی شادی ہو گئی اور وہ کینیڈا چلی گئی۔ یوں اتنی پرانی دوستی میں دوریاں پیدا ہو گئیں۔

"یہ شادی بھی بس۔ کم از کم اس سے ممبر ہی لے لیتے۔"

انہوں نے جھنجھلا کر اخبار صوفے پر پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ ان کے دل کی تڑپ اور روٹی سے ملنے کی شدید خواہش ہی تھی کہ ابھی انہیں کمرے میں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ روٹی نے "الریان" کے گیٹ میں قدم رکھا اور کچھ ہی دیر بعد شمو کی رہنمائی میں وہ ہنستی کھلکھلاتی اس کے کمرے میں کھڑی تھی۔

"ہائے روٹی! یہ تم ہو۔" وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔

"اس وقت میں تمہیں بہت شدید سے یاد کر رہی تھی اور مجھے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ احسان نے تمہارا نمبر کیوں نہیں لیا۔"

"یہ غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی کہ تمہارا نمبر نہیں لیا۔ لیکن دیکھو! تم نے یاد کیا اور میں موجود۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور بیٹھ گئی۔

"شمو! احسان شاہ کو بتاؤ تاکہ روٹی آئی ہے۔ وہ بلا جان کے پاس ہیں۔"

انہوں نے شمو سے کہا، جو ابھی تک وہاں کھڑی تھی۔

"چھوٹے شاہ صاحب! مصطفیٰ صاحب کے ساتھ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

"چھا! ٹھیک ہے۔ تم کو لڈو ڈرنگ لاؤ اور پھر چائے لے آنا۔ اور ہاں! یہ سچ بھی کہیں ہی کریں گی۔"

"یہ کیا تم سچ وغیرہ کے چکر میں پڑ گئی ہو۔ میں بس کچھ دیر کے لیے تم سے ملنے آئی ہوں۔ لمبی ملاقاتیں سچ و نر پھر کبھی۔ آج صرف چائے تک محدود رہوں گی۔" وہ پھر ہنسی۔

"تمہاری ہنسی اور بات کرنے کا انداز بالکل وہی ہے۔" مانہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ "لیکن تم بدل گئی ہو۔ کچھ اماں اماں سی لگنے لگی ہو۔"

"تین بچوں کی ماں ہوں یار۔ دو بیٹیاں ایک بیٹا۔ تو اماں تو لگنا ہی ہے اور سچی بات ہے مجھے اس طرح لگنا بہت پسند ہے۔ تھوڑا سا بھاری جسم، سیاہ بادل میں سے جھانکتے کچھ سفید بال، لیوں پر مانتا بھری مسکراہٹ، بھئی! ماں تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اب تمہاری طرح لڑکی لڑکی سی لگنے والی ماں نہیں لگتی۔ حالانکہ تین بچوں کی ماں تو تم بھی ہو۔ احسان بھائی نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن یار! تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔ وہی گورنمنٹ کالج والی طرح وار، خیرلی مانہ حسین۔ آج بتاؤ! یہ بچے کہیں سے ادھار تو نہیں لے گئے؟"

وہ پھر اونچی آواز میں ہنسی سا نہ بھی مسکرا دیں۔ "تم ظاہر میں کچھ بدلی ضرور ہو۔ لیکن تمہاری آواز

کا ایوم وہ ہی ہے، قل۔"

"ہاں یار! اسد بھی مجھے کہہ کہہ کر ہار گئے کہ ذرا آہستہ بولا کرو۔ لیکن اپنی یہ عادت نہیں بدل سکی۔ کیا کروں۔ لگتا ہے میرے والیوم سیز میں ہی کچھ خرابی ہے۔ خیر چھوڑو۔ تم بتاؤ، تمہارے بچے کیسے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔"

"میری بیٹی نے ماسٹرز کر لیا ہے۔ بیٹے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ زہیر انجینئرنگ کے دوسرے سال میں ہے جبکہ عمر اے لیول کر رہا ہے۔"

"یعنی وقفہ بہت ضروری ہے۔" روٹی ہنسی۔ "میرا بیٹا جاب کر رہا ہے اور بیٹیاں بھی فارغ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کی شادیوں کے سلسلے میں پاکستان آئے ہیں۔ تم نے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا؟"

"نہیں! ابھی تو نہیں۔"

"کہاں ہے۔ ملو اوٹا۔"

"اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ابھی سوئی ہے۔ کچھ دیر تک بلواتی ہوں۔"

شمو نے آکر جوس پیش کیا۔

"کیا ارادہ ہے اس کے لیے؟ تمہارے بیٹھوں وغیرہ کے لڑکے تو ہوں گے اور وہ کیا نام تھے تمہاری نندوں کے۔ عمارہ اور زارا۔"

وہ جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ "زارا کا تو انتقال ہو چکا ہے۔"

"وہ بہت افسوس ہوا۔" روٹی نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ارادہ تو تھا۔ مصطفیٰ بھائی کا بیٹا بہت پسند تھا مجھے۔ کابھالی کی اور میری بھی خواہش تھی۔ لیکن رابی نہیں آتی۔"

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟"

"پتا نہیں یار۔ اس نے ایسا کچھ کہا نہیں ہے۔ لیکن وہ شادی کے لیے بھی راضی نہیں ہو رہی۔"

"بعض اوقات بچیاں ذمہ داری سے گھبراتی ہیں۔ میری اپنی بیٹی بھی یہی کہتی ہے کہ وہ فی الحال شادی کی ذمہ داریوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے پیار کی لاڈلی بھی تو بہت ہے۔ احسان نے بہت لاڈ اٹھائے ہیں اس کے۔"

"اور احسان بھائی کیا تمہارے اب بھی اس طرح دیوانے ہیں؟"

اور احسان شاہ جو کچھ دیر کے لیے مصطفیٰ شاہ کے ساتھ باہر گئے تھے اور شمو سے روٹی کے آنے کا سن کر ادھر ہی رہے تھے اپنا نام سن کر رک گئے۔ روٹی کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ ان کے لیوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا جہاں آج بھی مانہ کی حکمرانی تھی۔ وہ آج بھی اس کے اتنے ہی دیوانے تھے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر رک گئے۔ وہ جانتا چاہتے تھے کہ مانہ کیا کہتی ہے۔ لیوں پر مدھم مسکراہٹ لیے وہ مانہ کا جواب سننے کے منتظر تھے۔

"ہاں! احسان آج بھی میرا دیوانہ ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا۔ اسی طرح محبت کرتا ہے۔"

"پھر رمانتی ہوتا مجھے؟ میں نے کیا کہا تھا یاد ہے نا؟ کہ شادی اس سے کرو جو تم سے محبت کرتا ہے۔ نہ کہ اس سے جس سے تم محبت کرتی ہو۔ اگر تمہاری شادی کسی نہ کسی طرح فلک شاہ سے ہو بھی جاتی تو فلک شاہ تمہیں وہ محبت کبھی بھی نہ دیتا جو احسان شاہ نے تمہیں دی۔"

اور احسان شاہ جنہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے تاب پر ہاتھ رکھا تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

"تم ٹھٹک کھتی ہو روٹی! مانہ نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن یہ دل۔ اس نے تو ہمیشہ فلک شاہ کی چاہ کی تھی۔ اسی سے محبت کی تھی۔ اسی کا ساتھ چاہا تھا۔"

"کیا تم اب بھی فلک شاہ سے محبت کرتی ہو مانہ؟"

روٹی نے حیرت پوچھا۔

"نہیں! یہ محبت کب کی نفرت میں بدل چکی۔ بس ایک آگ دکتی ہے اندر جو دل و جان کو جلاتی ہے۔ انتقام کی آگ۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ اس نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ مجھے ٹھکرایا ہے اور میں اسے کبھی نہیں رہنے دوں گی۔ میں نے قسم کھائی تھی روٹی اس سے

اپنی انفلٹ کا بدلہ لوں گی۔ اس نے مجھ پر عمارہ کو ترجیح دی۔ اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے دوست کو دھوکا نہ دوں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔“

برسوں پرانے زخم کے ٹانگے کھل گئے تھے۔ روٹی حیرت سے سن رہی تھی۔

”اور میں نے بدلہ لے لیا۔ اللہ نے مجھے موقع دیا اور شانی نے میری بات پر یقین کر لیا وہ ”لریان“ سے نکل گیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ اب یہاں قدم تک نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کہا تھا کہ میں احسان شاہ کے قابل نہیں ہوں اور میں نے احسان شاہ سے شادی کر لی۔ اور اب وہ عمر بھر یوں ہی جلتا کڑھتا رہے گا۔“

اور ناب پر ہاتھ رکھے مساکت کھڑے احسان شاہ کو لگا تھا ”ان کا دل ایسے ڈوبے گا کہ پھر کبھی ابھر نہیں سکے گا۔“

”یہ کیسی محبت تھی تمہاری ماں؟“ روٹی کی آواز میں تاسف تھا۔ ”فلک شاہ بہت اچھا انسان تھا۔ تم نے کیا کیا اس کے ساتھ؟“

”میں نے اسے ”لریان“ والوں کے دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن روٹی! ایک بار پھر وہ میرے لیے امتحان بن گیا ہے۔ اس کی بیوی اس کا بیٹا۔“

اور احسان شاہ نے ناب سے ہاتھ اٹھالیا۔ انہیں لگا اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو گر جائیں گے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مڑے۔ آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ آ رہا تھا۔ کتنی بے یقینی تھی ان کی آنکھوں میں۔ جیسے انہیں احسان کی بے اعتباری کا یقین ہی نہ ہو۔ اور پھر جب وہ ان کے آفس اگے تھے۔ اور جب احسان نے فون کیا تھا۔

پتا نہیں کیسے وہ لاؤنج اور پھر لاؤنج سے ڈرائنگ روم تک آئے تھے۔ انہیں اس وقت شمالی کی ضرورت تھی اور ڈرائنگ روم ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس وقت کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے صوفے تک آئے اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ ٹھہر گیا تھا۔

جب انہوں نے فلک شاہ کو ”لریان“ سے نکلنے کو کہا تھا تو ان کی نظریں

”ف۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور گرم گرم آنسو ان کے ہاتھوں کو بھگونے لگے۔ تو یہ چھپیں سال کی جدائیاں۔

اس کا زمہ دار کون تھا۔ وہ اور ماںہ کیوں کیا انہوں نے ماںہ کی بات پر یقین کیا۔ کیوں حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی؟

زارا اور اماں جان کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ وہ آخری لمحوں میں اماں جان کی آنکھوں میں انتظار کی افست۔ وہ حسرت۔

ان کا دل چاہا وہ چھپیں مار مار کر روئیں۔ وہ کتنے سالوں سے ماںہ کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے تھے۔ انہوں نے ماںہ پر یقین کر کے موی کو کھو دیا تھا۔ اپنے عزیز از جان دوست کو۔ گزرے سالوں کے کتنے ہی منظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ کتنی ہی بار موی نے انہیں ماںہ کے متعلق بتانا چاہا تھا اور جب وہ ماںہ کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے تو موی کا مضطرب ہونا اور کبھی کبھی کہنا۔

”یار! تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی محبت کے لیے؟“

اور پھر جب ان کی متکئی ہوئی تھی۔ جب وہ موی کو لے کر حیم یار خان گئے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔ پھر وہ اٹھے اور چہرے کو اچھی طرح رومال سے پونچھنے کے بعد انہوں نے باہر کی طرف قدم بڑھایا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس مڑے۔ پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا اور مویہ کا نمبر ملائے لگے۔

”مروہ پچھو پلینز۔ مجھے وہ سب کچھ بتادیں جو آپ ماںہ موی اور میرے متعلق جانتی ہیں۔ ایک بات بھی مت چھپائیے گا پلینز۔ بہت کچھ میں جان چکا ہوں۔ جو نہیں جانتا وہ مجھے آپ سے سنتا ہے۔“

”کیا سنتا چاہتے ہو شانی؟ جو گزر گیا اسے بھول جاؤ۔“

”کیسے پچھو؟ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ بھول جاؤں۔ آپ جانتی نہیں پچھو کہ ماںہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ موی سے۔“

”شانی بیٹا! تم۔“

”پچھو پلینز۔ اب کچھ بھی چھپانے کا فائدہ نہیں ہے۔ میں مر رہا ہوں پچھو۔“

اور جب مروہ سے بات کر کے احسان شاہ نے فون بند کیا تو ایک بار پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

موی ان کے لیے کیا تھا۔ اور انہوں نے کیا کیا تھا۔

کچھ دیر وہ کھڑے ضبط کرتے رہے۔ پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ لاؤنج میں کھڑے کھڑے انہوں نے اپنے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اندر سے روٹی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ اس وقت ماںہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنا والٹ نکال کر دیکھا۔ اور پھر عبدالرحمن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

فلک شاہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے براؤن لفافہ اٹھا کر اس میں سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ تب ہی عمارہ نے کمرے کا دروازہ کھول کر پوچھا۔

”آپ کی چائے یہاں لے آؤ یا لاؤنج میں چلیں گے؟“

عموماً ”شام کی چائے“ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں ہی پیتے تھے اور ساتھ میں ٹی وی دیکھ لیتے تھے۔

”ہیں۔“ بھجوا دیجئے۔“ فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ”میں ذرا یہ دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ کیا ہے؟“

”یہ ایک نے اپنے نئے ناول کے مسودے کی کاپی بھیجی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں اسے پڑھ کر مشورہ

دوں۔“

”اچھا تو کیا اس کا نیا ناول کھل ہو گیا ہے؟“ عمارہ نے پوچھا۔

”نہیں! ابھی آخری باب رہتا ہے۔ لیکن وہ کچھ مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے مجھے بھجوا دیا ہے۔“ فلک شاہ مسکرائے۔

”وہ دراصل ایک شاہکار تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پہلے دو ناول بھی تو شاہکار ہی تھے۔“

عمارہ مسکرائی تو ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور عمارہ کو لگا جیسے وہ اضطراب اور بے چینی جو ہر وقت ان کے چہرے کا ہالہ کیے رکھتی تھی۔ اس وقت نہیں تھی۔ لاہور سے آنے کے بعد پہلی بار عمارہ نے انہیں آج کچھ پرسکون اور مطمئن دیکھا تھا۔ وہ بھی مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں تو فلک شاہ نے اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔

”اور صدیوں پرانی زمین کا سینہ دکھوں سے چھلنی ہے۔ اور ابتدائے آفریش سے ہی اس کی آنسوؤں کے ساتھ یاری ہے۔ حضرت آدم کے پہلے آنسو کے ساتھ اس نے پہلا آنسو بہایا تھا۔ اس نے تمہارے دکھ اوڑھے اور تمہارے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر سنبھالا۔ تمہارے دکھ کے کانٹے اپنی انگلیوں سے چنے اور پوروں کو اہولمان کیا۔ اور تمہارے راستے اپنی پلکوں سے صاف کیے۔ تمہارے ساتھ مل کر روٹی تمہارے ہر دکھ اور ہر غم پر۔ تم تو اپنے دکھ اس کی جھولی میں ڈال کر شانت ہو جاتے ہو۔ وہ تو ازل سے تمہاری نمکسار ہے۔ لیکن تم نے کبھی اس کی نمکساری نہیں کی۔“

تم اگر کر زمین پر چلتے ہو اور اپنے قدموں کی دھمک سے اس کا سینہ زخمی کرتے ہو۔“

”ہاں! تم صحیح کہتی ہو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن کتنی عجیب بات ہے شاعر! تم نے کبھی زمین کی قدر نہیں کی۔ اپنی نمکسار کو اور تمہارے دکھوں پر رونے والی کو تم نے ہمیشہ اپنی ملکیت جانا۔ کبھی اس کی

روتی آنکھوں کو نہیں دیکھا اور کبھی نہیں سوچا کہ تمہارے قدموں تلے بچنے والی نے تمہارے ہر دکھ کو اوڑھا ہے اور آنسو بہائے ہیں۔“

فلک شاہ نے ایک ساتھ دو تین صفحات الٹے۔
”اور جب نماز فجر کے وقت فیروز ابو لولہ نے حجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا تھا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر شہادت کا جھومر سجا تھا۔“

اور جب حسن و حیا کے پیکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے قرآن کے صفحات رنگین ہوئے تھے تو زمین کے آنسو رکتے نہ تھے۔
انہوں نے ایک اور صفحہ پلٹا۔

”اور جب زرعد بن شریق تمیمی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر کاٹا تھا۔ اور ثنان بن انس نخوی سر مبارک نیزے پر اٹھا تا تھا اور خولیٰ بن یزید اصبحی سر مبارک لے کر چلتا تھا تو زمین دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور فریاد کرتی تھی اور جب حضرت زینبؓ نے بچے قافلے کو لے کر کربلا سے روانہ ہوئی تھیں تو زمین ان کے قدموں سے لپٹتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔“

عمارہ ملازمہ کے ساتھ چائے لے کر آئیں اور ملازمہ کو جانے کا اشارہ کر کے پلیٹ اور نمکٹس ان کی طرف بڑھائے۔

”نہیں! صرف چائے لوں گا۔“ فلک شاہ نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”کیسا ہے؟“ عمارہ نے چائے ہاتھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

”اس کے پہلے دو ٹاولوں سے مختلف ہے۔ ابھی تو یوں ہی سرسری سانچے میں سے دیکھ رہا ہوں۔ تفصیل سے پڑھنے کا موڑ نہیں ہے۔ ویسے اچھا لگ رہا ہے۔“

”بیک کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔“

عمارہ کے لہجے سے محبت چھلکتی تھی۔ انہوں نے

چائے کا کپ فلک شاہ کی طرف بڑھایا۔

”آج انجی آرہی ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا۔ دونوں رات کھانا کھا کر ہی جائیں۔ کیا پکواؤں؟“

”یہ آپ کا شعبہ ہے عموجی۔ جو جی چاہے اور جو ہماری انجی اور جواد کو پسند ہو۔“

وہ مسکرائے اور اس مسکراہٹ میں عمارہ کو وہی پرانے رنگ چھلکتے دکھے تھے۔ عمارہ بھی مسکرا دیں۔

”ٹھیک ہے۔ انجی سے پوچھتی ہوں۔“

وہ باہر چلی گئیں۔ فلک شاہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پھر سے فائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک صفحہ پلٹتے ہوئے در کے

”اور جب جلج بن یوسف مکہ پر حملہ آور ہوا اور مکہ کی سرزمین پر عبد اللہ بن زبیر کے ماتھے پر شہادت کا تاج سجا اور حضرت اسماعیل شہادت اپنے تخت جگر سے مخاطب ہوتی تھیں تو زمین کے آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے بہتے تھے۔“ انہوں نے صفحہ پلٹا۔

”اور تم جانتے ہو شاعر! کہ خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور حکومت کے آخری ایام میں بحر اوقیانوس سے کاشغر اور سندھ تک مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے لہرا دیے تھے۔“

”ہاں! میں نے ایف۔ اے میں اسلامی تاریخ پڑھی تھی۔“ میں نے حور عین کی طرف دیکھا۔

”حالانکہ تمہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

حور عین کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ میں بہت سال سے دیکھنے لگا۔

”ہاں! لیکن میرے مضمون کے ساتھ میرے کالج میں، ہسٹری کا کمبینیشن (Combination) تھا۔ سو۔“

”تو تم پاس ہو گئے تھے؟“ وہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”بس ہو ہی گیا تھا۔ چند سوال رٹ لیے تھے۔ کام چل گیا۔“

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی لبوں پر مسکراہٹ لیے مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے اچھا لگا۔

پہلی بار اس نے آنسوؤں سے ہٹ کر کوئی بات کی تھی۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے علاوہ کوئی اور تاثر نہ دیکھا۔ میرا جی چاہا آج وہ کوئی اور بات نہ کرے اور یوں ہی مجھ سے میرے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”مشرق کی طرف محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے سے ہوتا ہوا ملتان تک جا پہنچا تھا تو قتیبہ بن مسلم کاشغر ترکستان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ مغرب میں موسیٰ بن نصیر کاشغر فرانس کی حدود میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اور طارق بن زیاد نے اندلس میں فتح کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔“

پتا نہیں اسے تاریخ کو کھنگالنے کا اتنا شوق کیوں تھا۔ میں بھنجلیا۔

”ہاں! مجھے علم ہے کہ طارق نے کشتیاں جلائی تھیں اور محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی تھی اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے خلیفہ بنے تھے۔“

میں چاہتا تھا آج ہم اپنے متعلق باتیں کریں اور اس کے لبوں پر وہ ہی پیاری سی مسکراہٹ ہو جو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھی تھی۔ لیکن وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں گھوم رہی ہوئی تھی تو کروڑوں پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

”ہم بڑی بد نصیب قوم ہیں شاعر اپنے محسنوں کو مار کر ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کاٹتے ہیں۔ تم نے تو اسلامی تاریخ پڑھی ہے۔ بھلے نصاب کے طور پر کسی۔ تم تو جانتے ہو! سلیمان نے موسیٰ بن نصیر کے ساتھ کیا کیا۔ وہ موسیٰ بن نصیر جس نے آدمی دنیا کو بلیا کیا تھا۔ جو افریقہ اور ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا بلی تھا۔ اس پر خیانت کا الزام لگا کر اور سارا دن دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے لگائے جاتے تھے تو زمین کے آنسو اس نوے سالہ بہادر شخص کا حال دیکھ کر رکتے نہ تھے۔“ وہ پھر افسردہ ہوئی۔

”اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا۔ اور پاؤں میں

پیریاں پسائی گئیں۔ جائیداد ضبط کر لی گئی اور اس کے بیٹوں عبد الرحمن، عبد العزیز اور عبد اللہ کو شہید کر دیا گیا۔ زمین نے اس فلاح کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھ کر لبوں کے آنسو روئے۔“

”ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ جرمانے کی رقم پوری کرنے کے لیے موسیٰ بن نصیر کو گلے میں طوق ڈال کر اور ہاتھ میں کشکول پکڑا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں ناپید بھی ہو چکے تھے۔“

میں نے پھر اس کی بات کالی تھی۔

”اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے طارق بن زیاد محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو بھی مروا دیا تھا۔“

اس نے ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔

”وہ چاہتے تو سلیمان کا حکم نہ مانتے۔ ان کے چاہنے والے ان کے سروں پر تاج رکھتے۔ لیکن وہ آج کے مسلمان نہیں تھے۔ انہیں ملت کا اتحاد اپنی زندگیوں سے زیادہ عزیز تھا۔“

اس نے نظریں میرے چہرے سے ہٹالیں۔

”اور وہ محمد بن قاسم جس نے اہل سندھ کو زندگی کی نوید دی تھی۔ اور طارق بن زیاد جو موسیٰ بن نصیر کا لے پالک بیٹا تھا۔ وہ بہادر۔ آہ! ہم بڑی بد نصیب قوم ہیں۔“

اس نے دہرایا اور ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی اور سر جھکا لیا۔

”تو۔“ بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے لیے پر اتنا نہیں روئی تھی۔ جتنا اسلامی تاریخ کے المیوں پر آنسو بہاتی تھی۔

”تو میں کہہ رہی تھی کہ جب یزید بن ابوبکبشہ محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے آ رہا تھا تو زمین کے آنسو بہتے تھے اور وہ کم عمر بیسہ سالار کی بلائیں لیتی اور اس پر شمار ہوتی تھی۔“

پہلی بار اس نے آنسوؤں سے ہٹ کر کوئی بات کی تھی۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے علاوہ کوئی اور تاثر نہ دیکھا۔ میرا جی چاہا آج وہ کوئی اور بات نہ کرے اور یوں ہی مجھ سے میرے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”مشرق کی طرف محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے سے ہوتا ہوا ملتان تک جا پہنچا تھا تو قتیبہ بن مسلم کاشغر ترکستان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ مغرب میں موسیٰ بن نصیر کاشغر فرانس کی حدود میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اور طارق بن زیاد محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو بھی مروا دیا تھا۔“

پتا نہیں اسے تاریخ کو کھنگالنے کا اتنا شوق کیوں تھا۔ میں بھنجلیا۔

”ہاں! مجھے علم ہے کہ طارق نے کشتیاں جلائی تھیں اور محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی تھی اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے خلیفہ بنے تھے۔“

میں چاہتا تھا آج ہم اپنے متعلق باتیں کریں اور اس کے لبوں پر وہ ہی پیاری سی مسکراہٹ ہو جو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھی تھی۔ لیکن وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں گھوم رہی ہوئی تھی تو کروڑوں پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

”ہم بڑی بد نصیب قوم ہیں شاعر اپنے محسنوں کو مار کر ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کاٹتے ہیں۔ تم نے تو اسلامی تاریخ پڑھی ہے۔ بھلے نصاب کے طور پر کسی۔ تم تو جانتے ہو! سلیمان نے موسیٰ بن نصیر کے ساتھ کیا کیا۔ وہ موسیٰ بن نصیر جس نے آدمی دنیا کو بلیا کیا تھا۔ جو افریقہ اور ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا بلی تھا۔ اس پر خیانت کا الزام لگا کر اور سارا دن دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے لگائے جاتے تھے تو زمین کے آنسو اس نوے سالہ بہادر شخص کا حال دیکھ کر رکتے نہ تھے۔“ وہ پھر افسردہ ہوئی۔

”اس کے گلے میں طوق ڈالا گیا۔ اور پاؤں میں

پیریاں پسائی گئیں۔ جائیداد ضبط کر لی گئی اور اس کے بیٹوں عبد الرحمن، عبد العزیز اور عبد اللہ کو شہید کر دیا گیا۔ زمین نے اس فلاح کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھ کر لبوں کے آنسو روئے۔“

”ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ جرمانے کی رقم پوری کرنے کے لیے موسیٰ بن نصیر کو گلے میں طوق ڈال کر اور ہاتھ میں کشکول پکڑا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں ناپید بھی ہو چکے تھے۔“

میں نے پھر اس کی بات کالی تھی۔

”اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلیمان بن عبد الملک نے طارق بن زیاد محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو بھی مروا دیا تھا۔“

اس نے ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔

”وہ چاہتے تو سلیمان کا حکم نہ مانتے۔ ان کے چاہنے والے ان کے سروں پر تاج رکھتے۔ لیکن وہ آج کے مسلمان نہیں تھے۔ انہیں ملت کا اتحاد اپنی زندگیوں سے زیادہ عزیز تھا۔“

اس نے نظریں میرے چہرے سے ہٹالیں۔

”اور وہ محمد بن قاسم جس نے اہل سندھ کو زندگی کی نوید دی تھی۔ اور طارق بن زیاد جو موسیٰ بن نصیر کا لے پالک بیٹا تھا۔ وہ بہادر۔ آہ! ہم بڑی بد نصیب قوم ہیں۔“

اس نے دہرایا اور ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی اور سر جھکا لیا۔

”تو۔“ بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے لیے پر اتنا نہیں روئی تھی۔ جتنا اسلامی تاریخ کے المیوں پر آنسو بہاتی تھی۔

”تو میں کہہ رہی تھی کہ جب یزید بن ابوبکبشہ محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے آ رہا تھا تو زمین کے آنسو بہتے تھے اور وہ کم عمر بیسہ سالار کی بلائیں لیتی اور اس پر شمار ہوتی تھی۔“

زمین پر وہ صبح کا ستارہ غروب ہو گیا۔“

فلک شاہ نے چائے کا خالی کپ نیبل پر رکھا اور بہت دھیان سے شروع سے پڑھنے لگے۔ انہیں یہ ناول بہت دلچسپ اور مفرد لگ رہا تھا۔ ایک دم دروازہ کھلا اور عمارہ اندر آئیں۔

”مومی۔ مومی آئی دیکھیں کون آیا ہے۔“ ان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی اور سانس پھولا ہوا تھا۔

”کون؟“ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر جیسے ان کی نظریں وہیں ساکت ہو گئیں۔ لمحہ بھر تو وہ بے یقینی سے دیکھتے رہے۔ پھر ان کے لبوں سے کانپتی ہوئی سی آواز نکلی۔

”شانی۔“ انہوں نے ہتھیلیوں کے زور پر اٹھنے کی بے اختیار کوشش کی۔ پھر اپنی بے بسی پر ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر نمباگ کر ان کا استقبال نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے گلے نہیں لگ سکتے تھے۔

”شانی! ان کے لبوں سے پھر نکلا۔ اور ان کی آنکھیں برس پڑیں۔

احسان شاہ تڑپ کر ان کے قریب آئے اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”مومی! مجھے معاف کرو۔ میں نے تمہیں غلط جانا۔“

”شانی! فلک شاہ نے بازو پھیلا دیے اور احسان شاہ بیٹھے بیٹھے ہی ان کے گلے لگ گئے۔ دونوں رو رہے تھے۔ لفظ جیسے دونوں کے پاس ہی نہیں تھا۔

”شانی بھائی! پلیز۔“ عمارہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اب بس کریں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”مجھے کچھ نہیں ہو گا عمو!“ احسان شاہ نے مڑ کر عمارہ کو دیکھا اور پھر فلک شاہ کی طرف۔ جو ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر رہے تھے۔

”میں تو ہمیشہ سے بے وقوف تھا مومی! مجھے تو بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر تم نے مجھے کیوں نہ بتایا۔ صاف صاف۔ پہلے ہی دن۔ جب تمہیں لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ مخلص

نہیں۔“

”جو گزر گیا، سو گزر گیا شانی!“ فلک شاہ نے پر دم آنکھوں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ ”میں چاہتا تھا مرنے سے پہلے تمہیں دیکھ لوں۔ سن لوں کہ تمہاری بدگمانی دور ہو گئی ہے۔ میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے بدگمان ہو۔ میں نے بارہا دعا کی کہ میری قبر پر مٹی ڈالنے والوں میں تمہارے ہاتھ بھی ہوں۔ میرے لیے رونے والی آنکھوں میں تمہاری آنکھیں بھی ہوں۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارا دل صاف ہوا۔“

”مومی! تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔ مجھ سے خفا تو نہیں ہونا؟“ احسان شاہ کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔

”میں تم سے کبھی خفا تھا ہی نہیں یا! جانتا تھا تمہیں بدگمان کیا گیا۔“

”اور میں بدگمان ہو گیا۔ لیکن کیوں ہوا میں بدگمان۔ کیوں؟ تمہیں تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ اور وہ صرف چند برسوں کی رفیق تھی۔ میں نے اس کا اعتبار کیا۔ تمہارا نہیں۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں کیوں نہیں دیکھا؟ تمہارے چہرے کو کیوں نہیں پڑھا؟“

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچنے لگے۔ ”کیا کر رہے ہو شانی؟“ فلک شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”کیا کروں۔ کیا کروں میں مومی! جو اس اذیت کو کم کر سکے۔ جو دل و جان کو ٹکڑے کیے دیتی ہے۔ کیسے کم کروں اس دکھ کو جو صبح سے دل چیر رہا ہے؟“

فلک شاہ نے ہاتھ بدھا کر انہیں پھر سے گلے لگایا اور ہولے ہولے تھکنے لگے۔ لیکن ان کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔ اس دکھ نے چھبیس سال تک ان کے دل کو آرے کی طرح چیرا تھا۔ زخم لگائے تھے۔

”مومی! میں کیا کروں؟ کیا کروں ایسا جو ان سارے گزرے برسوں کو واپس لے آئے؟“

احسان شاہ کہہ رہے تھے اور ان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ایک بار پھر دونوں دوست بلک بلک کر رو

رہے تھے اور ان کے آنسو ایک دوسرے کے کندھے بھگور رہے تھے۔



ایک بڑا کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ”زمین کے آنسو“ کی فائل تھی۔ اس نے فلک شاہ کو اس کی فوٹو کالی بھیجی تھی۔ انہوں نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن نظر ثانی کرنے کو بھی کہا تھا۔ سو فجر کی نماز پڑھ کر وہ سویا نہیں تھا اور فائل اٹھالی تھی۔ وہ اس ٹائل کو یکسوئی سے لکھ نہیں سکا تھا۔ پہلے دو ٹائل اس طرح وقفہ دے کر نہیں لکھے تھے اس نے۔

”بیبا صبح کتے ہیں۔ مزید لکھنے سے پہلے مجھے پچھلے لکھے ہوئے کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔“ اس نے ورق گردانی کرتے ہوئے سوچا اور اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔ یہ صفحہ نمبر 253 تھا۔

”جب صلاح الدین ایوبی بیت المقدس کی خاطر جنگ کر رہا تھا تو عباسی خلفاء عیش و عشرت میں پڑے تھے۔ بغداد کے چوراہوں پر مناظرے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے فرے کو برا کہا جاتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ چھ سو سال پہلے ایک طرف کوہ البرز کی چوٹیوں پر اسلام کا جھنڈا لہانے والے اور دوسری طرف افریقہ کے پتے ہوئے ریگ زاروں میں گھوڑے دوڑانے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

وہ صحرائے گوبی کا ایک چرواہا تھا۔ جس کا نام تموچن تھا اور تاریخ میں چنگیز خان کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ اس کی قیادت میں منگولیا کے وحشی قبائل ایک آندھی کی طرح اٹھے اور شہروں اور بستیوں کو جلاتے چلے گئے تھے اور ان کے جرنیل اپنی فتح کی یادگار میں انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھے تو زمین اپنے وجود پر ان میناروں کی تعمیر سے اذیت میں تھی۔ اور ان مسلمانوں کے لیے اس کا دل روتا تھا اور جب جلال الدین خوارزم شاہ تھک کر اس قوم سے مایوس ہو کر اکیلا جاتا تھا تو زمین اس کے ان دیکھے آنسو اپنے نامعلوم ہاتھوں سے پوچھتی تھی اور جانتے ہو شاعر!

تاریخ کبھی کسی قوم کی اجتماعی غلطی معاف نہیں کرتی۔ وہ چنگیز خان کا پوتا ہلا کو خان تھا اور یہ مقتصد باللہ کی خلافت کا تیسرا سال تھا جب وہ بلا کی طرح تازل ہوا اور بغداد نے وہ تباہی دیکھی جس کے سامنے بائبل و تورا کی داستانیں بیچ ہیں۔ تب زمین نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اس کا شمار ہی نہیں۔ وجہ کے سرخ پانی میں اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے اور کتب خانوں سے اٹھنے والا دھواں اس کے دل میں آگ لگا تھا۔ اس نے چند صفحات ایک ساتھ پلٹ دیے۔

”تو زمین کے آنسوؤں کا تو حساب ہی نہیں ہے شاعر! وہ کب کب روئی۔ کب کب آنسو بہائے۔“ میں اس کی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

”جب عبد اللہ فرزند غرناطہ کی چاہیاں دیتا تھا۔ جب مسجد قرطبہ کو کلیسا میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اور جب یوسف سلطان اور سراج الدولہ کو شہید کیا جا رہا تھا اور جب 1857ء میں برصغیر کے مسلمانوں کو سولیوں پر چڑھایا جا رہا تھا۔ اور جب بخت خان مایوس سر جھکائے لال قلعہ سے نکلا تھا۔ جب جلالوالہ بلخ میں نیتے لوگوں پر جنرل ڈائر گولیاں چلا رہا تھا تو کیا زمین اپنے آنسو روک سکتی ہوگی؟ نہیں نا!“

ایک نے پھر ایک ساتھ کئی صفحات پلٹ دیے یہ صفحہ نمبر 280 تھا۔ ”تاریخ نے اتنی بڑی ہجرت دیکھی۔ جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ ہجرت برصغیر کی تقسیم کے وقت دیکھی گئی اور مشرق و پنجاب میں ظلم و ستم اور بربریت کی جو داستانیں لکھی گئیں انہوں نے تاتاریوں کے ظلم کو مات کر دیا۔ یہ پاکستان یوں ہی نہیں بن گیا تھا۔ بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔ آدا“ اس کے لبوں سے آہ نکلی۔

”کیا ہوا حور عین؟“ میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آہ شاعر! تم لوگوں نے تاریخ کو مسخ کیا۔ تمہارے ادیبوں نے مشرق و پنجاب میں ہونے والے ظلم و شقاوت کی کہانیاں تو تم لکھیں۔ لیکن یہاں ہونے والے اکاد کا واقعات کو برہا چڑھا کر بیان کیا۔“

”نہیں خیر! ایسا تو نہیں ہے۔ لکھا تو ہے۔ لیکن شاید تم نے نہیں پڑھا۔ نسیم جازبی کی خاک و خون۔“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”ہو سکتا ہے۔ میں نے وہ سب نہ پڑھا ہو۔ لیکن شاعر! یہ تو کوئی زیادہ پرالی بات نہیں ہے۔“ ”کون سی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ ہی سقوط ڈھاکہ اور سانحہ مشرقی پاکستان۔ مکتی باہنی والوں نے جو مظالم کیے۔ بہاریوں پر اور مغربی پاکستانیوں پر اور مغربی پاکستان کے فوجیوں پر۔ انہیں بتاتے میرا دل کانپتا ہے۔ لیکن تمہارے بڑے بڑے ادیبوں کی انگلیاں تو صرف اپنی فوج کی طرف اٹھتی رہیں۔ اپنی ہی فوج کو بدنام کرنے میں وہ غیروں سے بھی بڑھ کر نکلے۔ کسی نے حقیقت کو جاننے اور تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تیس لاکھ بنگالی مارے گئے۔ یہ ایسا جھوٹ تھا جسے سب نے تسلیم کر لیا کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ حقیقت برکھنے والے تو دوسرے ہیں جو صفحات الٹ الٹ کر دیکھتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں لیکن تمہارا قلم پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ تمہیں کیا۔ تمہیں تو اپنی کرسی سے مطلب ہے اور دولت سے جو تمہارے بینک بھر رہی ہے۔ تم نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ محصور بہاریوں پر کیا گزرتی ہے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں کچھ نہیں جانتا حور عین! مجھے تاریخ سے کیا لینا دینا مجھے زمین کے آنسوؤں سے کیا مطلب مجھے تو تمہارے آنسو بے قرار کرتے ہیں اور تمہارا کرب میرے دل میں زخم ڈالتا ہے۔ میں جو اتنے عرصہ سے اس ریٹ ہاؤس میں پڑا ہوں تو تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیوں؟ تمہارے لیے۔ صرف تمہارے لیے حور عین! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھنے لگی۔

میرا یقین کرو حور عین! یہاں کی سڑی میری ہڈیوں

کو کڑکڑاتی ہے۔ لیکن میرا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارے بغیر۔ تم میرے ساتھ چلو حور عین!“

میں جذباتی ہو رہا تھا اور وہ یوں ہی آنکھوں میں حیرت لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”سوری!“ مجھے ایک دم ہی خیال آیا تھا۔ میں نے رابعہ رقیہ اور مریم کے متعلق تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور وہ اکیلی یہاں اس وادی میں کیا کر رہی ہے۔ میں اس کے قریب ہی دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ ”حور عین! رابعہ تو بیچ گئی تھی۔ پھر کیا ہوا تھا؟ کیا تمہاری حویلی میں قریب ہے؟“

حور عین نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں ایک دم پانیوں سے بھر گئیں اور وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”چوہدری فرید کی حویلی میں اب ثریا کی حکومت تھی۔ وہ سر اٹھا کر تھی ہوئی گردن کے ساتھ چلتی تھی کہ اس کی گود میں چوہدری فرید کا وارث تھا۔ اسے تو اب نور اور میراں کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ بلا سے وہیں سنور کر ڈیرے پر جا میں اور چوہدری فرید کو لہا نہیں۔ وہ وارث کی ماں تھی اور اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔“

وہ سر جھکائے ہوئے بول رہی تھی اور میں ایک بار پھر اسے خاموش ہو کر سن رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ساری گفتگو میں مجھے صرف مریم کی کہانی سے دلچسپی تھی۔

مریم جو حور عین کی ماں تھی۔ حور عین جو ختمہ بھی پانچویں۔

”اور چوہدری فرید کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بھی اس گھر میں رہتی ہے اور ثریا جتنے ہی حقوق رکھتی ہے اور ثریا سے زیادہ زمین کی مالک ہے۔ لیکن وہ اسے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ وہ ثریا سے آگے نہ اٹھتا تو ڈیرے کی راتیں رنگین ہو جاتیں اور میراں اور نور سے بے زار ہوتا تو ثریا کے پہلو میں پناہ ڈھونڈتا۔ مریم تو اب کہیں بھی نہیں تھی۔ ایک بات بتاؤ گے شاعر؟“

حور عین نے یکایک سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میں جو بہت دھیان سے اسے سن رہا تھا ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ نور اور میرا جیسی عورتوں میں مرد کے لیے کیا کشش ہوتی ہے؟ کیا بات ہوتی ہے ان میں جو مریم جیسی خوبصورت اور صابر عورت اور ثریا جیسی طرح دار عورت میں نہیں ہوتی؟ وہ جو نہ خاندانی ہوتی ہیں نہ شریف۔“

”پتا نہیں۔“ میں گھبرا گیا۔ ”میرا اس طرح کی عورتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔“

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور سر جھکالیا اور بات وہیں سے ہی شروع کی جہاں چھوڑی تھی۔

”تو مریم سارا دن مصروف رہتی اور شام ہوتے ہی گھر وچ کی جالیوں سے جھانکنے لگتی کہ دن بھر گاؤں کی گلیوں میں گھومنے کے بعد شام کو دارو سائیں پینل تلے آکر بیٹھ جاتا تھا۔ جب ساکت۔ پتا نہیں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کے گیت بھی مریم کو رلاتے تھے اور اس کی چپ بھی اسے رلاتی۔ وہ رقیہ کے کندھے پر سر رکھے روئے چلی جاتی۔“

”مسعدی اور فرو بہت یاد آتی ہیں رقیہ اور رقیہ اس کا سر سینے سے لگائے ہوئے ہوئے چپکتی رہتی پھر۔ ایک دن جانتے ہو کیا ہوا؟“

حور عین نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”چوہدری فرید کی بڑی بہن نے اپنا دھنچا چوہدری فرید کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے کا رشتہ لائی تھی۔“

”یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی فرید بڑے! بڑی آس لے کر آئی ہوں۔“

اور چوہدری فرید نے اس کا دھنچا اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دیا۔

”اپنے ہی اپنوں کا تن دھانچتے ہیں۔“ اس نے مریم کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھی تھی۔

”میری بہن ہے اور اس کا دکھ مجھے ہی بانٹنا ہے“ غیروں کو نہیں۔“ وہ وضاحت کر رہا تھا اور مریم پھر

ہو گئی تھی۔

یہ چوہدری فرید کی وہ بہن تھی جس نے رقیہ کے بعد ہر بیٹی کی پیدائش پر چوہدری فرید کو پرسہ دیا تھا کہ بین ڈالے تھے۔ لیکن اب اپنے ذہنی معذور بیٹے کے لیے بیوی چاہیے تھی اسے۔

”یہ ظلم مت کرو۔“ مریم چوہدری فرید کے پاؤں پر گر پڑی۔

”یہ ظلم نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ اسے میں رشتہ نہیں دوں گا تو کون دے گا؟“

”کیا رقیہ؟“ میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ اس نے نچلے ہونٹ کو بری طرح جواڑوں سے کچل ڈالا۔ ”ہماری برادری میں لڑکی کی دوسری شادی کا رواج نہیں ہے۔ چاہے وہ بیوہ ہو یا مطلقہ۔ سولہ سال کی ہو یا بیس سال کی۔ اسے باقی ماندہ زندگی یوں ہی گزارنا ہوتی ہے۔“

”تو کیا راجہ؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

لیکن وہ بھیگی پلکوں کو اوڑھنی کے پلو سے پونچھتی اور ہونٹ کچلتی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے اسے سسکی سے کہا۔

”اور جس روز چوہدری فرید کی بہن گاؤں میں بتائے پانٹ رہی تھی۔ اس رات مریم پینل تلے بیٹھے دارو سائیں کے سامنے دو زانو بیٹھی زاریوں زار روئی تھی۔“

”لوگ کہتے ہیں تو سائیں ہے اللہ کا پیارا۔ میری راجہ کے لیے دعا کر۔ وہ بہت معصوم ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔ میری زبان میں تاثیر نہیں ہے دارو سائیں۔ میری دعا میں قبول نہیں ہوتی۔ تو دعا کر میری راجہ کے لیے۔“

اور دارو سائیں خالی خالی آنکھوں سے اسے نکلتا تھا۔ جیسے کچھ نہ سنتا اور سمجھتا ہو۔ بس ایک بار اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس نے مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر فوراً ہی اٹھالیا تھا اور مریم بالوں ہو کر واپس آگئی تھی اور پوری رات وہ جاگی تھی۔ کبھی اندر کبھی باہر رقیہ اس کے ساتھ جاگتی اور آنسو بہاتی تھی اور حور عین اور راجہ بے خبری کی نیند سوتی تھیں۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب مریم بے چین ہو کر صحن میں آ بیٹھی تھی اور دارو سائیں کی آواز ہوا کے دوش پر پڑتی مریم تک آئی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے دارو سائیں کی آواز سنی تھی اور دارو سائیں کی آواز میں آج جیسے بہت کرب اور درد تھا۔ یوں جیسے اس کے گلے سے لفظ نہیں آنسوؤں میں بھجکی سسکیاں نکل رہی ہوں۔

”نی میں نیل کرایاں نیلکھاں“

”میرا تن من نیل نیل“

وہ بار بار یہی دہراتا تھا اور سسکیاں لیتا تھا۔ مریم بے چین ہو کر گھڑوچی تک آئی تھی۔ لیکن باہر گھپ اندھیرا تھا۔ لباس کی رات تھی اور اس اندھیرے میں دارو سائیں نظر نہیں آتا تھا۔ بس اس کی آواز تھی جو ساعت میں سسکیوں اور آہوں کی صورت آتی۔ اور اس صبح مریم منہ اندھیرے ہی حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ گھٹنے موڑے دارو سائیں پینل تلے اونڈھاپڑا تھا۔ مریم نے دوڑ کر اسے سیدھا کیا۔ اس کا ماتھا ابولسان تھا۔

”دارا۔ دارا شکوہ!“

مریم ہاتھوں سے اور دوپٹے کے پلو سے اس کی پیشانی سے بہتا خون پونچھتی اور روئی تھی۔

”دارا شکوہ!“ وہ اس کا پورا نام لیتی تھی کہ بچپن میں دارا شکوہ کو اپنے پورے نام سے بلایا جانا پسند تھا۔

مریم بلاتی تھی اور دارو سائیں کے کانوں میں کوئی بھولی بھری آواز رس گھولتی تھی۔

”دارا شکوہ! تم نے خود کو زخمی کیا تو پھر زخم صاف نہیں کروں گی۔ کچھو نے منع کیا ہے نا درخت پر پڑھنے سے؟“

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

”مریم!“

دارا شکوہ نے اسے بلایا تھا۔ آواز دی تھی۔ مریم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور ابھی اس کی آنکھوں کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ دارو سائیں کی

آنکھیں بند ہو گئیں اور سر پیچھے ڈھلک گیا۔

”نہیں۔“ مریم اس کے بند پونٹوں پر ہاتھ رکھے اسے دوانہ وار پکارتی تھی اور اس کے کانوں میں دارو سائیں کی آواز گونجتی تھی۔

”نی میں نیل کرایاں نیلکھاں۔“

”دارو سائیں مر گیا تھا کیا؟“

میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا تو حور عین نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ جیسے اسے میری نا سمجھی پر حیرت ہوئی ہو اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی سیاہ اوڑھنی سے اچھی طرح خود کو لپیٹا اور پتھر پھلانگتی نیچے داوی کی طرف جانے لگی۔

”حور عین رکو۔ سنو مجھے تم سے کچھ کہنا تھا پلیز۔“ لیکن حور عین رکی نہیں۔ وہ میری نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی اوڑھنی کا ایک پلو پتھروں پر گھسٹا تھا۔

ایک بہت دھیان سے پڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں کچھ اضافہ بھی کرتا جا رہا تھا کہ عمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

”ارے عمر! تم۔“

ایک نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور بڑے تپاک سے اسے ملا۔ وہی ہمیشہ والی گرم جوشی اور محبت کا اظہار۔ لیکن عمر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

”کریمان“ میں سب ٹھیک ہیں؟“

”ہاں۔“ عمر نے سر ہلایا۔

”تم کچھ خاموش لگ رہے ہو عمر! خیر تو ہے نا؟“ ایک نے بغور اسے دیکھا۔

”وہ آپ ناراض ہیں ایک بھائی؟ ملانے۔“

”کچھ مت کہنا یار! میں ناراض نہیں تھا۔ بڑی تھا۔“ ایک نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

”سوری ایک بھائی! وہ۔“ عمر نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

”کہنا، کچھ مت کہنا۔ ایسا کچھ نہیں ہے جس کے لیے تمہیں سوری کرنے کی ضرورت ہے۔“ ایک نے محبت سے اس کے بال بکھرائے۔

”باباجان بہت اداس ہیں اور آپ کو پتا ہے۔ انہوں نے اس روز کے بعد سے سب کے ساتھ ٹیبل پر کھانا نہیں کھایا۔ کیا آپ اب کبھی ”الریان“ نہیں آئیں گے؟“ اس کی آواز بھگ رہی تھی۔

”میرے نہیں یار! تم سے یہ کس نے کہا؟ تمہیں نہیں معلوم ایک فلک شاہ کو بھی اپنے بابا کی طرح ”الریان“ سے عشق ہے۔ وہ اس سے دور نہیں ہو سکتا۔“

”نکل ”الریان“ سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دور ہو گئے۔ حالات کا کیا پتا ہوتا ہے ایک بھائی۔“ عمرید ستور سنجیدہ تھا۔

”زیادہ فلسفی بننے کی ضرورت نہیں یار۔“ ایک نے ہلکی سی اس کی ناک دبائی۔ ”چلو! ابھی چلتے ہیں میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“

”سچ ایک بھائی!“ عمر کی بھوری آنکھیں چمکنے لگیں۔

”بالکل سچ“ ایک مسکرایا اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگا۔

رائیل لاؤنج میں تھا بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں اخبار تھا۔ لیکن وہ اخبار نہیں پڑھ رہی تھی اور نہ ہی وی دیکھ رہی تھی۔ بڑے دنوں بعد وہ آج یوں لاؤنج میں آگریجے بیٹھی تھی۔ ورنہ بس کھانا لگنے کے بعد آئی اور پھر چلی جاتی تھی۔ نیچے خاموشی تھی۔

رائیل ابھی تک سب کا سامنا کرنے سے کتر رہی تھی۔ حالانکہ مونی یا مرینہ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ لیکن رائیل کو لگتا تھا جیسے وہ اب نظر اٹھا کر کبھی مونی یا مرینہ سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

پتا نہیں وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ ممانے اس طرح کی بات کیوں کی اور ایک کیا وہ کبھی اس کا سامنا کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں۔ اور کیا کبھی ایک جان پائے گا

کہ ایک شام اچانک میرے دل کی دیواروں پر یہاں وہاں ہر جگہ اس کی محبت کے چراغ جل اٹھے تھے۔ کیا نارسانی میرا مقدر ہے۔ اور کیا۔

”شوہن سے ڈسٹر اٹھائے لاؤنج میں آئی۔“

”بابی! ڈسٹنگ کر لوں؟“

”ہاں!“ رائیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ تب ہی باہر گاڑی کا مارن بجا۔

”عمر بھائی آگئے ہیں شاید۔“ شمو وروانہ کھولنے کے لیے جانے لگی۔

”کیا عمر گھر پر نہیں ہے؟ آج تو چھٹی تھی۔“ رائیل نے پوچھا۔

”ہاں! وہ کچھ دیر پہلے ہی گئے تھے۔“

گرٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ شمو اندرونی دروازہ کھولنے لگی۔ رائیل نے مڑ کر دیکھا۔ عمر کے ساتھ ایک بھی اندر آیا تھا۔ رائیل کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید اب ایک کبھی ”الریان“ نہیں آئے گا۔ لیکن وہ آگیا تھا۔ یقیناً ”عمر“ اسے لینے گیا تھا۔ شاید باباجان نے اسے بھیجا ہو۔

ایک اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھنک گیا تھا۔ لیکن پھر ”السلام علیکم“ کہتا ہوا تیزی سے عبدالرحمن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رائیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے عمر سے پوچھا۔

”کیا وہ مجھ سے خفا ہیں؟“

”ارے نہیں رانی! آپ! وہ تو ماما سے بھی خفا نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے بڑی ہیں۔ انہیں جو ہتر لگا“

انہوں نے کیا۔ وہ ایسے ہی ہیں گرٹ ”رانی“ سے بات کر کے وہ بھی ایک کے پیچھے لپکا۔ جہاں عبدالرحمن شاہ اسے گلے لگائے کہہ رہے تھے۔

”بہت افسرہ تھا تمہارے لیے ابھی میں اور شانی تمہاری طرف ہی آرہے تھے۔“

”مسوری باباجان! بس بہت بڑی ہو گیا تھا میں۔“ وہ شرمندہ ہوا اور احسان شاہ کو سلام کیلے۔ جو بیلے کے

پاس ہی کرسی پر بیٹھے بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آج پہلی بار انہوں نے اسے غور سے دیکھا تھا اور آج پہلی بار ہی انہیں احساس ہوا تھا کہ موی کا بیٹا کتنی حرا نگر شخصیت کا مالک ہے۔

وہ ایک دم ہی اٹھے اور عمر احسان شاہ کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا دیا۔

”تو بیٹا بھی ایک فلک شاہ کے فین ہو گئے۔“

”اُدھر میرے پاس بیٹھو ایک۔“ عبدالرحمن شاہ نے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنائی اور عمر کی طرف دیکھا۔

”تم کیوں کھڑے ہو عمر؟ بیٹھ جاؤ۔“ عمر احسان حیرت زدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی احسان شاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اس سے بے نیاز ایک کی طرف متوجہ تھے۔

”باباجان! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ایک شکل و صورت میں سلجوق انگل سے ملتا ہے اور عادت و مزاج میں بالکل مونی ہے۔“

”ہاں! لیکن اس میں جو صبر اور تحمل ہے، وہ موی میں نہیں تھا۔ موی بہت جلد غصے میں آجاتا تھا۔“

”ہاں! لیکن کبھی کبھی۔“ احسان شاہ مسکرائے۔

”لیکن یہ کبھی کبھی کا غصہ بہت نقصان کر گیا ہمارا۔“

”باباجان!“ احسان شاہ شرمندہ ہوئے ”غلطی میری تھی۔ میں نے اسے غصہ دلایا۔ میں اس کے لیے کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا کہ ابا جان۔“

”جو ہوا سو ہوا۔ اب تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی تو میں بہت خوش ہوں۔ ورنہ یہ دکھ لے کر قبر میں جاتا۔“

”باباجان!“ احسان شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”بس اب رانی باتوں کا ذکر کبھی مت کرنا۔ خواجواہ تکلیف ہوگی، تمہیں بھی اور موی کو بھی۔“

”آپ کو کیا پتا باباجان میرے اندر کتنے گہرے زخم ہو گئے ہیں۔ میری محبت مر گئی اور میں کس اذیت سے گزار رہا ہوں۔“ انہوں نے خود پر قابو پا کر ایک کی

طرف دیکھا۔

”موی مجھے بہت پیارا تھا۔ میرے دل کے سب سے زیادہ قریب۔ پھر ہمارے درمیان ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی اور میں اس سے ناراض ہو گیا۔ حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ میں موی سے ناراض تھا۔ اس لیے جب تم موی کے ساتھ ”الریان“ آئے تو میں نے تمہاری طرف کبھی دھیان سے دیکھا نہیں۔ حالانکہ عمر تمہارا بہت ذکر کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی دیوانہ ہے تمہارا۔ جیسے میں موی کا تھا۔“

انہوں نے مسکرا کر عمر کی طرف دیکھا تو عمر شرمایا۔

”میرا یہ بیٹا بہت حساس اور نرم دل ہے۔“ وہ عمر کی طرف متوجہ ہوئے ایک بھی مسکرا دیا۔

”ایک بیٹا! عمو اور موی کیسے ہیں؟ کل سے اس سے بات ہی نہیں ہوئی۔“

”بابا اور ماما بالکل ٹھیک ہیں اور بہت خوش بھی۔“

جب سے احسان انگل ان سے مل کر آئے ہیں خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔“

”تو پچھلے دنوں جو بابا غائب ہوئے تھے دو دن کے لیے تو بہاول پور گئے تھے اور ہم سمجھ رہے تھے اسلام آباد گئے ہیں۔“

”احسان انگل! میں بہت ممنون ہوں آپ کا۔ اس خوشی کے لیے جو آپ نے بابا کو دی۔ میں بابا کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اپنی بے بسی مجھے اذیت دیتی تھی۔ بہت شکریہ احسان انگل!“

”بعض اوقات ہماری چھوٹی چھوٹی غلطیاں معمولی غلط فہمیاں ہیں ایک دوسرے سے کتنا دور لے جاتی ہیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کاش! ہم اس موڑ پر رک کر ٹھہر کر سوچ لیتے۔ سمجھ لیتے۔ ہم پھر اور بے حس کیوں ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے پیاروں کی بات کیوں نہیں سنی۔“

”احسان شاہ افسرہ ہو رہے تھے۔ عمر شاہ چپکے سے اٹھا۔ تاکہ لاؤنج میں بیٹھی رائیل کو اس انقلاب کی خبر دے۔ یعنی بابا نہ صرف یہ کہ ایک سے بات کر رہے تھے۔ بلکہ وہ بہاول پور کا چکر بھی لگا آئے تھے اور انہوں

نے ایک کو گلے بھی لگایا تھا اور اس کی پیشانی بھی چومی تھی۔ واؤ۔

لاؤنج خالی تھا۔ رائیل شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ دوبارہ عبدالرحمن شاہ کے کمرے میں جانے کے بجائے وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا اور ایک کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک باہر نکلا۔

”او کے عمر! میں چلتا ہوں۔“

”ارے! اتنی جلدی؟“ عمر کھڑا ہو گیا۔

”کچھ کام تھیا رابہ! یہ ہمدان کیا سو رہا ہے ابھی تک؟“

”نہیں! وہ تو اسٹڈی میں تھے۔ آج کل اسلامی کتب کے مطالعے کا شوق چڑھا ہے انہیں۔ آپ رکیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں۔ ورنہ ناراض ہوں گے مجھ سے کہ آپ کے آنے کا بتایا نہیں۔“ وہ تیزی سے بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

”پتا نہیں ارب فاطمہ واپس آئی ہے یا ابھی تک گاؤں میں ہی ہے۔“ ایک نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے سوچا۔

تب ہی منیبہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ارب فاطمہ نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں جو وہ مرینہ کو دینے جا رہی تھی۔ ایک کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”یقیناً دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“ اس نے سوچا اور ارب فاطمہ کی طرف بڑھا۔

”کیسی ہیں ارب فاطمہ اور اماں کیسی ہیں؟“

”اماں ٹھیک ہیں۔“

ایک نے بغور اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور پریشان لگ رہی تھی۔

”کیا بات ہے ارب فاطمہ! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”آپ پارک میں چلیں۔ میں وہیں آرہی ہوں۔ ضروری بات کرنا ہے۔ یہاں کیسے کروں۔ ماہہ آنٹی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی۔“ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتی ہیں تو۔“

ایک پریشان سا ہو گیا تھا۔ یقیناً ”کوئی ایسی بات تھی۔ ورنہ ارب فاطمہ کو اس طرح کہیں باہر جا کر بات کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔“

”نہیں اس کے والدین نے اس کی شادی تو طے نہیں کر دی۔“

وہ مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ ایک رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے ہمدان کا انتظار کرنا تھا۔ ہمدان آیا تو وہ اس سے مل کر فوراً ہی ”الریان“ سے نکل آیا۔ ہمدان اسے روکتا ہی رہ گیا۔ مرینہ کے کمرے سے باہر نکل کر منیبہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ارب فاطمہ نے اسے باہر نکلتے دیکھا اور کمرے میں جا کر الماری سے چادر نکالی۔ منیبہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”بس یہ ذرا مدنی بک ڈپو تک جا رہی ہوں۔ کچھ پیپر ز وغیرہ خریدنے ہیں۔“

”یاسین کو کہہ دیتیں۔“

”نہیں۔ مجھے خود دیکھ کر لینے ہیں۔ کچھ بال پوائنٹ بھی لینے ہیں۔“ وہ منیبہ کی بات کا جواب دے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

رائیل اپنے بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جب ماہہ نے بیڑھیوں کے پاس سے اسے آواز دی اور پھر جواب نہ پا کر خود ہی بیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں آئیں۔ رائیل نے جلدی سے آنکھیں پر پٹی چسپائی۔

”کیا ہوا رابی بیٹا! تم رو رہی تھیں؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔

”کچھ نہیں ماما! ایسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔“

پتا نہیں یہ سرد رویوں ہو جاتا ہے۔ تمہیں کیا بھی تھا کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کروا لیتے ہیں۔ لیکن تم مانتی ہی نہیں ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے ماما! جو ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔“

بس نیند پوری نہیں ہوئی میری۔“

”چلو! ٹھیک ہے۔ پھر تم آرام کرو۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی تھی۔ یہ بیڈ روم سلپر لیے تھے واپس کرنے ہیں۔ تم بھی کہہ رہی تھیں چپل لینے کو تو میں نے کہا ساتھ لے چلوں۔“

”نہیں ماما! مجھے یہاں اس مارکیٹ سے چپل نہیں لینے تھے۔“

”اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو انتظار کے بعد ذرا روٹی کی طرف چلیں گے۔“

”مل تو لیا تھا اس دن۔ اب کیا کروں گی جا کر؟“

”میں چاہ رہی تھی تم اس کے بیٹے سے بھی مل لو۔ دراصل روٹی کی باتوں سے لگا تھا مجھے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ ہمدان تمہیں پسند نہیں۔ طاہر کے لیے تم نے انکار کر دیا تو اب۔“

”ماما پلیز۔“ وہ بے زار ہوئی۔

”میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں اب۔“

”مجھے تمہارا یہ انداز بالکل بھی پسند نہیں ہے رابی! میں ان چند ماہ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بہر حال فیصلہ کرنا ہو گا۔“ رائیل نے کچھ جواب نہیں دیا۔

”ایک تو تمہارے پاپا کا موڈ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ جب سے اسلام آباد سے واپس آئے ہیں۔ پاپا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔“ وہ بیڑھا میں اور رائیل کی طرف دیکھا۔

”میں دو تین روز میں روٹی کی فیملی کو افطاری پر بلوا رہی ہوں۔ تم اچھی طرح دیکھ لو۔ پرکھ لو طاہر تو دیکھا بھلا ہے۔ بہر حال ہمیں تمہارا فیصلہ قبول ہو گا جسے بھی پسند کر لو۔“

”کیا واقعی ماما؟“

”ہاں! زندگی تم نے گزارنی ہے، میری جان! تو فیصلہ بھی تمہارا ہی ہو گا۔“

”ٹھیک ہے ماما! رائیل لیٹ گئی۔

”میں آج تمہارے بابا جان اور پاپا سے بات کر کے

روٹی کی فیملی کو انوائسٹ کرتی ہوں۔“

وہ ایک بار پھر رائیل کو سونے کی تاکید کر کے کمرے سے نکل آئیں۔

☆ ☆ ☆

ایک نے پارک کے پچھلے دروازے کی طرف گاڑی پارک کی تھی اور اسی دروازے سے پارک میں داخل ہوا تھا۔ دوپہر کے ایک بجے پارک سنبھل رہا تھا۔ شاید رمضان کی وجہ سے۔ ورنہ اتنی ویرانی تو کبھی بھی نہیں ہوتی تھی۔ دوپہر میں بھی چند ایک بچے نظر آ جاتے تھے۔ وہ اسی جگہ پر بیچ کے پاس کھڑا دھوا دھر دیکھ رہا تھا۔ جب ارب فاطمہ نے دوسرے گیٹ سے پارک میں قدم رکھا اور ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اسی بیچ کی طرف آرہی تھی کہ اس کی نظر ایک پر پڑی جو بے چین ہو کر ایک قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”سب ٹھیک ہے نا ارب فاطمہ! میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ اچانک آپ کی والدہ کو کیا ہو گیا تھا۔“

”کچھ نہیں۔“ اس نے بیچ پر بیٹھتے ہوئے ایک کی طرف دیکھا۔ ”اسفند بھائی نے جھوٹ بولا تھا۔ لال کو بتائے بغیر وہ مجھے لینے آئے تھے۔“

وہ اپنی انگلی پر چادر کا پلو لپیٹتی بے حد مضطرب سی نظر آرہی تھی۔

”کیا ہوا ارب فاطمہ پلیز۔ کچھ بولیں ورنہ میرا دل رک جائے گا۔“ اور تب ارب فاطمہ نے ساری بات بتادی۔

”نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ارب فاطمہ! میں نے صرف آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچا۔ آپ سے پہلے میں نے کبھی کسی کے لیے اس طرح نہیں سوچا، لیکن میں آج ہی ماما سے بات کرتا ہوں وہ مرودہ پچھو سے بات کرتی ہیں۔ اب ڈائریکٹ جانا مناسب نہیں لگتا۔ تمہارے بابا اور بھائی انکار ہی نہ کریں۔ مرودہ پچھو سے ہی بات کرنا مناسب ہو گا۔ کیا خیال ہے۔“

ارباب فاطمہ نے سر ہلادیا، لیکن اس کی بھیگی پلکوں نے ایک کو بے چین کیا۔
 ”ارباب فاطمہ! میں آپ کو نہیں کھوسکتا۔ آپ میرا یقین رکھیے گا ہمیشہ۔ میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو مجھے فون کر دیجئے گا کسی پی سی او سے۔ میں۔“
 ”پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ ارباب فاطمہ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ ”مجھے لگتا ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا جیسا ہم نے چاہا۔ کاش میرے دل میں بھی آپ کا خیال نہ آتا اور ابا اباں جہاں چاہتے جس کے ساتھ چاہتے مجھے رخصت کر دیتے۔ لیکن اب نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کسے آپ کا خیال دل سے نکالوں گی۔ میں جھوٹی زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ تو اس دوسرے شخص کو دھوکا دینے والی بات ہوتی تا کہ آپ کے دل میں کوئی اور ہو اور آپ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں۔“

آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے انگلیوں سے پونچھنے کی خواہش دل میں چھپائے ایک اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”پلیز ارباب فاطمہ! رویئے مت۔ مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگا ہے۔ آپ کو چاہ کر آپ کی تمنا کر کے میں نے آپ کو تکلیف دی۔ کاش میں بھی ہوی کی طرح سب کچھ دل میں رکھتا اور ایک دن اچانک آپ کے گھر اپنے والدین کو بھیج دیتا۔“

ارباب فاطمہ جو اس کے اس طرح قریب بیٹھنے پر گھبرا گئی تھی اس نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”نہیں۔ آپ نے مجھے تکلیف نہیں دی۔ محبت تکلیف نہیں ہوتی میں تو اپنی نظموں میں معتبر ہو گئی تھی۔ لیکن۔“

اور وہ جو بہت کچھ کہنے کی خواہش میں بیٹھا تھا۔ سب دل میں چھپا کر کھڑا ہو گیا اور ارباب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے ارباب فاطمہ! آپ اب جائیں۔ یہاں زیادہ دیر تک آپ کا رہنا مناسب نہیں ہے اور آنسو پونچھ لیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ وہ یقیناً بہتر کرے گا۔“

ارباب فاطمہ نے چادر کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور ایک کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی سر جھکا لیا۔ ایک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”اللہ حافظ ارباب فاطمہ! آپ جانتی ہیں نا آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔“

ارباب فاطمہ نے سر ہلایا اور سر جھکائے گیٹ کی طرف چل دی۔ چند لمحے ایک وہاں ہی کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا پھر پلٹ کر دوسرے گیٹ کی طرف چل دیا۔



مانہ مارکیٹ سے جوتا تبدیل کر کے ”الریان“ کی طرف جا رہی تھیں کہ انہوں نے ارباب فاطمہ کی پارک سے نکلتے دیکھا۔ یہ اس پر یہاں پارک میں کیا کرنے آئی ہے۔ کیا کسی لڑکے سے ملنے؟ کیا خبریوں کی طرح اس نے بھی دوستیاں بنا رکھی ہوں۔“

مانہ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں اور ارباب فاطمہ کو سر جھکائے پارک سے نکل کر سڑک کر اس کرتے اور پھر مدنی بک ڈپو میں داخل ہوتے دیکھتی رہیں۔ جوں ہی ارباب دکان میں داخل ہوئی۔ وہ تیزی سے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھیں اور پارک میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

پارک ویران پڑا تھا۔ اس پاس کوئی نہیں تھا۔ غبارے اور قلفی بیچنے والے لڑکے بھی جو اکثر دوسروں میں یہاں ہی ہوتے تھے نظر نہیں آ رہے تھے حتیٰ کہ وہ نشی بھی نہیں جو دن رات درخت کے نیچے پڑا رہتا تھا۔

”پھر ارباب فاطمہ بھری دوسرے میں یہاں کیا کر رہی تھی۔“
 وہ سوچتی ہوئی پارک سے باہر آئیں۔ یقیناً کسی سے

ملنے ہی آئی ہوگی۔ مانہ کو پورا یقین تھا۔
 ”ممنی کو ضرور پتا ہوگا اگر کسی کے ساتھ اس کا چکر ہے تو۔ ہر وقت اسی کے ساتھ رہتی ہے ضرور اسے بتایا ہوگا۔“

وہ بول ہی ارباب فاطمہ کے متعلق سوچتی الریان میں داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رکے بغیر اپنے کمرے میں آئیں۔

احسان شاہ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مانہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو شانی؟“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ لیکن احسان شاہ نے جواب دے بغیر دوسری دراز کھولی اور اس میں پڑی فائل نکال کر کاغذات چیک کرنے لگے۔

”آخر ایسا کیا ہو گیا ہے شانی کہ تم نے اپنا موڈ خراب کر رکھا ہے۔ تین دن سے تم کمرے میں نہیں آئے۔ بابا جان کے کمرے میں ڈیرا بھاڑا کھا ہے اور اب مجھ سے بات کرنا تو درکنار میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہو۔ حالانکہ تمہارے اسلام آیا جانے سے پہلے میں نے تم سے سوری کر لیا تھا اور تم نے میری بات کچھ بھی لی تھی کہ میں ہاں ہوں اس کی۔ برے بھلے کی تمیز بتانا میرا فرض ہے، لیکن پھر آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے مجھ سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔“

”گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے مانہ حسن! یہ ایک جھٹکے سے مڑے تھے۔“ غلطی میں نے کی تھی جو تمہاری باتوں میں آگیا اور تمہارا اعتبار کیا۔ وہ یہاں رہتا تھا مانہ حسن! یہاں۔“

انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔
 ”لیکن تمہارا یقین کر کے اسے نوچ کر پھینک دیا میں نے اس دل سے۔“

”صاف بات کرو شانی!“ مانہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

”نجان مت بنو مانہ! تم جانتی ہو۔ تم نے کیا کھیل

کھیلنا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں تمہاری چال میں آگیا اور نہ جانے کب تک دھوکے میں رہتا جو تم روٹی سے دل کی بات نہ کر سکتے۔“

مانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ یہ کیا ہوا تھا۔ کیسے کب احسان شاہ نے ان کی اور روٹی کی بات سن لی تھی۔ کتنا غلط ہوا تھا۔ سب رائیگاں چلا گیا۔

ساری عمر ایک دھوکے میں گزار دی میں نے۔ یہ اذیت ایک خجری طرح گزری ہے یہاں۔ یہاں۔“
 انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

”تم جو یہاں اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو تو صرف اس لیے کہ میرے بچوں کی ماں ہو اور میں انہیں بے بھرم نہیں کرنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے سر جھکیں اور انہیں علم ہو کہ ان کی ماں کس قدر فریبی عورت ہے۔“

”شانی۔“

”مت کو کچھ مانہ حسین! تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔ میں تم سے بات کرنا تو درکنار تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔ اپنے بچوں کی خاطر اور الریان کی عزت کی خاطر تمہارے جیسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن پر لعنت کی گئی ہے اور جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹی تمہت لگانے والی عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے۔ تم نے جھوٹ بولا۔ بہتان لگایا، مجھے دھوکا دیا مانہ حسن۔ اور۔“

”شانی۔“ مانہ کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ ”میری بات سنو۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ میں تو وہ یوں ہی مذاق۔“

احسان شاہ نے ایک تنفر بھری نظر ان پر ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے اور مانہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دونوں ہاتھ گود میں دھرے فلکست خورہ سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ باڈی الٹ گئی تھی۔ وہ تو ابھی فلک شاہ کو اور سزا دینا چاہتی تھیں اور

ذلیل کرنا چاہتی تھیں۔ ایک کے ذریعے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کس طرح کیا کریں کہ ایک اور فلک شاہ کو الریان کے ہر فرد کی نگاہوں سے گرا دیں۔ لیکن وہ خود احسان شاہ کی نظروں میں گر گئی تھیں۔ وہ اس الٹی بازی کو کیسے اپنے حق میں کریں۔ ہاتھ گود میں رکھے وہ سوچ میں گم ہو گئیں۔ کوئی تدبیر کوئی طریقہ ایسا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ احسان شاہ بھی۔ کتنی شدید محبت کی تھی احسان شاہ نے اور چند لمحے پہلے ان محبت برساتی آنکھوں سے کتنی نفرت جھلک رہی تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے ایک جھرجھری سی لی مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ کچھ ایسا کہ احسان شاہ کا دل پھر میری طرف پلٹ آئے۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رائیل اندر آئی۔ وہ فریض ہو کر آئی تھی۔ مائہ نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پریشان ہو کر سوچا۔ ”کیا اس نے جان لیا ہے۔ کیا احسان نے اسے بتا دیا ہے کہ۔ لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ بچوں کو بتا چلے کہ۔“

”مما! کیا ہوا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آپ جوتے تبدیل کرنے نہیں گئیں؟“ رائیل پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ چونکیں۔ ”جوتے تبدیل کر لیے ہیں۔ یہ اسی اپنی مارکیٹ میں سے ہی لیے تھے۔ تمہارا سرور؟“

”ٹھیک ہے ممما! رائیل ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”کہیں جارہی ہو؟“

”نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا۔ آپ خواجوا تزدونہ کریں۔ اگر روپی آئی کی فیملی کو صرف اس لیے بلا رہی ہیں تو مجھے ان کے بیٹے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں محض دوست سمجھ کر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”رائی! ادھر دیکھو میری طرف۔“ مائہ نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی پریشانی بھول گئیں۔

”اس روز تم کہہ رہی تھیں کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا واقعی تم کسی اور کو۔“

رائیل کی نظریں جھک گئیں۔

”کون ہے وہ؟“ مائہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے ممما۔“

”فرق پڑتا ہے رائی! اگر وہ اس قابل ہے کہ احسان شاہ کا داماد بن سکے تو پھر بتاؤ۔ ہمیں تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہوگی۔“

”وہ اس قابل ہو بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اسے پسند نہ کریں گی؟ وہ افسردہ ہوئی۔

”ہیلیاں مت بھگواؤ رائی! مائہ نے ابھی ابھی نظروں سے اسے دیکھا۔ دل میں کسی وہم نے پیچھے گاڑے۔

”ایک۔ ممما! میں ایک کو پسند کرتی ہوں۔“

رائیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”ایک۔“ مائہ کی آواز بلند ہوئی۔ ”تمہارا دل تو ٹھیک ہے رائیل۔“

”مما! آپ نے میری پسند پوچھی تھی۔ میں نے آپ کو بتا دی۔ اب خواجوا چلا میں مت۔“

”یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ تمہاری شادی ایک سے ہو سکتی ہے۔“

”کیوں ایک میں کیا برائی ہے؟“ رائیل نے سوالیہ نظروں سے مائہ کی طرف دیکھا۔ ”صرف اس لیے کہ وہ عمارہ پھپھو کا بیٹا ہے اور آپ کو ان سے روایتی مندر بھابھی والا جلایا ہے۔“

”ہاں ہے جلایا۔ پھر؟“ مائہ ضبط کھوتی جا رہی تھیں۔ یہ دوسرا بڑا دھچکا تھا جو ان چند گھنٹوں میں انہیں لگا تھا۔

مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ وہ تمہیں اپنے جال میں پھنسا لے گا اور تم اس کے جال میں پھنس جاؤ گی۔“

”مما پلیز۔ غلط الزام مت لگائیں۔“ رائیل نے ان کی بات کٹ دی۔

”ایک مجھے پسند نہیں کرتا۔ میں اسے پسند کرتی ہوں اور اسے تو اس کی خبر تک نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ کبھی مجھے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ آپ اپنے مفروضے اپنے پاس رکھیں۔ وہ آپ کی بیٹی کو اس طرح پسند نہیں کرنا چاہیے میں کرتی ہوں وہ صرف میری عزت کرتا ہے۔ کیونکہ میں اس کے ماموں کی بیٹی ہوں۔“

اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آواز بھرا گئی۔ مائہ کو لگا جیسے رائیل کی جگہ وہ ہوں اور فلک شاہ کی ایک طرف محبت میں مبتلا ہوں اور فلک شاہ ان کی طرف دیکھتا تک نہ ہو۔ یکایک ان کے دل میں رائیل کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔

”وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ تم جو الریان کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔ ہے کوئی الریان میں تم جیسی۔ ایسا نہیں ہو سکتا رائی! وہ تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنی اہمیت جتانے کے لیے ایسا کرتا ہو گا۔“

”وہ ایسا نہیں ہے ممما! اسے اپنی اہمیت جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اسے ایک پرانی بات یاد آئی تھی۔ پتا نہیں کس نے کہا تھا۔ شاید موی نے یا پھر عمر نے کہ اسے اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات۔

”جو بھی ہو میں سمجھی بھی عمارہ اور فلک شاہ کے بیٹے سے تمہیں شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

مائہ کو پھر خیال آیا تھا کہ ایک فلک شاہ اس فلک شاہ کا بیٹا ہے جس نے ان کی محبت کو ٹھکرایا تھا۔

ایک افسردہ سی مسکراہٹ رائیل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو اور پروپوزل دیا ہو اس نے میرا۔“ تلخی سے کہتی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اور مائہ نے باہر جاتی رائیل کو دیکھ کر دکھ سے سوچا۔

تو کیا میری طرح میری بیٹی کے مقدر میں بھی نارسائی ہے۔ ”نہیں میری بیٹی، میری طرح نارسا نہیں رہے گی۔ مجھے کچھ کرنا ہو گا۔ کچھ ایسا کہ رائیل کے دل سے ایک فلک شاہ کا خیال نکل جائے۔“

”کیا میرے دل سے فلک شاہ کا خیال نکل گیا ہے؟“

انہوں نے خود سے پوچھا تو جواب نفی میں تھا۔ آج بھی یہ احساس ان کے دل میں کچھ کے لگا تھا کہ فلک شاہ نے انہیں اور ان کی محبت کو ٹھکرایا تھا تو کیا رائی بھی۔ نہیں انہوں نے خود ہی تردید کی۔ محض وقتی پسندیدگی ہے۔ ورنہ چند دن پہلے تک تو وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ سو جلد ہی ایک کا خیال اس کے دل سے نکل جائے گا۔ انہوں نے خود کو یقین دلایا اور مطمئن ہو گئیں۔ لیکن جلد ہی ان کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ انہیں یاد آ گیا کہ احسان شاہ ابھی ابھی کیا کہہ کر گئے تھے۔

کس بری طرح انہوں نے انہیں جھٹک دیا تھا۔ ہر رشتے کو توڑ دیا تھا۔ وہ نہ ان کے لیے بیوی رہی تھیں نہ محبت۔

وہ صرف اب ان کے بچوں کی ماں تھیں۔ کتنا صاف صاف کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وہ اب ساری زندگی ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ مجبور ہیں۔ الریان کی عزت اور بچوں کی وجہ سے۔

انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

بہت برا ہوا تھا۔ کاش روپی ان کے گھر نہ آئی اور گھر آئی ہی تھی تو وہ احتیاط کرتیں۔

اب کیا کریں ایسا کہ احسان شاہ کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے۔ کیا کہیں کچھ بھی کہنا ہے کار ہو گا۔ انہوں نے جو کچھ اپنے کانوں سے سنا۔ وہ انہیں جھٹلا نہیں سکتیں۔ پھر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں۔ وہ نرم دل ہیں۔ ان سے محبت نہیں عشق کرتے ہیں۔ پھر وہ ان کے بچوں کی ماں ہیں۔ اس حوالے سے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور ہے۔ وہ انہیں اور پھر بیٹھ گئیں۔



مسترتوں کی نوید سب کو
رہے مبارک یہ عید سب کو

انہیں بھی جو تنہا جی رہے ہیں
انہیں بھی جو مل کے مل رہے ہیں
تمام مردوں کو، عورتوں کو
سبھی جوانوں کو، بالکوں کو

یہ عید بھی سچ گئی ہے ان بھتی چوڑیوں سے
جولہ کیاں ہاتھ بھر کے بہنیں
چھٹکتی ان پائلوں کے دم سے
جوان کے پاؤں میں بج اٹھی ہیں
دھنک کے رنگوں کے آنچلوں سے
جنہیں سنبھلے، دیکھتے چہرے چمک رہے ہیں
بچانے کتنے ہی خواب ہیں جو

بھی نگاہوں میں پل رہے ہیں
تمام ہونٹوں پہ اک دعا ہے
فدا کرے یہ خوشی کی گھڑیاں
ہمیشہ سب کے قریب آئیں

سب اپنے غم آج بھول جائیں
بھلا کے سب پچھلی تلخیوں کو
کن کے بھولوں میں بھول جائیں
ہزار الفت کے گیت گائیں

عنبر بن حبیب عنبر

یہ میرا گھر جسے چھوڑ کر لوں جا رہا ہوں
کیا تھا کیوں اسے تعمیر، اب پتھر رہا ہوں

جسے آنا نہیں ہے لوٹ کر آئے گا اک دن
نہ جانے کیوں میں اپنے آپ کو سمجھا رہا ہوں

نہیں گزری یہ میری عمر بے کاری میں یونہی
جو سیکھا زندگی سے ہے وی بتلا رہا ہوں

میں اک لمبے سفر کا فاصلہ طے کرتے کرتے
بہت ہی تھک چکا ہوں اس لیے سستا رہا ہوں

وہ میرا ہے یقین آتا نہیں کیوں غوث مجھ کو
میں اپنے سامنے جو مقبرہ بنوا رہا ہوں

غوث مستقراوی

”ہاں۔“ اربب فاطمہ نے جھک کر شاپر اٹھایا۔
”تو جلدی سے نماز پڑھ کر ذرا چین میں آجاؤ۔ آج
مصطفیٰ انکل نے اپنے دوستوں کو افطاری پر بلایا
ہے۔“

اربب فاطمہ سر ہلا کر کمرے میں چلی گئی تو راتیل
بچن سے باہر آئی اور ماٹھ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
راتیل کو کوکتک سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اور اس
وقت وہ منہ بہ منہ کہہ رہی تھی۔

”کیا منہ بہ آج کا۔ میں بھی پہلپ کر اٹوں گی۔
حقیقت کی طبیعت تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”وہی جو ہمیشہ افطار پارٹی پر ہوتا ہے۔“ منہ بہ
مسکرائی اور بچن کی طرف بڑھی۔ ”آجاؤ تم بھی۔ ابھی
سے تیاری کریں گے تو کہیں وقت پر سب کچھ تیار
ہو گا۔“

”راہی! ماٹھ نے بے اختیار آواز دی۔ تو راتیل
واپس بچن میں جاتے جاتے مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

”وہ ابھی تمہاری ثانی اماں سے بات ہو رہی تھی
میری۔ اداس ہو رہی تھیں۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک
نہیں لگتی تھی۔ سوچ رہی ہوں کچھ دنوں کے لیے
رحیم یار خان چلی جاؤں۔“

”ٹھیک ہے ماما! اسے بات کی آپ نے؟“
”نہیں بس ابھی تو فون کیا تھا میں نے تمہاری
مرضی ہو تو تم بھی چلی چلو۔ کافی عرصہ سے نہیں ملتی
ہو۔ بہت یاد کر رہی تھیں تمہیں۔“ راتیل نے ایک
لحہ کے لیے سوچا۔

”ٹھیک ہے ماما! جلتے میں پھر۔“
اور ماٹھ نے اطمینان بھری سانس لی۔ یہ اچھا ہوا تھا
کہ راتیل نے انکار نہیں کیا تھا۔ ورنہ اگر وہ انکار کر دیتی
تو وہ اسے زبردستی ساتھ نہیں لے جاسکتی تھیں۔ بہت
مطمئن ہو کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

(آخری قسط آئندہ ملان شاء اللہ)

”نہیں۔ ابھی شاید وہ بلایا جان کے کمرے میں
ہوں۔ پھر بھی جب وہ اکیلے ہوں۔ اپنے بید روم میں
ہوں تو پاؤں پکڑنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔“
انہوں نے سوچا۔ لیکن جلدی نہیں ابھی وہ شاک میں
ہیں۔ غصے میں ہیں۔ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لیے
رحیم یار خان چلی جاؤں۔ دوریاں یوں بھی محبت کو
برسھائی اور جنگائی ہیں۔ اگر راتیل کو بھی ساتھ لے
جاؤں تو یوں بھی وہ فارغ ہے اب۔ وہاں بایک کا خیال
ہو سکتا ہے دل سے نکل جائے۔ طاہر سے ملے گی بات
چیت کرے گی تو شاید دل میں طاہر کا خیال پیدا
ہو جائے۔“

وہ فیصلہ کر کے اٹھیں۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں
تھی۔ لیکن بظاہر انہوں نے خود کو مطمئن کر لیا تھا اور وہ
گہرائی تک نہیں چلائی تھیں کہ احسان شاہ نے انہیں
اپنی زندگی میں شامل رکھتے ہوئے بھی اپنی زندگی سے
خارج کر دیا تھا۔

اربب فاطمہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ سارے کو
باہر آتے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہو گئی اور اس کی گود میں
رکھا شاپر پیچے کر گیا۔ ماٹھ نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی
اور پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ وہاں کے وقت پارک
میں کس سے ملنے گئی تھی کہ منہ بہ دروازہ کھول کر باہر
آئی اور اربب فاطمہ سے پوچھا۔

”تم نے دیر لگا دی رہا؟“
”ہاں۔ وہ مجھے اس تک شاپ سے نہیں ملی تھیں
مطلوبہ چیزیں تو مارکیٹ چلی گئی تھی۔“
ماٹھ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
”یعنی جھوٹ بولا جا رہا ہے۔“

انہیں یقین ہو گیا کہ اربب فاطمہ ضرور کسی سے
ملنے گئی تھی اور وہ کوئی کون ہو سکتا ہے۔ ایک لمحہ کے
لیے انہوں نے سوچا۔ لیکن اس وقت اندر سے وہ خود
ابھی ہوئی تھیں اور اربب فاطمہ سے بات کرنے کا
کوئی موڑ نہیں تھا۔

”تم کو ظہر کی نماز پڑھنی ہوگی ابھی؟“ منہ بہ اس
سے پوچھ رہی تھی۔



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن سرجین فرماتے ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں
حضرت ابوذر سے محبت کرتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔

”کیا تم نے ان کو یہ بات بتادی ہے؟“

میں نے کہا ”نہیں“

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”انہیں بتادو“

پھر زبیر میری حضرت ابوذر سے ملاقات ہوئی
تو میں نے کہا۔

”مجھے آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے“ انہوں
نے جواب میں مجھے دعا دی۔

گستاخ رسولؐ

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک سے گستاخ
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دریافت کیا تو آپ نے
فرمایا۔

”اس امت کے باقی رہنے کا کیا جواز ہے کہ جس
کے نبی کی توہین کر دی جائے؟“

(کتاب الشفا - عیاض المالکی)

حضرت علیؑ نے فرمایا،

جو بندہ کسی سے جتنی محبت کرتا ہے، اتنی نفرت
بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایک خوبصورت شیشہ جب
ٹوٹتا ہے تو ایک خطرناک پتیلہ بن جاتا ہے۔

اگر کسی انسان کے دل میں اپنا مقام دیکھنا چاہو تو
اُس کو غصے میں دیکھو، اپنے لیے اس کے الفاظ میں
لو اپنا مقام جان لو گے۔

ساریہ چوہدری۔ ڈوگرہ گجرات

نیک کی کر...

جنگل میں ایک خوبصورت لیکن بزدل چیتے کا ایک
شیر دوست بن گیا۔ چیتا ایک شیرنی کو بہت پسند کرتا
تھا۔ اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ ایک دن اس
نے اپنی خواہش کا اظہار شیرنی سے کیا تو اس نے کہا کہ میں
اس شرط پر تم سے شادی کروں گی اگر تم میرے لیے ہرن
کا شکار کر کے لاؤ۔ چیتا بے چارہ محبت سے مجبور تھا لہذا
مان گیا۔

اس نے اپنے دوست شیر کو یہ ماجرا سنایا تو اس
نے دوستی کی وجہ سے ایک ہرن شکار کر کے چیتے کے حوالے
کر دیا۔ شیرنی نے بظاہر چیتے کی بہادری دیکھ کر اس سے
شادی کر لی۔

پورے جنگل میں شادی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں
مگر شکار کرنے والا شیر بہت آداس پشیمان تھا۔ ایک ہاتھی
نے شیر سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

”نیک بھی دیکھ بھال کر کرنا چاہیے۔ بزدل چیتے کی
شادی کروانے میں میں نے اس کی مدد کی اور وہ محبت
میرا ہی بہنوئی بن گیا ہے“

اقرا۔ کراچی

اشارہ کافی ہے،

سینئر صاحب ارب پی تھے۔ انہوں نے عزت میں

جمل لیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچے تھے۔
ایک رات ایک اخباری نمائندہ ان سے انٹرویو لینے
آیا۔

سینئر صاحب! سب سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے
اپنی ترقی کیسے کی اور اتنے دولت مند کیسے بنے؟ ”نمائندہ
نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ایک لمبی کہانی ہے“ سینئر صاحب طویل سانس
لے کر بولے۔ ”جب تک میں آپ کو یہ کہانی سناتا ہوں
تب تک کے لیے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب جلا
دیتا ہوں۔ بات حجت کا کیا ہے، وہ تو زیرو کے بلب کی
روشنی میں بھی کی جاسکتی ہے“ یہ کہہ کر سینئر صاحب اپنے
اور انہوں نے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب روشن
کر دیا۔

تب اخباری نمائندہ بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے
بولے۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے“ سینئر صاحب اس میں کچھ گیا
کہ آپ دولت مند کس طرح ہوئے ہوں گے۔ اب آپ
کو اپنی آپ بیتی سنانے کی ضرورت نہیں ہے یا یہ کہہ
کر وہ ان سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر مفکرین کی نظر میں،

۱۔ ڈاکٹر دنیا میں ایسا شخص ہے جسے لوگوں کی اچھی محبت
سے تکلیف پہنچتی ہے۔ (مارشل)

۲۔ نوجوان ڈاکٹر اور بوڑھے خجّام سے ہوشیار رہنا
چاہیے۔ (بینچمن فرینکلن)

۳۔ ڈاکٹر دل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اپنے بیماروں
سے اور دوسرے وہ جو اپنی زبانوں سے پریشانی
کرتے ہیں۔ (ولیم اوسٹر)

۴۔ ڈاکٹر اس کو کہتے ہیں جو نسخہ لکھتا رہتا ہے تاوقتیکہ مریض
مر نہ جائے یا قاعدی طور پر اچھا ہو جائے۔ (جان ہشلر)

۵۔ اس کو پریکٹس کہتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اس
نے تین مریضوں کا علاج کیا۔ میں ان کے جنازوں
میں شرکت کر چکا ہوں۔ (مارک ٹوئن)

نسرین اختر۔ میٹروپول

خدا گواہ

یہ بلال بن وراثت، یہ لیدران کلام
تلاش جاہ میں جو کچھ کہو وہ کر لیں
نئے جغم میں یقین ہوا اگر دولت کا
خدا گواہ کہ یہ آج خود کشی کر لیں
(رئیس امر وہوی)

وضاحت

پروفیسر صاحب نے کلاس روم میں اپنے لیکچر کے
دوران ایک لڑکے کو اذیت دیکھ کر غصے سے چلائے
ہوئے کہا۔
”تم میری کلاس میں سو نہیں سکتے“

لڑکا آنکھیں کھول کر سر اٹھاتے ہوئے قد دے
بے زاری سے بولا۔

”سو تو سکتا ہوں سر۔۔۔ بشرطیکہ آپ اتنے زود
سے نہ بولیں“

شبم شمشاد۔ یزمان

حرف

عزت نفس ادا نایں وہی فرق ہے جو فخر اور
عزور میں ہوتا ہے۔ عزت نفس اور فخر کہتا ہے کہ
میں بھی ہوں“

لیکن عزور اور انا کہتی ہے۔
”صرف میں ہی ہوں“

اور محبت اس باریک فرق کو ماپنے کا پیمانہ
ہے۔

خاموشی

اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں
تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے۔ زیادہ
برنے والا انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ رنج اور جھوٹ کو
ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ
سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

(واصف علی واصف)

نمرہ - کراچی

خوشبو جیسی باتیں،

۴ صرف بددعا میں ہی خوشیوں کے دستے بند نہیں کرتیں، بعض اوقات صبر بھی سکھ کی راہ کی دھول بن جایا کرتا ہے۔

۵ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

۶ رشتے اپنائیت کے ہوں یا غلوں کے، رستہ ہی نازک ہوتے ہیں جتنے آگینے۔ ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو ٹوٹ گئے۔ بدگمانی نے سرائٹھایا تو چلنا چور ہو گئے۔ پھر ان پر کیسا غر، کیسا مان؟

۷ زخم ہمیشہ اس سے ٹھیک ہوتا ہے جو اسے عنایت کرتا ہے اور کبھی تو یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں رہتی۔

۸ اپنے آپ سے زبردستی مت کریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔

۹ کچھ تعلق ان سے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انا ضروری ہوتی ہے۔

۱۰ خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں اور خاموشی خود ایک لاد ہے۔

۱۱ امن کی فاختہ وہیں اترتی ہے جہاں پیار، صلح اور صبر کی دھوپ پھیلتی ہو۔

آخری الفاظ،

ذیل میں کچھ لوگوں کی زندگی کے آخری الفاظ درج کیے جا رہے ہیں جو روایتی قسم کے الفاظ سے مختلف ہیں۔

۱۲ ذرا مہاجس کی تیلی جلا کر دینا۔ میں اپنی گاڑی کی تنگی دیکھنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ میٹرول ختم ہو گیا ہے۔

۱۳ بیگم! تم ہمیشہ اتنا بد مزہ کھانا کیوں بتاتی ہو؟
۱۴ ذرا یہ پستول دکھانا، کیا یہ لوڈڈ ہے؟

۱۵ میرا خیال ہے کہ میں درلوے لائن کراس کر رہی ہوں۔ نرین تو بہت معمولی رفتار سے آ رہی ہے۔
۱۶ بیگم کیا کہا تم نے تمہاری اماں ابھی چھ بیسے اور ہمارے ہاں درکس کی؟

۱۷ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ جو بوتل میں نے ابھی خالی کی ہے۔ یہ دوا کی بوتل نہیں تھی؟

۱۸ ہاں ٹھیک ہے۔ کل تم نے جس شخص کو اپنی بھوی کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا تھا، وہ میں ہی تھا۔ تو پھر کیا ہوا؟

۱۹ آں، ہاں، ہج۔ تم ٹھیک سمجھی ہو بیگم۔ ہم ہج۔ اپنی تنخواہ ہج۔ جوئے میں۔ ہج لارایا ہوں۔

۲۰ ذرا دیکھو۔ میں کس طرح قلابازی کھا کر اس پل سے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہوں اور تیرتا ہوا ساحل سے آتا ہوں۔

نہا۔ فیصل آباد

پڑتال،

کسی معروضی امتحان میں ایک طالب علم ہر سوال پر مکہ اچھالتا اور پرچے پر اس کے مطابق صلح یا غلط کا نشان لگا دیتا۔ متحین کافی دیر سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ طالب علم جب پرچہ مکمل کر چکا تو اس نے یہی سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔

متحین سے رہا نہ گیا، اب تم کیا کر رہے ہو؟
”اپنے جواب چیک کر رہا ہوں“ طالب علم نے جواب دیا۔

اقرا۔ کراچی



میری لکھی

نوال افضل گھمن گجرات نذاعروج
ہم کسی کو مجھے نہ لگا سکے
عید آئی، مگر بعید رہی
افشاں خان شاہ پور چاکر اسلم عروج ملتان
عید وہ مل رہے ہیں غیروں سے
ہم سے کہتے ہیں، مدعا کیسے
آمنہ آجالا کوثر بانو کراچی
پائے افسوس کہ دسٹا بھی کسی نے مجھ کو
آن کر عید مبارک نہ کہا عید کے دن
زوبارہ خالد لاہور
آج محفل میں پھر اکیلا ہوں
آج پھر عید آئی ہے اے دوست
سازہ ممتاز واہ کینٹ
عید کا چاند دیکھنے والے
آ، کہ میری بھی عید ہو جائے
شفق راجپوت گوجرہ
ہم نے پردیس میں کیں چاند کو تاکیدیں
ان سے کہتا کہ انہیں لاکھ مبارک عیدیں
شاہ جہاں گل مرزا پور
بے چارگی کے زخم ہیں اور بے بسی کے بھول
دامن میں اور کچھ بھی نہیں عید کے لیے
فریحہ شبیر شاہ ٹکڑ
تو ساتھ تھا تو ہر اک روز عید لگا
ہوا تو آج خفا ہے تو عید کیسے کریں
یہ عید کارڈ، یہ تحفہ تو رسم دنیا ہے
کہ آشیانہ جلا ہے تو عید کیسے کریں
سنبل ملک اعوان شاہد ملک
آئیں کبھی تو وہ بھی میری دید کے لیے
صورت کسی پہلے دیکھا پانڈ عید کے

چشم تو وسعت افلاک میں کھوئی ساعر لکھنؤ
دل نے اک اور جگہ ڈھونڈ لیا عید کا چاند
اسلم عروج ملتان
اے غم یار تجھے میری دفاؤں کی قسم!
میری آنکھوں میں ستارے نہ سجا عید کے
کوثر بانو کراچی
کچھ مسرت مزید ہو جائے
اسی بہانے سے عید ہو جائے
عید ملنے جو آپ آجائیں
میری بھی عید، عید ہو جائے
ثروت جہاں اوکلاہ
کتنے ترے ہوئے ہیں خرمیوں کو
وہ جو عیدوں کی بات کرتے ہیں
فرخ سرفراز کوٹ رادھاکش
جو شخص کھو گیا ہم سے اندھیری راہوں میں
اسی کو ڈھونڈ کے لاؤ کہ عید آئی ہے
زہرہ کمال چناب نگر
میرا چاند مسکرائے تو عید ہے عید
وہ چہرہ دکھائے تو عید ہے عید
رہتا ہے وہ بدلیوں کے اسی یار
جب سامنے آئے تو عید ہے عید
سارہ مجیب لاہور
آن کو دیکھا تو پھر اترنا نہ گیا
آسمان تک ہی رہا عید کا چاند



خالد کی ڈائری

میں تو مر گئی ہوں مگر جاہتی ہوں کہ
دوسرے سچے جیتے رہیں
ٹافیاں اوداؤں گریہ کھاتے رہیں

سمیرا یوسف

کچھ ڈائری ہے

ترکی کے انقلابی شاعر ناظم حکمت نے بیرویشیا میں
امریکا کے ہاتھوں برساتے ہوئے ذیل کے پہلے ایٹم بم کے
خلاف اس لڑکی کی زیادہ کے طویل پروہ نظم لکھی تھی جو
سوئے ہوئے انسانوں کے دل پر دستک دیتی ہے آج
پاکستان کے بے گناہ معصوم بچے امریکا کے ڈرون حملوں
کا نشانہ ہیں اور عالمی ضمیر ہی نہیں پاکستان کے نام نہاد
دانش ور بھی سو رہے ہیں۔

پیارے انگلہ!

میں بیرویشیا میں ایٹم بم سے جل کر
مر جانے والی لڑکی ہوں

میں چھوٹی ہوں اور ہمیشہ چھوٹی رہوں گی
کیونکہ مردہ بچے کبھی بڑے نہیں ہوتے

مگر میں آپ کو سننا ناچا جاہتی ہوں کہ
میں لقمہ اجل کیسے بنی

پہلے بارودی آگ سے میرے کپڑے جلے
پھر میرے بال اور اس کے بعد میرا سارا وجود

پیارے انگلہ!

بیادری آئیاں!

مجھے آکس کریم اور ٹافیاں پسند تھیں
مگر مرنے والے بچے آکس کریم اور ٹافیاں نہیں کھا سکتے

میں آپ کے در پر اس لیے دستک نہیں دے رہی
کہ مجھے ٹافیاں دیں، آکس کریم کھلائیں

میں آپ کے پاس صرف اسی لیے آئی ہوں
کہ آپ اظہارِ محبت اس جنگ کے خلاف

جو بچوں کو سختی بھرنا کھ بنا دیتی ہے

نوال افضل گھمن

کچھ ڈائری ہے

میری ڈائری میں تحریر ساجر لدھیانوی کی یہ غزل

ناہید مرزا بٹکے نام۔

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

کس لیے جیتے ہیں ہم کس لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر دوت
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ایشاء مریم
میک اپ	روز بیوی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فوزیہ سلیم۔ چیچہ وطنی

چاند نگر کا چاند جو پھڑکیا!

اس جگہ کی رات اندھیری میں اک تارہ تھا وہ ڈوب گیا! اور وعدے ساتھ نبھانے کے سب بھول بھلا کر خوب گیا! چاند نگر کے چاند کو دنیا سے گئے 20 برس مکمل ہو گئے ہیں۔ ان کی شخصیت کا جادو آج بھی اسی طرح ہے وہ زندہ ہیں دلوں میں، ذہنوں میں، اپنی تحریروں میں! ذوالقرنین بھائی کی صورت میں اور جو انہوں نے کرن کی شکل میں پودا لگایا جس کی شاخیں ہمیں آج سایہ دے رہی ہیں! وہ ناول نگار، فنانس، نگار، شاعر، مصنف، کالم نویس اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔ خلیل جبران نے کہا! ”تم میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ لیکن وہ سب دے دیتے“

ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی سخاوت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا صندوق کبھی خالی نہیں ہوتا۔“ پہلے جبران کے اس خوب صورت جملے کا عقدہ نہیں کھلا تھا جیسے کہ اب کھلا ہے۔

محمود بابر فیصل جانتے تھے سب دے دینا کیا ہوتا ہے! کیا معنی رکھتا ہے؟ کوئی اپنی ذات کی نفی کر کے کسی کو سچی خوشی نہیں دے سکتا۔ انہوں نے یہ نصیحت کام کیا! یہ ان کی سخاوت تھی کہ انہوں نے محبت دونوں ہاتھوں سے بانٹی! یہ ان کا زندگی پر یقین تھا کہ زندگی حرارت محبت اور لطف کا دوسرا نام ہے انہوں نے اسی زندگی کے یقین کو آگے بڑھایا۔ ان کی تحریروں نے تو ہمیں بہت کچھ سکھایا ہے! دعا بھی ایسی جو مسلسل سفر میں ہے! سل در نسل! علم کا ایک ذخیرہ ہے جو مستقل سلسلوں کی صورت ذوق کو تسکین دیتا ہے۔

دعائے خیر جو ان کی زندگی میں ان کی خوشیوں کے لیے کی جاتی تھی اور آج بھی دعائے خیر اب ان کے جنت میں درج جات بلند کرنے کے لیے مانگی جاتی ہے۔ وہ روشن چمکتا چاند بہت دور دور چلا گیا ہے! ان کے لیے ہمارے دلوں میں یادوں اور محبتوں اور احترام کے روشن چراغ زندہ رہیں گے۔

مبین اختر راجہ۔ سوہا وہ

میں چٹھی کلاس میں پڑھتی تھی۔ جب سے خواتین پڑھ رہی ہوں۔ اب الحمد للہ ماسٹرز کیے ہوئے بھی عرصہ بیت گیا ہے یقین کیجئے بہت دکھ ہوتا ہے یہ سن کر جب ماحول اپنی جمالت کی وجہ سے بچیوں کو خواتین پڑھنے سے روکتی ہیں۔

میں نے میٹرک سے لے کر ماسٹر تک تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے اور خواتین یا شعاع کبھی میری نصیبی سرگرمیوں پر مثنیٰ انداز سے اثر انداز نہیں ہوا بلکہ ان پرچوں نے ہمیشہ میری راہنمائی کی۔

”میرے خواب لوٹاؤ“ کی آخری قسط پڑھی۔ دہل ڈن ٹگت دی! آپ نے ہماری توقعات کے مطابق اختتام کیا۔ ٹگت سیما ”زمین کے آنسو“ کو بہت خوب صورتی سے اختتام کی جانب لے جا رہی ہیں۔ ان کی یہ تحریر ہمیں بدلتی یاد رہے گی۔

اس شمارے میں جس تحریر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے ”گل نین“ نبیلہ عزیز نے خان بابا کی گل نین تحریر کر کے قلم سے وفا کا حق ادا کر دیا۔ اس کے علاوہ افسانوں میں ”چھوٹی سی درز“ اور ”وہ میرا مہمان“ بہترین تھے۔

پیاری بہن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ میں والدین اپنی بچیوں کو خواتین، شعلے پڑھنے سے روکتے ہیں یہ جان کر ہمیں بھی افسوس ہوتا ہے حیرانی کی بات یہ ہے کہ تقریباً ہر گھر میں بیوی ہوتا ہے اور لڑکیوں کو بیوی دیکھنے کی اجازت بھی ہوتی ہے جبکہ بیوی پر تقریباً ہر چھوٹل سے خواتین اور شعاع کی کہانیاں ہی ڈرامائی تشیل کر کے پیش کی جا رہی ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نبیلہ عزیز اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

شہر ریاض، ارتقا ریاض۔ ذکر کیا ٹاؤن ملتان

مکمل ناول میں ”خان بابا کی گل نین“ نمبروں پر رہا۔ خان بابا کی موت اور گل نین کے صبر نے بہت رلایا اور حشیم خان کا کردار بہت پسند آیا۔ افسانوں میں ”چھوٹی سی درز“ نے ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیے۔ اور بلا عنوان کہانی کا مقصد ہی سمجھ میں نہ آیا۔ ”زمین کے آنسو“ زبردست چل رہا ہے۔ اس میں ایک اور ارب فاطمہ ناول کی جان ہیں۔

ج: پیاری ارتقا خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ گل نین نے صبر تو کیا ہی نہیں۔ اس نے تو حشیم خان کا گریبان پکڑ کر چیخ کر احتجاج کیا اور اسے شادی کرنا پڑی۔ صبر تو لائے کو کرنا پڑا۔ فہد مصطفیٰ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔ تمہو کا بھی شکریہ۔ تمہو۔ کہانیاں پڑھ لیں تو ان سے کہیں کہ خط بھی دی لکھیں۔

مسز نائلہ سیف رضوی۔ گاؤں چاندہ شکر گڑھ

شادی سے پہلے پابندی تھی لیکن اب میاں جانی ہر ماہ باقاعدگی سے لا کر دیتے ہیں مجھے ان رسالوں نے بہت کچھ سکھایا ہے صبر، اتحاد، محبت، اتفاق اسی لیے میاں جانی جو

کہ امام مسجد ہیں وہ بھی انہیں پسند کرتے ہیں اس ماہ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ نکمی پڑھ کر بہت ہنسی آئی کیونکہ اس معاملے میں میں بھی نکمی ہوں۔ موسٹ فیورٹ جو رکے تو عنبرہ سید بہت بہت اچھا ہے اس دفعہ کھاری کا کٹرفوٹن پڑھ کر میں کتنی دیر ہی ہنسی رہی خان بابا کی گل نین لائے کی بے وقوفی کا اس کو اچھا انجام ملا ہاں اگست کے شعاع میں ایک بہن نے پرواز گل نامی شاعرہ کی کہانی کا پوچھا تھا۔ یہ نبیلہ ابرار جہ کی تحریر تھی میں کی کریار مناواں ”جو جنوری 2011ء کے شعاع میں شائع ہوئی تھی۔

ج: پیاری نائلہ! یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے میاں جانی روشن اور کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ امام مسجد ہیں اس کے باوجود آپ کی خوشی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ آپ کو خود پرچے لا کر دیتے ہیں اور انہیں پسند بھی کرتے ہیں لائے کو بے وقوفی کی سزا نہیں ملتی۔ اگر وہ شک نہ کرتی تب بھی اس کہانی کا بھی نتیجہ نکلتا تھا۔ کسی جوان خوب صورت اور غریب لڑکی کو گھر میں پناہ دی جائے تو وہ بہت جلد گھر کی مالک بن جاتی ہے سبب کچھ بھی ہو لیکن ہم نے حقیقی زندگی میں ایسی کہانیوں کا بھی انجام دیکھا ہے۔ گل نین نے حشیم خان سے محبت تو شروع کر ہی دی تھی۔ آگ جل رہی ہو تو آج پہنچتے دیر نہیں لگتی۔ حشیم خان کو نائل ہونا ہی تھا۔ اور حشیم خان نے بھی کون سا کردار اکا ثبوت دیا بات تو تب تھی کہ جب حشیم خان گل نین کی شادی زوہیب سے کراتے جو اس کا بھرم تھا۔

ہنت خلیل۔ سمندری

شعاع اور خواتین کو پہلی دفعہ میں نے تب پڑھا جب میں ہفتہ میں تھی اور اب میں تعلیم مکمل کر چکی ہوں اور مقامی کالج میں لیکچرر کے فرائض انجام دے رہی ہوں لیکن ان کے ساتھ میرا رشتہ جوں کا توں قائم ہے۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی سے روشنیاں سمیٹیں۔ آپ کے ڈائجسٹ کا یہ سلسلہ میرے دادا جان بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

نگت عبد اللہ نے میرے خواب لوٹاؤ کو بہت جلدی میں سمیٹا (کوہ گراں تھے ہم) عنبرہ سید! یو آر گرٹ۔ بہت زبردست لکھا ہے۔ سعد جیسا کر کچھ پڑھ کر مزا آ جاتا

تکنت سیمائی معلومات بہت ضرورت ہیں۔ میں خود تاریخ پڑھاتی ہوں اور ان کے ترتیب دیے واقعات کو پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔

گل نین بہت اچھا ناول تھا۔ باقی سب سلسلے بھی بہترین تھے۔ ایک اور چھوٹی سی فرمائش شاہین رشید سے کہ ایک میوزیکل بینڈ BMW کا انٹرویو شائع کر دیں۔

ج: بنت خلیل! ہمیں اس بات پر غور ہے کہ ہماری قارئین ذہین، باشعور اور تعلیم یافتہ ہیں اور آپ تو علم کی روشنی پانت بھی رہی ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ آئندہ بھی اس محفل میں شرکت کر کے اپنی رائے سے آگاہ کیجئے گا۔

کمائی کے متعلق پتا کرنے کے لیے آپ 32721666 پر فون کر لیں۔

مسز بین اجمل۔ روٹری سکھر

شادی سے پہلے ابواس کے مخالف تھے اس لیے چاہتے ہوئے بھی کسی کمائی پر بھروسہ کر سکی۔ میں 18 سال سے خواتین پڑھ رہی ہوں اور اس میں میرے ساتھ میری امی اور چھوٹی بہن فرحین بھی شامل ہے۔ ویسے تو آپ کے رسالے میں شائع ہونے والی ساری تحریریں ہی اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل نئی رائٹرز کی وجہ سے بہت سی نئے نئے موضوعات سامنے آ رہے ہیں۔ بہت سی پرانی مصنفاتیں منظر سے غائب ہیں کیوں بھلا۔ پلیز جلدی آئیں ہم سب آپ سب کے منتظر ہیں۔

آپ آتے ہیں رسالے کی طرف تو جناب اتنے عرصے

بعد جس کمائی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے تو وہ ہے نکمت سیمائی "زمین کے آنسو" بلاشبہ ایک بہترین تحریر ہے۔ لیکن نکمت جی سے گزارش ہے کہ اگر وہ مسکند دشمن قوتوں کے بارے میں تفصیل سے الگ سے ایک ناول لکھیں تو شاید وہ ان کا ایک شاہکار ناول ہوگا۔ کیونکہ ہمارے عوام بیروں، فقیروں اور نی وی پی آنے والے ان اینکر پر سنز سے بہت متاثر ہے۔ پلیز ان تمام بہو بیوں کو سامنے لائیں ورنہ شاید آپ کے قلم کا حق ادا نہ ہو پائے۔

آخر میں آپ کو کچھ مشورے دیتے ہیں پسند آئیں تو عمل کر لیجئے گا ورنہ نہیں۔

1. آپ خطوط، کمائیاں اور مستقل سلسلوں میں شرکت کی آخری تاریخ ضرور "ہمارے نام" کے شروع میں لکھ دیں تاکہ سب کو اندازہ رہے۔

2. مستقل سلسلوں میں جو سروے وغیرہ ہیں ان کے سوالات ہر دفعہ شائع کریں چاہے چھوٹا سا کر کے ہی۔

3. شاعری پہ جی آپ کے رسالے میں چار سلسلے ہیں اگر انہیں کم کر دیا جائے تو کسی نئے سلسلہ کی جگہ بن جائے گی۔

ج: بہن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ کے خط میں کوئی غلطی نہیں بلکہ نہایت صاف ستھری موتیوں جیسی لکھائی ہے آپ کی۔ آپ کے مشورے بہت صائب ہیں ضرور عمل کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

فاطمہ شارق نے کراچی سے لکھا ہے

ستمبر کے شمارے کا سروق پسند آیا۔ آئی! ایک طویل عرصے بعد فارحہ ارشد کا نام فہرست میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ وہ میری فیورٹ رائٹرز کی فہرست میں شامل ہیں مگر۔ تحریر پڑھ کر تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ فارحہ آئی نے لکھا ہے اتنا پیچیدہ، اتنا اچھا لکھنے والی سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ خواب دیکھا اور دکھانا اچھی بات ہے کہ یہی انسان کو جینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کو ایسے خواب تو نہ دکھائیں جو انہیں کہیں کانہ رکھیں کہ اکثر لڑکیاں ان ہی کرداروں سے سیکھتی اور ان میں ہی اپنے آپ کو تلاشتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے شعوری یا لاشعوری طور پر ہی سہی۔ خالص جاگیر دارانہ نظام کا پروردہ "چھوٹے شاہ جی" کا ایک خوں بہا میں آئی لڑکی کو اتنے ناز و نعم سے "پالنا" اور اس پر ان کے والد اور خاندان کا خاموش رہنا سمجھ میں نہیں آیا۔ ان کے خاندان والوں کے لیے اس لڑکی کو ٹھکانے لگانا ہمیں آسان بات تھی پھر وہ کس مجبوری کے تحت بیٹے کی بات ماننے تلے گئے محض اکلوتا ہونا انہیں اس حد تک جھجکے پر مجبور کر سکتا تھا؟ اور معاف کیجئے گا پورے خاندان کا باغی یا یوں کہیے الگ مزاج کا حامل اگر پیدا بھی ہو جائے تو وہ کس قدر بے بس ہوتا ہے۔ میں ایسے ایک حقیقی کردار سے واقف ہوں۔ پھر لڑکی کا عین مندی والے روز ڈانس کرنا خاصا فلمی لگا۔ چند

لہجوں کو ذہن میں انجمن اور امر او جان ادا زندہ ہو گئیں اور پھر مزید یہ کہ پورے خاندان کے سامنے بیرونی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جو بڑھک ماری اور پھر بیسی اینڈ؟ بے شک خوشگوار اختتام والی کمائیاں مجھے بھی بہت پسند آتی ہیں مگر وہ منطقی بھی تو ہوں۔ آئی! میں جانتی ہوں آپ میرا خط شائع نہیں کریں گی۔ اگر کیا بھی تو کٹ پیٹ کر لیکن اس پرچے پر میرا بھی تو حق ہے ناں اور بحیثیت قاری اپنی رائے دینے اور قاری بہنوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنا بھی میں ضروری سمجھتی ہوں۔ بالی کمائیاں ابھی بڑھی نہیں۔

ج: فاطمہ شارق! آپ کا خط شامل اشاعت ہے اب تو آپ کو یقین آ گیا تاکہ ہم صرف تعریفی خط شامل نہیں کرتے تنقیدی خط بھی شامل کرتے ہیں۔

فاطمہ! کبھی کبھی خواب دیکھا اور دکھانا اچھا لگتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں فارحہ ارشد ہماری بہت اچھی لکھنے والی ہیں انہوں نے طویل عرصہ بعد دوبارہ قلم اٹھایا اور کمائی لکھی۔ یہ کمائی پڑھ کر ہمیں بھی یہی اعتراضات ہوئے تھے اور یقین کریں کہ ہم نے فارحہ کو فون کر کے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن ان کا کمنا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسے انجام پر مبنی کمائیاں لکھتی رہی ہیں۔ اس بار کچھ مختلف لکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے اس کمائی کو جوں کا توں شائع کر دیا جائے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے ورنہ ان کا اعتماد بھروسہ ہوگا۔

کسی مصنف کا کمنا ہے۔

ہم کمائی اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں جواب ہوتے ہیں۔ ہم کمائی اس لیے پڑھتے ہیں اس میں خواب ہوتے ہیں۔

آپ کا بے ساختہ اور بے لاگ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اب تک کہاں تھیں آپ؟ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا اور ہاں تنقید کرتے ہوئے بالکل نہ جھجکیں ہمیں تعریف اور تحقید یکساں اچھی لگتی ہے۔

آنسو شیر۔ ڈوگہ گجرات

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم عنیزہ سید زبردست آپ کے بارے میں پتہ چلا کہ آپ کے بچے ماشاء اللہ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ بہت بلا حاشیت ہیں اور تمام کام بہت خوش اسلوبی سے نبھا رہی

ہیں۔ "میرے خواب لوٹاؤ" واہ نکمت عبد اللہ جی آخری قسط تو بہت اچھی تھی۔ لیکن کچھ سوال ذہن میں ابھر رہے ہیں میر کا کیا بنا؟ تاجور کا کیا بنا؟ "چھوٹی سی درز" غزالہ فرخ کیا افسانہ لکھا ہے زبردست!

ج: پیاری آنسو! آپ کا اندازہ درست ثابت نہیں ہوا۔ اس ماہ سے ہم عفت تحریک کا ناول شروع کر رہے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

نمور حُسن۔ جمائیاں منڈی

لیجئے! آج آخر کار تقریباً "دس سال بعد خواتین ڈائجسٹ میں خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم تمام ہی لیا۔

عنیزہ سید کا "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" ناول۔ عنیزہ کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے، میں اکثر اوقات ناول کی کمائی کے بجائے الفاظ کے چناؤ۔ میں ہی گم ہو جاتی ہوں۔ بہت عرصے بعد فارحہ ارشد اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئیں۔

اب ذرا بات ہو جائے "زمین کے آنسو" کی۔ نکمت سیمائی بہت خوب صورتی کے ساتھ ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ بہر حال احمد رضا کی کمائی پڑھ کر مجھے بے ساختہ زید حامد یاد آ گئے جو اسی طرح چھٹل لایچ کر کے بہت بھرپور انداز میں گفتگو میں کرتے ہیں، لیکن وائے قسمت! وہ بھی ختم نبوت پر کھل کر اقرار نہ کر سکے جس سے مشکوک ٹھہرے۔ دیکھتے ہیں کمائی آگے کس موڑ کی طرف جاتی ہے۔ لیکن بہر حال یہ تو ہے کہ ختم نبوت پر یقین ہی ہمارے ایمان کی تکمیل ہے۔ اگر یہ مشکوک تو ہم بھی دائرہ اسلام سے باہر۔

ج: آپ کی تحریر بہت خوب صورت ہے، تفصیلی تبصرہ بھی بہت اچھا لگا۔ بس افسوس ہے تو اس بات کا کہ آپ نے سستی دور کرنے میں دس سال لگا دیے اب دوبارہ دس سال کے لیے خاموشی نہ اختیار کر لیجئے گا۔ پرانی رائٹرز ہمیں بھی بے حد عزیز ہیں۔ عمیرہ احمد کی تحریریں ہم بھی پڑھنا چاہتے ہیں۔ تنزیلہ ریاض کی تحریروں کا ہمیں آپ سے زیادہ انتظار رہتا ہے۔ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ وہ ہمارے پرچوں میں لکھیں۔

عنیزہ سید نے کافی عرصہ بعد ناول لکھا ہے لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کا یہ ناول ان کی پچھلی تحریروں کی

طرح قارئین بے حد پسند کر رہی ہیں۔

فوزیہ زہیر۔ چشتیاں

انعم، کلثوم۔ لاہور

سب سے پہلے ”نبور کے تو کوہ گراں تھے“ پڑھا اور اس ناول کو ہم جیسے جیسے پڑھتے گئے یہ اتنا ہی الجھتا گیا پھر اس کے بعد ہم نے جلدی سے دوڑ لگائی میرے خواب اوناٹوں کی آخری قسط پڑھ کر ہمیں دکھ ہوا کہ اب ہم نگہت آئی سے نہیں مل سکیں گے۔ اس کے بعد زمین کے آنسو پڑھ کر تو مزہ ہی آگیا لیکن نگہت سیمائی پلیر ایک اور ارباب فاطمہ کو الگ مت کرنا آپ ورنہ میں رودولف کی اس بار ماہ تمام کو نہ پانچ کے افسوس ہوا اور باقی سارے افسانے ناولٹ اور مکمل ناول بھی اچھے تھے مگر جو مکمل ناول بازی لے گیا وہ ہے خان بابا کی گل نین شاید آفریدی کا بعد ٹیلی انٹرویو شائع کریں۔
ج : انعم اور کلثوم خواتین ڈائجسٹ پسند آیا۔ بہت شکریہ۔

سونہ خان جوتی۔ غازی پور ضلع رحیم یار خان

آٹھ بہن بھائیوں میں میرا دو سرا نمبر ہے میری ایجوکیشن میٹرک ہے۔ ہماری ٹیلی غازی پور کے چند بااثر گھرانوں میں سے ہے۔ غازی پور کے لوگ بہت ہی سادہ اور محنت کش ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں لکھی جانے والی شمار پر بے شک ہم سب کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کو لکھنے والی رائٹرز بلاشبہ قاری کا دل جیتنے کی صلاحیت رکھتی ہیں خواتین میں شائع ہونے والی سلسلہ وار کہانی (زمین کے آنسو) پڑھ کر ہمارے آنسو بہہ جاتے ہیں۔ پلیر احمد رضا کو پہلے والا احمد رضا بنا کر بہن میرا اور اس کے والدین سے ملا دیں۔

ج : پیاری سونہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے اور جو خط شائع ہوا اس پر نام غلط شائع ہوا۔ شاعری کے لیے معذرت فی الحال آپ صرف مطالعہ پر توجہ دیں۔ ویسے بھی ابھی آپ بہت چھوٹی ہیں۔ تھوڑی اور بڑی ہو جائیں پھر شاعری کیجئے گا۔ نگہت سیمائی آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

سب سے پہلے حسب معمول عنبرہ جی کا ناول عنبرہ جی کے اس شاہکار کو ہم محاورہ ”نہی نہیں بلکہ حقیقت میں سائیں روک کر پڑھتے ہیں۔“

نبیلہ جی کا مکمل ناول ”گل نین“ ایک بہترین تحریر تھا مگر پتا نہیں کیوں ادھورا ادھورا سا لگا خاص طور پر اختتام گل نین کی بے بسی اور اذیت نے بہت دکھی کیا تو لائیبہ کی کم عقلی اور ہٹ دھرمی نے افسوس میں مبتلا کیا واقعی شک بے بسائے گھر کی نہ صرف بنیادوں کو ہلا سکتا ہے بلکہ اجاڑ کر کھنڈر بھی کر سکتا ہے۔ لائیبہ کے دل میں شک کا بیج بو کر بھلا حمیدہ کے ہاتھ کیا آیا۔

ج : فوزیہ! لائیبہ کم عقل اور ہٹ دھرم نہیں تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو اسی طرح سوچتی اس نے جو کچھ کیا اپنا گھر بچانے کے لیے کیا جو پھر بھی نہ بچ سکا۔ گل نین کے دل میں عیشتم خان بتا تھا اور عیشتم خان کے دل میں بھی چور تھا تب ہی تو گل نین نے اسے جیج جیج کر الزام دیا اور اس نے جھٹ سے نکاح کر لیا اور جو اصل مجرم تھا وہ صاف بچ گیا۔ اسے کوئی سزا ملی نہ اس کا جرم دنیا کے سامنے آیا گل نین نے بھی سارا الزام لائیبہ اور عیشتم خان کو دیا۔

انیلا پروین مہسّر۔ خیر پور سندھ

بہت عرصے سے ہم خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھ رہے ہیں اور ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ خواتین ڈائجسٹ میں کرن کرن روشنی سے ہمیں بہت مفید باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں اور شعاع میں تاریخ کے جھروکوں والا سلسلہ بہت اچھا ہے اور کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

ج : پیاری انیلا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانی بھجوا دیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرویا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل پر ڈر لاؤر لائی تکثیر اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



کدورت کی عیسا

مول شیخ سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"مول شیخ"

2 "پیار کا نام؟"

"بچپن میں تو گزیا کہتے تھے چاچا وغیرہ۔ اب سب مومو کہتے ہیں۔"

3 "نام کس نے رکھا؟"

"یہ سندھی نام ہے اور میری ماں نے رکھا۔ جب میں پیدا ہوئی اس زمانے میں ایک ڈرامہ آرہا تھا جس میں کسی

کا نام مول تھا بس ای نے اسی سے متاثر ہو کر نام رکھا۔"

4 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"

"15 مئی 1984ء / لاہور۔"

5 "قد / ستارہ؟"

"5 فٹ 4 انچ / ٹورس۔"

6 "ہنر بھائی؟"

"شہزاد بھائی اور پھر میں۔"

7 "تعلیمی قابلیت؟"

"مارکیٹنگ ان ایڈورٹائزنگ (لندن) اور اس سے پہلے

اے لیول کیا۔"

8 "شاوی؟"

"جی ہو گئی ہے اور ماشاء اللہ ڈھائی سال ہو گئے ہیں۔"

9 "پہلا پروگرام؟"

"مزاحیہ سیریل تھا۔"

10 "وجہ شہرت پروگرام؟"

"اعتراف" نے مجھے پہچان دی پھر کمرشلز کیے۔"

11 "پہلی کمائی / کیا کیا؟"

"اے لیول کے بعد میں نے نیجنگ شروع کی تھی

بحیثیت آرٹ نیچر کے اور 68 ہزار ملے تھے اور خرچ ہی

کئے ہوں گے۔"

12 "شوہر کی بڑی برائی؟"

"کبھی بھی ناظمہ پروجیکٹ ختم نہیں ہوتے۔"

13 "آپ کی سب کب ہوتی ہے؟"

"کام کے دن نوبے تک ورنہ ٹھوڑی دیر سے اٹھتی ہوں۔"

14 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"باشہ اور پھر کام پر جانے کی تیاری۔"

15 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی بڑی

بات نہیں ہوئی کہ بری لگے۔"

16 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"

"قانون ہے کہاں جو برا لگے گا۔"

17 "قومی ترانہ کیسے مناتی ہیں؟"

"بہت جوش و خروش کے ساتھ گھر سے نکل کر اور اس

وقت دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے لیے کچھ کریں۔"

18 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"کچھ نہیں کیونکہ مجھے یہ یقین ہے کہ اللہ نے جس طرح

کایا کر آپ کو بھیجا ہے کچھ سوچ سمجھ کر ہی بھیجا ہو گا۔"

19 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"میں کھانے کی طلب میں چڑچی نہیں ہوتی۔"



20 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"جب بہت مصروف ہوتی ہوں تو فارغ ہونے کا، تاکہ

اپنے میاں کے ساتھ وقت گزار سکوں۔"

21 "شدید تھکن میں بھی کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار

رہتی ہیں؟"

"ای کے پاس۔"

22 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"چوبیس گھنٹے خوش رہ کر۔"

23 "دوسرے ملک میں رہنا کیسا لگتا ہے؟"

"مستقل رہنا تو اچھا نہیں لگتا۔ ٹھوڑے دنوں بعد ہی اپنا

ملک اور اپنا گھر سب یاد آنے لگتا ہے۔"

24 "طبیعت میں ضدی بن ہے؟"

"بالکل بھی ضدی نہیں ہوں۔"

25 "دلغ کب گھومتا ہے؟"

"کوئی کام لیٹ ہونے پر۔"

26 "کیا بات برداشت سے باہر ہوتی ہے؟"

"جب لوگ منہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔"

27 "غصے میں کیا کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"کچھ نہیں کیونکہ میرا غصہ پانچ سات منٹ کا ہی ہوتا

ہے۔

28 "مرووں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جو نرم دل ہوتے ہیں وہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ جن میں غصہ نہیں ہوتا وہ بھی۔"

29 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"کہوں گی اب بس کروار۔"

30 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"میں نے اپنے بابا کا غصہ تیز دیکھا نہ بھائی کا نہ امی کا اور نہ ہی اب شوہر کا تو ذرا کس سے؟ احترام ضرور ہے سب کا۔"

31 "پرانر باندھ لینے کا شوق ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

32 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"
"کچھ نہیں جو ملا ہے اپنے وقت پہ ہی ملا ہے۔"

33 "زندگی کو کس انداز میں دیکھتی ہیں؟"
"ہمیشہ پوزیٹو انداز میں اور اس یقین کے ساتھ کہ جو اللہ نے لکھ دیا ہے وہی ملتا ہے۔"

34 "جو انٹاکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"
"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ جو جو انٹاکاؤنٹ ہو گا وہ آپ کا فیملی ممبر ہی ہو گا۔"

35 "محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"موڈ پر منحصر ہے۔ ویسے میں شرمیلی ہوں نہیں۔"

36 "شاپنگ سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"
"شاپنگ مجھے مشکل لگتی ہے۔ مال میں گھومنا پھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

37 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔ اچھے خاصے خرچ ہو جاتے ہیں۔"

38 "برا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"جی اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔"

39 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"دعاؤں۔ یہ بہت ضروری ہیں انسان کے لیے۔"

40 "کس کام کو کر کے سکون ملتا ہے؟"
"لوگوں کی مدد کر کے اور مستحق لوگوں میں کھانا بانٹنا اچھا لگتا ہے۔ اکثر میں خود ہی اکیلے۔ نکل جاتی ہوں اور روڈ پر

کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں سے مدد کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

41 "پیسے کے لیے آپ کی سوچ؟"
"پیسہ آنے جانے والی چیز ہے۔ آپ کا رہن سہن اور آپ کا مینٹل لیول اس انداز کا ہو کہ اگر کل کو پیسہ نہیں ہے تو آپ کو مشکل نہ ہو۔"

42 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"میرا موڈ 24 گھنٹے اچھا رہتا ہے۔"

43 "اپنے لیے کس کی تعریف اچھی لگتی ہے؟"
"اپنے شوہر کی۔ ویسے وہ میری تعریف اکثر کرتے رہتے ہیں اور میرے لیے ان کی تعریف سب سے زیادہ اہم ہے۔"

44 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرانے؟"
"کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے بھی اور پرانے بھی۔"

45 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"سرال، امی اور پھر دوستوں میں دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

46 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"یہ منحصر ہے اس بات پر کہ "ایونٹ" کیا ہے۔ گرمیوں میں شلوار قمیص پسند ہے۔"

47 "اپنی شخصیت کے لیے کوئی جملہ یا لفظ؟"
"بانڈر ہوں۔ دوست وغیرہ کہتے ہیں۔"

48 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

49 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"
"سب اپنے حساب سے بہت اچھے ہوتے ہیں تو جن کے ساتھ موقع ملے گا کام کروں گی۔"

50 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"جب فارغ ہوتی ہوں تو سب کو ہی جواب دیتی ہوں۔"

51 "نوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"دوستوں کے ساتھ چلی جاتی ہوں ورنہ سیلون۔"

52 "ایک کروار جو آپ کو کرنا چاہتی ہیں؟"
"میں نیکیٹو رول کرنا چاہتی ہوں۔"

53 "ایک کروار جو کر کے پچھتاؤں؟"

"نہیں میرا نہیں خیال کہ ایسا کوئی کروار ہو گا۔ اپنے ہر کروار سے کچھ نہ کچھ سیکھائی ہے۔"

54 "ایک کروار جو بہت جھٹ ہوا؟"
"ابھی تو شروعات ہیں ویسے "کدورت" کے کروار علی بنانے شہرت اور پہچان دی ہے۔"

55 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتاؤں؟"
"نہیں کام کے سلسلے میں ہی سب لیتے ہیں۔ کسی نے پریشان نہیں کیا۔"

56 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"بالکل بھی بری نہیں لگتی۔ اچھا لگتا ہے مہمان آتے ہیں تو۔"

57 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟"
"اپنی ایک نیم ہٹاؤں گی اور سب کو ساتھ لے کر کام کروں گی۔ اکیلی کچھ نہیں کر پاؤں گی۔"

58 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"شو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کافی ہیں میرے پاس۔"

59 "صحیح جو مری لگتی ہے؟"
"صحیح کبھی بھی بری نہیں لگتی۔ اس میں بھی ہماری کوئی نہ کوئی بھلائی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔"

60 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"بالکل۔ چونکہ مجھ پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں اس لیے میں وقت کی پابندی کرتی ہوں۔"

61 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"کوئی خاص نہیں ہیں۔ سب پر ہی خرچ کرتی ہوں۔"

62 "ایک شخصیت جن کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں؟"
"اپنی ماں کے لیے۔ کیونکہ انہوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے اور جتنا ہم ان کے لیے کریں گے وہ بھی کم ہو گا۔ ان کی ایک آواز پہ میں بھاگتی ہوں۔"

63 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"یاد ہی نہیں ہے۔ کیونکہ شاپنگ کی شوقین نہیں ہوں۔"

64 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ٹیبل یا چٹائی؟"
"میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں اگر چٹائی ہے۔ سب کھانا کھا رہے ہوں گے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گی۔"

65 "ایک ریستورانٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟"
"مجھے زیادہ تر گھر کا پکا ہوا کھانا پسند ہے۔ ویسے چائیز ریستورانٹ میں کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔"

66 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"
"کچھ نہیں۔ سب کو جگاؤں گی کہ اٹھو میں بور ہو رہی ہوں۔"

67 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بالکل ہے۔ بہت معلومات ملتی ہیں ان سے۔"

68 "فیوچر پلاننگ؟"
"کوئی خاص نہیں۔ بس اچھا کام کریں، اچھی زندگی گزاریں۔"

69 "ایک کھانا جو بہت اچھا لگتا ہے؟"
"دال چاول، کڑی گوشت۔"

70 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"عورت ہی نرم دل ہوتی ہے۔"

71 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"چھپکلی، لال بیک، چوہوں سے۔"

72 "خود کشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بزدل۔"

73 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"نکاح کی رسم۔"

74 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"جس کے لیے جو آسانی ہو۔"

75 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"اپنی امی کے ہاتھ کا۔"

76 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟"
"ایک بار بھی نہیں۔"

77 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"بیک۔ جس میں کافی چیزیں ہوتی ہیں۔"



دیکھنا چاہتے ہیں۔“
85 ”شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟“
”جب آپ اسے سر پر سوار کر لیں۔“
86 ”بستر پر لیٹتے ہی غینہ آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟“

”جلدی سو جاتی ہوں۔“
87 ”بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟“
”ای کی تصویر ہے۔ پسپ ہے ٹون ہے۔“
88 ”خدا کی حسین تخلیق؟“

”پوری دنیا۔“
89 ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“
”جب کوئی آپ اینڈ ڈاؤن آتا ہے تب بری لگتی ہے کہ اوہ یہ کیوں ہو گیا ہے۔ مگر ایوس نہیں ہوتی۔ چیخ سمجھ کر مقابلہ کرتی ہوں۔“
90 ”کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟“
”اوہ۔ مجھے بہت مسئلہ ہوتے ہیں کیونکہ جب میں نیند سے بیدار ہوتی ہوں تو کچھ دیر بستر پر رہنا پسند کرتی ہوں۔“

91 ”اپنی شخصیت میں کیا چیز بد لٹا چاہتی ہیں؟“
”تھوڑا غصہ ہے مجھ میں وہ بھی نہ رہے تو اچھا ہے۔“
92 ”دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟“
”زیادہ تر فریش ہی ہوتی ہوں۔ مگر صبح کے وقت زیادہ تروتازہ ہوتی ہوں۔“

93 ”آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟“
”بالکل بھی نہیں۔ سیکنڈوں میں تیار ہو جاتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اب مو حضرات تیار ہونے میں زیادہ وقت لگاتے ہیں۔“
94 ”گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟“
”کھانا مل جائے۔“

”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“
”پوزیشن ہی لوں گی کیونکہ اللہ نے میرے لیے یقیناً کوئی نہ کوئی بہتری ہی رکھی ہوگی۔“

بقیہ سروسے

رہا ہوتا ہے وہیں سب کو ایک اور خاص ڈش کا انتظار رہتا ہے اور وہ ہے ”گرین تیکہ پراٹھا رول“ جسے میں اور میری بھابی مل کر تیار کرتے ہیں۔ قارئین کی خدمت میں ’میری بھابی‘ ہوتی اس خاص ڈش کی ترکیب حاضر ہے۔

گرین تیکہ رول

آدھا کلو اینڈ رکٹ کا گوشت لے لیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیں۔

اس میں دو ٹیمبل اسپون اور ک لسن (ایک ٹیمبل اسپون زیرہ (توے پر بھون کر کوٹ لیں) نمک (ایک ٹی اسپون) سفید مرچ (2/1 ٹی اسپون) کریم (تین ٹیمبل اسپون) اور دو پیچ کچا پیٹا ملا دیں۔ ہر ادھیا (دو ٹیمبل اسپون) ہری مرچ (سات سے آٹھ) دونوں کو ملا کر پیس کر لیں۔ یہ تمام مسالا گوشت کی بوٹیوں پر لگا کر پوری رات میلائیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ پھر دو ٹیمبل اسپون تیل فراٹنگ پان میں ڈال کر یہ مسالا لگی بوٹیاں پکالیں۔ اتنی دیر کہ گوشت گل جائے اور تمام پانی خشک ہو جائے اور پھر گوشتے کا دھو دے دیں۔

پراٹھے بنانے کے لیے :

میدہ (دو کپ) آٹا (آدھا کپ) گھی (دو ٹیمبل اسپون) اور نمک (آدھا ٹی اسپون)۔ یہ سب ملا کر نیم گرم پانی سے آٹا گوندھ لیں اور پراٹھے بنا کر ہلکے فرائی کر لیں۔

مایو ساں بنانے کے لیے مایونیز (دو ٹیمبل اسپون) کریم (دو ٹیمبل اسپون) اور سرکہ (دو ٹیمبل اسپون) تمام چیزوں کو مکس کر لیں۔

پراٹھے پر ساں لگائیں پھر پیف بوٹیاں رکھیں پھر پیاز کے کچھے اور پودینہ ڈال کر رول بنالیں۔ مزیدار گرین پیف پراٹھا رول تیار ہے۔ چاہیں تو ان بوٹیوں کو

سٹخوں پر لگا کر بارانی کیو کا مزہ بھی لے سکتے ہیں۔
اگر معدہ کا راستہ واقعی دل سے ہو کر گزرنا ہے تو یہ گارنٹی ہے میری کہ ہماری قارئین کئی دلوں کی مالک بن جائیں گی۔

مہوش افتخار

1۔ جناب آپ کو شاید یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ گوشت صاف کرنا، سنبھالنا اور پکوان تیار کرنا ان میں سے کوئی بھی ذمہ داری مجھے نہیں سونپی جاتی وجہ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ جی ہاں ویسی ہی جوائنٹ فیملی جیسی آپ ناولوں میں پڑھتے ہیں۔ بڑے سے گھر میں اپنی پیاری دواوی کے زیر سایہ ہم تین فیملیز اپنے اپنے پورشنز میں رہتے ہیں۔ عام دنوں میں ہمارے ہاں الگ الگ کھانا بنتا ہے لیکن ہر اہم موقع اور عیدین یہ ہمارے ہاں ایک ساتھ کھانا بنایا اور کھایا جاتا ہے۔ ایسے میں کوکنگ کی ساری ذمہ داریاں میری ماما اور دونوں بچیاں سنبھالتی ہیں۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی کچھ یہی صورت حال ہوتی ہے۔

گوشت سے متعلق ہر ذمہ داری خواتین کی ہی ہوتی ہے۔ ہم لڑکیاں البتہ نہ صرف ہر کام میں ان کی مدد کرتی ہیں بلکہ سوٹ ڈش، سلاد راستہ وغیرہ بنانا، کھانا لگانا، اٹھانا اور بعد میں کچن سیٹنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہوتا ہے۔

(2) عید پر میری ماما چائیں ضرور بتاتی ہیں۔ کیونکہ ان کی یہ ڈش سب ہی افراد خانہ کو بے حد پسند ہے۔ ان لذیذ چائوں کی ترکیب یہ ہے۔

لذیذ چائوں کی ترکیب

اجزا :
چائیں ایک کلو
پیاز (یا ریک کٹی ہوئی) ایک عدد درمیانی
لسن اور ک کاپیٹ ایک ایک چائے کا چمچ
ہلدی ایک چائے کا چمچ

پسی کالی مرچ
پسی سرخ مرچ
نمک
سفید سرکہ
کوئٹہ کے لیے :
کارن فلور
ڈبل روٹی کا چورا
اندھے

آدھا چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
1/4 کپ
ایک کپ
ایک کپ
دو عدد
ہلکا سا نمک اور تھوڑی سی کالی مرچ ڈال کر پھینٹ لیں
ترکیب :

ایک دیگی میں کھانے کے آئل لے کر اسی میں باریک کٹی پیاز ڈال دیں۔ جب پیاز ہلکی گلابی ہو جائے تو اس میں اور گ لسن کا پیسٹ اور چائیس ڈال کر چند منٹ تک بھونیں۔ اب اس میں ہلدی پسی کالی مرچ پسی سرخ مرچ نمک اور سفید سرکہ ڈال دیں۔ ساتھ ہی انتاپانی بھی ڈال دیں کہ چائیس نہ صرف گل جائیں بلکہ اسی پانی میں خشک ہو کر تیار بھی ہو جائیں۔ چائیس کے گٹنے اور پانی خشک ہو جانے کے بعد ایک دو منٹ ان کی اچھی طرح بھنائی کر لیں۔ پھر انہیں چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔

اب ایک فرانگ پین میں کافی سارا آئل گرم کریں۔ ٹھنڈی ہوئی چائیس کو ایک ایک کر کے پہلے کارن فلور پھر اندھے اور آخر میں ڈبل روٹی کے چورے میں رول کر لیں اور فرانگ پین میں ڈال دیں۔ ہلکا سنہری رنگ آنے تک فرائی کریں۔ سلاد اور کچھپ کے ساتھ سرو کریں۔

مجھے یقین ہے آپ جب انہیں ٹرائی کریں گی تو آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔

نایاب جیلانی

ہمارے ہاں ہر تہوار کو خوش و جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ خاص طور پر مذہبی تہوار اور چونکہ ہر خاص موقع پر خاص قسم کا اہتمام کیا جاتا ہے سو ذمہ

داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔
مجھ پر نہ امی کی طرف کوئی خاص ذمہ داری ہوا کرتی تھی اور نہ ہی سسرال میں۔ تو میں یہاں صرف ”کھانے“ کی بات ہی کروں گی پکانے کی نہیں۔

میری ذمہ داری ممکن عید پر صرف کھانے کی حد تک ہوتی ہے۔ باقی تمام کام جیسے گوشت صاف کرنا، سنبھالنا پکانا اور ڈشز کے نمونے تیار کرنا میری ذمہ داری ہے۔ سب کام تھے اور وہ بہت سلیقے کے ساتھ سب کام سرانجام دیتی تھی۔ مگر یہ سب پچھلی عید کے عیش تھے۔ اب چونکہ الگ گھر ہے تو ذمہ داریاں بھی بے شمار۔ میں پہلی مرتبہ اس ”تجربے“ سے گزروں گی اور ”تجربے“ سے پہلے کیا جاسکتی ہوں۔ میٹھی عید پر بھی ذمہ داریوں کا پہاڑ دیکھ کر میں ”بیچارہ“ بن گئی تھی۔ اس عید پر بھی ایسا ہی کوئی پروگرام بنانے کا ارادہ تھا مگر شوہر کی دھمکیاں۔ میٹھی عید پر میرے پیار ہونے پر انہوں نے خود ہی کھانا پکانے سے لے کر گھر بیٹھ کرنے تک سب کام کیے تھے مگر اب کی دفعہ صاف جھنڈی دکھادی۔ (آہ میری قسمت)

2۔ دو سراسوال دیکھ کر کچھ دھچکا سا لگا تھا۔ پھر میں کافی سوچ بچار میں پڑ گئی۔ آخر میرے ہاتھ کی کون سی ڈش گھروالوں کو پسند ہو سکتی ہے؟ بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد بھی کوئی موزوں ڈش سمجھ میں نہیں آ سکی۔ اپنا پکایا میں خود ہی بہت شوق سے کھا سکتی ہوں تاہم میرے شوہر نے میرے ہاتھ کے پکوانوں پر کبھی تنقید نہیں کی۔ میں جیسا تیار کیا کر سامنے رکھ دوں۔ صبر و شکر سے سب کھا لیتے ہیں۔ رزق کے نام نہیں رکھتے۔

اس دفعہ میرا ارادہ ”ایرانی کوٹھے“ بنانے کا ہے اور اس کے لیے میں قیمہ بھی خود ہی بناتی ہوں۔ چونکہ یہ ڈش بہت دفعہ ٹرائی کر چکی ہوں سو بنانا بھی مشکل نہیں اور خیر کھانا تو بالکل مشکل نہیں اور اگر کوٹھے بناتے ہوئے گیند ٹوٹ جائیں تب بھی مسئلہ نہیں ہے قیمے کی ہی کوئی ڈش بالآخر تیار ہو جائے گی۔

یہ ڈش بنا میں لیتی ہوں اور شوق سے کھانے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ خیر ترکیب بتائے دیتی ہوں۔
ایرانی کوٹھے

اشیا :
قیمہ
نمک
سیاہ مرچ پاؤڈر
سفید مرچ پاؤڈر
لسن پیسٹ
اندھا سفیدی الگ کر لیں
بادام چوپ کیے ہوئے
پست (چوپ کیے ہوئے)
شمش
کاج چیز
چھلر چیز
ہر ادھنیا باریک کٹا ہوا
تیل
پیاز براؤن کر لیں
دہی
ترکیب :

قیمے میں نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، سفید مرچ پاؤڈر، لسن پیسٹ، بادام پست، شمش، کاج چیز، چھلر چیز اور ہری مرچ شامل کر کے نم ہاتھوں سے کوٹھے بنا کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ دیگی میں تیل گرم کریں۔ اس میں چوپ کیا ہوا لسن ڈال کر کچھ چلا لیں۔ اس کے بعد اس میں دہی براؤن کی ہوئی پیاز اور نمک ڈال کر مسالا بھوننے تک فرائی کریں۔ 1/2 کپ پانی ڈالیں اور تیار کیے ہوئے کوٹھے ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ ہلکی آگ پر 25 سے 30 منٹ تک پکا میں۔ مزید ایرانی کوٹھے تیار ہے۔ (آہ منہ میں آگیا تپانی)

عبرین اعجاز

1۔ میری طرف سے سب کو عید مبارک!

عید الاضحیٰ کے موقع میری ذمہ داری کا آغاز قصائی صاحب کی آمد سے ہوتا ہے۔ سلورچی خانے کی ویلیر سے بیرونی دروازے کی ویلیر تک کا سفر بھاگتے دوڑتے ہوئے بڑے بڑے تھل پڑاتیں، ٹرے اور پالوں کی بروقت فراہمی میں ہی گزر جاتا ہے۔ البتہ گوشت کی صفائی، جھے بنانا اور بانٹنے کی ذمہ داری میرے پیپا کی زیر نگرانی اور زیر ہدایات میرے بھائی انجام دیتے ہیں۔ گوشت کو سنبھالنے کا کام میری ماما کا ہے۔ اب میری باری آتی ہے یعنی پکوان کی تیاری۔ عید کے روز تو فوری طور پر کچلی چولہے پر چڑھا دی جاتی ہے ساتھ میں بو دینے کی پٹنی والا دہی، سلاد اور آخر میں قوہ پر اکٹھا کر لیا جاتا ہے۔ رات کے کھانے میں اہل خانہ کی طرف سے جو بھی ”فرمائشیں“ پروگرام ہوتا ہے۔ اسے ہنسی خوشی پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے قلبی و روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

عام طور پر مجھ سے بریانی، پلاؤ، مہلب، حلیم، دم کا قیمہ، کوٹھے، پسندے، اچار، گوشت، ران، روسٹ اور بابلی کیو کی توقع کی جاتی ہے۔ حسب حال اور حسب پسند ڈشز منتخب کر کے چند روز قبل مجھے آگاہ کر دیا جاتا ہے تاکہ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو پہلے سے ہی منگوا کر لوازمات پورے کر لیے جائیں۔ سوئیے میں عید کی رات کو ہی ران، روسٹ اور بابلی کیو کے لیے گوشت کو مسالا لگا کر فریق یا فریزر میں میونٹ کرنے کے لیے رکھ دیتی ہوں۔

2۔ عموماً ”ہماری فیملی“ میں عید کے دو سرے روز سے باقاعدہ دعوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس فیملی کو مدعو کیا جاتا ہے ان کی پسند ”پریز“ اور خصوصی فرمائش کو مد نظر رکھتے ہوئے مینو ترتیب دیا جاتا ہے ہر کھانے کے بعد میز قوے کا ہونا لازمی ہے۔

چونکہ ہمارے گھر میں ایک ڈش کئی طریقوں سے بنتی ہے جن میں دہی اور روایتی طریقے بھی شامل ہیں اور بدلی بھی۔ یہاں میں اپنی بہنوں سے ایک ایرانی ڈش شیئر کرنا چاہوں گی جو اپنے فلیور اور خوشبو کی وجہ سے کافی ڈیمانڈ میں رہتی ہے امید ہے آپ سب کو بھی

پسند آئے گی۔

خراسانی بریانی

اجزا :	گوشت
ایک کلو	گھی
آدھا پاؤ	لوتک
6 عدد	الاجچی سبز
4 عدد	زیرہ سیاہ پسا ہوا
2 ٹی سپون	پیاز
آدھا پاؤ	اورک کاپیٹ
2 کھانے کے چمچ	دہی
ایک پاؤ	سیاہ مرچ پاؤڈر
1 ٹی سپون	نمک
حسب ذائقہ	چاول
ایک کلو	کچا پینا پیسٹ
2 ٹیبل سپون	ثابت زیرہ
تھوڑا سا	زعفران اور کیوٹہ
ذرا سا	(دم دیتے وقت دودھ میں ملا لیں)

ترکیب :

گوشت پر نمک اور کاپیٹ، کچے پیسے کاپیٹ، پیاز کا پانی (عرق) دہی پیسی سیاہ مرچ، سیاہ زیرہ اور سبز الائچی کے دانے پیس کر لگا کر کم از کم دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں ورنہ چار سے پانچ گھنٹے بھی ٹھیک ہیں۔ چاولوں کو ایک کٹی پر ابال لیں۔ اب دہی میں ثابت زیرہ پھیلا کے ڈالیں۔ اس پر گوشت پھیلا دیں۔ اوپر سے لونگیں چھڑکیں اور گھی آدھی مقدار میں ڈال دیں۔ اب بے چاولوں کی دو مٹھی اور ایک پیالہ پانی گوشت پر ڈال دیں آج تیز کر دیں ڈھکن ابھی مت دیں۔ اپنے لگے تو باقی چاول ڈال کر اوپر سے گھی کی بقیہ آدھی مقدار بھی ڈال دیں اور دہی کا ڈھکن بند کر کے اوپر کوئی وزن چیز رکھ دیں۔ آگ تیز ہی رہے گی۔ کچھ دیر بعد بریانی کا پانی خشک ہو جائے گا اور گھی کی آواز آنے لگے گی تو آج دھیمی کر دیں اور بیس منٹ تک دم

پہ رکھ دیں۔ بریانی تیار ہو جائے تو چوبیس سے اندر لیں اور ڈش میں نکال لیں۔ دم دینے سے قبل 10 منٹ میں زعفران اور کیوٹہ ملا کر چھینٹا دے لیں۔

رمضہ خالد خان

(1) ہمارے ہاں تہوار بہت اہتمام سے منائے جاتے ہیں مگر عید الاضحیٰ پر گھوپا گسلان میں جو گھما گھی ہوتی ہے وہ کسی اور موقع پر شاندار طور ہی نظر آتی ہے عید سے ایک دن پہلے قربانی کے جانور رقبے سے گھر لائے جاتے ہیں۔ اسے میں بچوں کا اشتیاق دیدنی ہوتا ہے۔ عید کے بر سکون دن میں قصائی کی آمد کے ساتھ ہی ہانچل مچ جاتی ہے سب سے پہلے تو مرد حضرات کی دوڑیں لگتی ہیں ساتھ ساتھ ان کا پارہ بھی بلا وجہ ہائی ہونے لگتا ہے (کم از کم میرے بھائی عبداللہ کا تو ضرور ہوتا ہے) پھر گوشت آنے کے ساتھ ہی ”خواتین خانہ“ کی ذمہ داریوں کا آغاز ہوتا ہے جو رات تک ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ آپ کا سوالنامہ پڑھ کر میری اہی بے ساختہ مسکرائیں۔

”ہاں۔ اب سب کو بچ جاتا“

تو جناب بچ تو یہ ہے کہ ایک تو میرا شمار ابھی ”لڑکیوں“ میں ہوتا ہے اوپر سے اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے خصوصی رعایت حاصل ہے۔ دوران تعلیم اہی نے کسی قسم کی گھریلو ذمہ داری مجھ پر یا اٹھائی پر نہیں ڈالی ہوئی (ذمہ داری نہ ڈالنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ سکھایا بھی کچھ نہیں بقول اہی لڑکیوں کو سب کچھ آنا چاہیے) اہی اہل تو ”کمپیوٹر کتاب اور قلم“ بھی میرا اوزھنا چھوٹا ہے گوشت کے حصے بنا کر باٹھا اپنا حصہ صاف کر کے بیکٹ بنا کر فریز کرنا اور مزے مزے کے پکوان بنانا یہ سب اہی کرتی ہیں۔ اس دوران میرے ذمے اوپر کے ”وغیرہ وغیرہ“ قسم کے کام ہوتے ہیں جو اگرچہ کسی کھاتے میں شمار نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں باقاعدہ پلاننگ سے کرنا پڑتا ہے مگر تھکا ضرور دیتے ہیں۔

(2) میں ایک اچھی لگ ہوں (یہ سب کزنز کی

آنکھیں کیوں باہر نکل رہی ہیں؟ بھئی یہ میرا ذاتی خیال ہے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں) مگر اہی جیسا لذیذ اور مزے دار کھانا کبھی نہیں بنا سکتی۔ پچھلے تین سال سے ہر عید پر میرا معمول ہے کہ صبح ہی صبح کچن کا رخ کرتی ہوں۔ سعدیہ بہت حیران ہوتی ہے بقول اس کے ہم عید کے دن کچن سے جان چھڑاتے ہیں اور تم سارے سال میں صرف عید پر اتنے ذوق و شوق سے کچن کو رونق بخشتی ہو ایسا کیوں ہے مجھے خود بھی نہیں پتا مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں چکن بریانی ضرور بناتی ہوں ساتھ میں اچاری چکن یا چکن قورمہ (ہم بہن بھائی چکن خور ہیں) اور کوئی۔ یہی ساڈیزرٹ۔ اس کے بعد تیار ہو کر مرغ بریانی کی پلیٹ اپنی اسسٹ فرینڈ سعدیہ کے پورشن میں اس سے عید ملنے جاتی ہوں۔ اب عید الاضحیٰ۔ پر قربانی کا گوشت نہ ملے ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں بغیر بریٹر کو کر کے ہلکی آج اور ہلکے نمک مرچ میں بھنا گوشت اور کچلی بھی ضرور بنتی ہے جو اماں بابا کو بہت پسند ہے مگر یہ دونوں ڈشز اہی بناتی ہیں۔

جہاں تک ترکیب کی بات ہے بچ تو یہ ہے کہ مجھے جب بھی اہتمام سے کھانا تیار کرنا ہو پیکٹ مسالے زندہ باد

ایک بار پھر عید مبارک خوش رہیے مجھے اور میرے اہل خانہ کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

شیریں ملک

(1) آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر تہوار کی طرح عید الاضحیٰ کے موقع پر بھی خواتین کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا احساس مجھے اپنے ناناؤں کندھوں پر تو کبھی محسوس نہیں ہوا۔ لیکن اپنی جان سے پیاری اہی کو دیکھ کر ضرور ہوا ہے۔

عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے بعد گوشت صاف کرنا، تقسیم کرنا مسجداں یا یہ کام شروع سے اہی ہی کرتی ہیں۔ یقیناً انہیں ہماری صلاحیتوں پر بھروسا نہیں۔ لیکن عید کے حوالے سے پکوان تیار کرنے کا کام ہم

بہنوں نے اہی سے سیکھ کر بلا خراپے ذمے لے لیا ہے۔ حالانکہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ ان کا گھریا لکل ہمارے پڑوس میں ہے تو ہم ان کو اور شہزادوں کی سی آن بان والے اپنے تین سالہ بھائی حسن کو اور پریوں جیسی خوب صورت ایک سال کی بھانجی خوش بخت (خوشی) کو اکیلا ہر گز نہیں چھوڑتے اور عید کی صبح پہلا کام یہی کرتے ہیں کہ آپ کی گھر جاتے ہیں۔ حسن اور خوشی کو تیار کرتے ہیں اور آپی سمیت ان کو اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ جب بات بات پر مجھے ”آئی شیریں“ کہہ کر پکارتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ اس جیسا خوب صورت رشتہ شاید ہی کوئی ہو۔

لیکن پیاری بہنوں آپ ہر گز یہ نہ سمجھیے گا کہ میں بالکل ہی نکمی ہوں۔ بلکہ میں اپنے گھر میں نہایت ہی مستعد اور فعال رکن مانی جاتی ہوں۔ سمجھ دار اور سکھڑ لڑکیوں کی طرح عید کی آمد سے پہلے ہی کاموں میں جت جاتی ہوں۔ مثلاً ”پورے گھر اور کچن وغیرہ کی مکمل صفائی کرتی ہوں۔ تمام ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے لسٹ بنا کر بھائیوں کے حوالے کرتی ہوں۔ عید کے دن استعمال ہونے والے برتن، دسترخوان اور خاص کر عید الاضحیٰ کے موقع پر بنی دی پروگرامز اور پسندیدہ رسائل سے گوشت کی ڈشز کی تزئین نوٹ کرتی ہوں تاکہ گھر والوں پر نت نئے تجربات آزمائے جائیں۔

(2) عید الاضحیٰ کے موقع پر ہم بہنیں مختلف قسم کے پکوان بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو کہ ہمارا دل رکھنے کے لیے ہی میسٹ کیے جاتے ہیں۔ سوائے ابو کے جو ہم سے بہت پیار کرتے ہیں اور دل کھول کر ہمارے بنائے گئے کھانوں کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن گھر کے سب افراد کو روایتی کھانے ہی پسند ہیں۔ خاص کر قورمہ، اچاری گوشت، کڑائی گوشت، کباب اور خاص کر کے منن پلاؤ جسے ہمیشہ میری فیورٹ بریانی پر ترجیح دی جاتی ہے۔

لیکن عید کی شام کو ہر دفعہ میں جو ڈش خصوصی طور پر تیار کرتی ہوں وہ میرے بھائی علی کو بہت پسند ہے جسے

کم ہی کوئی چیز پسند آتی ہے۔ یہ ”سندوری ران“ یہ میری تیار کردہ واحد ڈش ہے جس پر مجھے گھر کے ہر فرد کی طرف سے تعریف و وصول ہوتی ہے اور میں کھائے بغیر ہی سیر ہو جاتی ہوں۔

سندوری ران

اشیا :	ایک عدد
بکرے کی ران	دو چائے کے چمچے
لسن پیسٹ	چار چائے کے چمچے
بابلی کیو ساس	ایک چائے کا چمچ
سیاہ مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
سرکہ	حسب ذائقہ
نمک	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر	حسب ضرورت
تیل	ایک درمیانہ ٹکڑا
کونکہ	
ترکیب :	

ران کو اچھی طرح صاف کر کے گہرے کٹ لگا کر اس پر تمام مسالا جات یعنی نمک، لال مرچ، سرکہ، بابلی کیو ساس، لسن پیسٹ اور سیاہ مرچ پاؤڈر مکس کر کے ملیں اور دو گھنٹے تک میرہنٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑے پیلے میں تھوڑا سا تیل درمیانی آگ پر گرم کریں اور میرہنٹ کی ہوئی ران اس میں ڈال کر بیس منٹ ہلکی آگ پر ڈھک کر پکائیں۔ جب دونوں طرف سے ران گولڈن ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ کونکہ دھکا کر دم لگا دیں۔ منفرد سندوری ران بالکل تیار ہے۔ گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔

سدرۃ المنتہی

بقر عید کا تصور کچھ زیادہ ہی لطف دینے والا ہوتا ہے کہ آپ اس میں پورے سال کا گوشت ایک ماہ میں کھا لیتے ہیں (عید الاضحیٰ پر خواتین کی ذمہ داریاں ضرور برہہ جاتی ہوں گی مگر ہماری ذمہ داریوں میں کچھ خاص فرق

نہیں آتا) جیسے گوشت صاف کرنا کہ اس سے ہاتھ خراب ہوتے ہیں (سنبھالنا اور پکوانا تیار کرنا ان سے بٹ کر بھی ایک ذمہ داری ہوتی ہے جسے کھانا کھانا اور کھانا کہتے ہیں۔

یہ ذمہ داری ہمیں سونپی نہیں جاتی مگر فرائض میں اپنا نام شمار کرنے کے شوق میں نبھاتی جاتی ہے۔ یہ بھی تو ایک بڑا کام ہے کھانا اور پھر اسے ہضم بھی کرنا ہوتا ہے (میرے خیال سے ان دنوں میں ہاضمے کے سیرپ کارمینا کی گولیوں اور بد ہضمی کے لیے اینیو کی سب سے زیادہ بکری ہوتی ہوگی) رہی بات پکانے کی تو کھانے کے لیے یہ مصیبت زدہ کام بھی مجبوراً کرنا پڑ جاتا ہے مگر میرے جیسے کام چور اور بھانے بازوں کے لیے سب سے آسان ترکیب یہی ہے کہ ایک سچ اپنے پاس ضرور رکھیں، انگلیٹھی میں کوئلے اور کوئی ہی وہ کادوے آپ بڑے سائز کی بوتلیاں گھر میں کسی سے کٹوا کر صاف بھی کروالیں، ہو سکے تو مسالا بھی لگوائیں، روٹی یا چمچ کی مدد سے آئل چھڑکیں اور انگلیٹھی پر رکھ کر پکائی جائیں۔ پکاتے ہوئے آدھا کھالیں۔ باقی پکانے کے بعد خود کھائیں۔ کسی کونہ کھلائیں کہ اس وقت ہر کسی کے پاس گوشت ہوتا ہے عید منائیں اور خوش رہیں۔ دیکھیں ایسی نایاب ترکیبیں کون بتاتا ہو گا بھلا۔

مدیرہ جی! میرا مقصد بچیوں کو خراب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف اپنے جیسوں کا ورد سمجھتی ہوں اور ان ہی کے لیے ایک ترکیب میں نے بھی دے ڈالی۔ آج کے بعد کام چور لڑکیاں بھی بقر عید کے سروے پر مہیا کریں گی۔ سب کو عید مبارک کہیے اور مسکرائیے اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے دوستو اور خوب کھائیے۔ کیونکہ عید قربان سال میں ایک دفعہ ہی تو آتی ہے۔



مہندی کے ڈیزائن

ادارہ





عدنان کے ساتھ اپنائیت کی انتہا کر دی اور ان کی تمام جائیداد شاید یہ سوچ کر ہی اپنے قبضے میں کر لی کہ انہوں میں کیا تیرا میرا۔ عدنان بھی اس اپنائیت پر سمجھ گئے اور کہا کہ ”چاہے جھوٹری ہی میں کیوں نہ رہتا پڑے۔ رہوں گا بھارت میں ہی۔“

شاید عدنان سمجھے ہوں کہ یہ بیان دے کر وہ بھارتیوں کے دل میں جگہ بنائیں گے۔ مگر اس بیان نے عدنان کی عزت پاکستان میں تو کم ہی کی تھی۔ تاہم بھارت میں تو بالکل ہی گرا دی۔ عدنان کو اب وہاں کوئی قابل ذکر کام نہیں ملتا۔ اور جب عدنان نے اپنی میوزک البم کے لیے ایک ویڈیو بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں کام کروانے کے لیے بالی ووڈ کی بالی حسیناؤں سے رابطے کیے تو سب ہی نے عدنان کو کورا جواب دے دیا۔ ”مجھ پر“ عدنان کو اپنی ویڈیو ایک بالکل غیر معروف

خبریں و گیسپی

تبصیر خٹاپ

اپنی جگہ بھاری

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شر کا رخ کرتا ہے۔ مگر جناب! ہمارے فنکاروں کی جب شامت آتی ہے تو وہ بھارت کا رخ کرتے ہیں۔ اب عدنان سمج ہی کو دیکھ لیجیے۔ عدنان سمج جب بھارت گئے تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عدنان اپنے اس ”مساوگت“ سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے وہیں مستقل پڑاؤ ڈال لیا۔ ایسا مستقل پڑاؤ کہ بعد میں وہ ہندو انتہا پسند تنظیموں کے ”مناظرین“ میں شامل ہو کر بھی بھارت سے نہ ٹلے۔ عدنان سمج کی جانب سے خلوص کے اس مظاہرے پر بھارتی سرکار نے بھی

سی بھارتی خاتون کامیڈین کے ساتھ تیار کرنا پڑی۔ ماضی میں عدنان سمج اپنی ویڈیوز معروف بھارتی فنکاروں کے ساتھ بناتے رہے ہیں۔ لہذا اپنی ویڈیو دیکھنے والوں کو عدنان صرف جسمانی وزن کے لحاظ سے ہی نہیں۔ بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی خاصے ہلکے دکھائی دیے ہیں۔

(عدنان جی! آپ نے تو بس اپنا جسمانی وزن کم کرنے ہی کی ٹھانی تھی۔ مگر یہ کیا۔ آپ تو اپنی عزت و اہمیت کا وزن بھی کم کر بیٹھے۔ آپ کو معلوم نہیں تھا کیا کہ پتھر ہمیشہ اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے۔ اور ہمارے خیال میں فنکار اپنے ملک میں۔)

ملاقات برائے فروخت

”ملاقات“ کا لفظ اپنے اندر اس وقت بے پناہ کشش رکھتا ہے جب یہ ملاقات کسی من پسند شخصیت سے ہو رہی ہو اور مردوں کے لیے تو کسی نازک اندام حسینہ سے ملاقات کا تصور اتنا خوش کن ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں کسی سے ملنا شاید بے حد دشوار ہوتا ہوگا، جب ہی تو لوگ باگ کسی خاص سے ملنے کے لیے خاصے جتن کیا کرتے تھے اور تقریباً ہر ملاقات ڈھونڈا کرتے تھے۔ مگر جناب! یہ سب ماضی کی فکریں تھیں۔ آج کا دور تو ایسا ہے کہ اب تو سب کچھ یکٹا ہے۔ یہاں تک کہ ملاقات بھی۔

عام زندگی میں لوگوں کا لہو چومنے اور پینے والے معاشرے میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر یہ اسکرین پر انسانی لہو پیٹنے والے لوگوں کی کمائیاں اس قدر پسند کی جاتی ہیں کہ ان فلموں میں کام کرنے والے لوگ مقبولیت کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ ”ٹوائی لائٹ“ سیریز میں کام کرنے والی نازک اندام حسینہ کرشن اسٹیوارٹ لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہیں۔ مگر کرشن ایک عرب شہزادے کو تو اس قدر بھائی کہ انہوں نے کرشن سے ملاقات کی خواہش دل میں پال لی۔ اور چونکہ وہ شہزادے ہیں۔ لہذا انہوں نے کرشن سے ملاقات ”خریدی“ کرشن آئیں۔ ان سے ملیں اور پندرہ منٹ بعد چلی گئیں کہ عرب شہزادے نے ان کی زندگی کے محض پندرہ منٹ ہی خریدے تھے۔ وہ عرب شہزادے کرشن کے جانے کے بعد آپس بھر بھر گاتے رہے ہوں گے کہ۔

نہ کچھ دیر ٹھہرے نہ کچھ بات کی بڑی آواز کتنی ملاقات کی مگر کرشن پر شہزادے کی آہوں کا بھلا کیا اثر ہوتا تھا کہ انہوں نے شہزادے سے ملنے کا فیصلہ کون سا شہزادے کی بے پناہ خواہش سے متاثر ہو کر کیا تھا۔



کرشن نے اس مختصر ملاقات کے پانچ لاکھ ڈالر وصول کیے تھے۔ کرشن نے یہ رقم امریکا میں آنے والے سمندری طوفان ”میسڈی“ سے متاثر ہونے والے لوگوں کی امداد کے طور پر طلب کی تھی۔ (شکایت ہے ان عرب شہزادے پر کہ ان کی آنکھیاں ٹھہریں بھی تو ایک مغربی حسینہ پر۔ شہزادے! حسن تو فانی چیز ہے۔ ہمارے ملک میں بھی فین اور قابل قدر لوگوں کی کمی نہیں۔ ایسے بھی کہ جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے۔ ہاں! شاید ان میں حسن اور وہ ادا میں نہ ہوں۔ ہمارے ہاں بھی حالیہ زلزلے کے بعد بلوچستان میں خاصے تباہ حال افراد امداد کے منتظر ہیں۔ آپ نے بالواسطہ طور پر ہی سہی اپنا پیسہ غیر مسلموں کی فلاح و بہبود کے لیے دے دیا تو پھر یہ تو آپ کے مسلمان بھائی بھی ہیں نہ۔)

پھٹی ہوئی جینز

موسیقی کی بنیاد سات سُرور پر عبارت ہے۔



شاعری نما چند لائیں میوزک کے ساتھ بول رہا تھا۔ وہ گلوکار فخر عالم تھے۔ جنہوں نے اس پروگرام کے ذریعے پاکستان میں ریپ موسیقی متعارف کروائی۔ فخر عالم پروگرام کی کمپیسرنگ بھی کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے ان کی گلوکاری کو تو زیادہ قبول نہیں کیا۔ مگر ان کی کمپیسرنگ مقبول ہو گئی۔ چنانچہ فخر عالم کمپیسرنگ کرنے لگے۔ کمپیسرنگ سے تھوڑا اکٹائے تو اداکاری کی طرف چلے گئے۔ وہاں بھی مقبولیت کی سند مل گئی۔ جلد ہی فلم والوں نے ان کو لیا۔ فخر عالم کی طبیعت میں بھی نت نئے تجربات کرنے کا شوق تھا۔ لہذا فلم بھی کروائی۔

”ویری گڈ وینا“ ویری ہیڈ لوگ
فخر عالم کو فلمی دنیا تو ”ویری گڈ“ ہی لگی۔ مگر لوگ شاید ”ویری ہیڈ“ لگے۔ لہذا انہوں نے صرف ایک ہی فلم کر کے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ تاہم ٹی وی پر کمپیسرنگ کرتے رہے۔ کچھ عرصے سے فخر عالم تقریباً ”گوشت گمنا“ ہی میں تھے کہ اچانک خبر آئی کہ انہیں فلم سنسور بورڈ سندھ کا چیئر پرسن بنادیا گیا۔ (ظاہر ہے انہیں فلموں کا تجربہ بھی تو اتنا ہے۔ ”ویری ایک فلم“ ہی ہوئی ہے انہوں نے۔ فخر عالم کونت نئے تجربات کرنے کا خاصا شوق ہے۔ چلیں دیکھتے ہیں ”موسیقی میں پہلے پہل ریپ کرنے اور پھٹی ہوئی جینز پہننے والے فخر عالم اب سنسور شپ میں پھٹی ہوئی جینز پہنتے ہیں یا۔۔۔ کچھ تو گئے ہوں گے نا آپ۔)

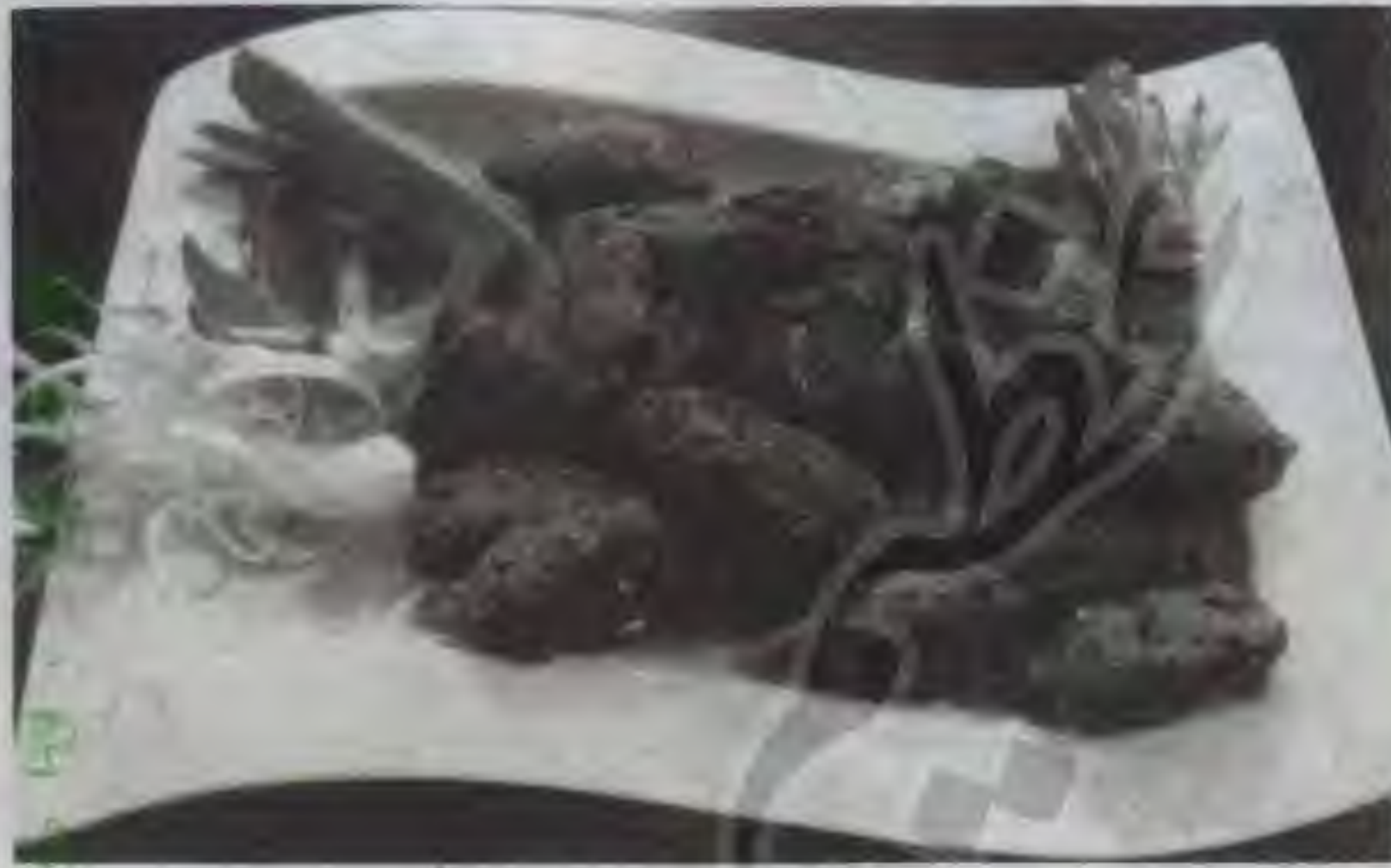
کچھ ادھر ادھر سے

☆ عوام الناس کا سنجیدہ طبقہ ٹاک شو سے بھی بے زار ہو رہا ہے۔ خبریں ایسے گھناؤنے جرائم کی نشیروں تک محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ جن سے معاشرے کو گھن آتی ہے۔ بریکنگ نیوز کمر کاؤ ہلکنا چوری ہونے کی سطح تک آگئی ہے۔ شاید اس دھما چوکڑی میں الیکٹرونک میڈیا کو انداز نہ ہو کہ وہ بے اعتبار ہوتا جا رہا ہے۔ بے اعتباری اور بے وقاری میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)

ساتوں سروں کی ترتیب میں ردوبدل کرنے سے لے اور دھنیں تخلیق پاتی ہیں۔ دنیائے موسیقی میں ہمیشہ سے نت نئے تجربات کیے جاتے رہے ہیں۔ یوں موسیقی کا خاندان بڑھا اور کلاسیکی و نیم کلاسیکی موسیقی کے بعد پاپ موسیقی نے جنم لیا۔ مگر چونکہ یہ جنم مغرب میں ہوا تھا۔ لہذا اہل مشرق اسے پاپ (گناہ) ہی سمجھتے رہے۔ لیکن کافی آگے جا کر مشرق نے بھی اسے قبول کر ہی لیا۔ مغرب کی فطرت میں جولانی بہت ہے۔ چنانچہ ان کے ”پاپ“ کو اہل مشرق کے قبول کرتے ہی انہوں نے جھٹ ایک نئی موسیقی متعارف کروائی اور اسے ریپ کا نام دے دیا۔

یہ موسیقی کیا تھی۔ بس اسے چند لائیں جلدی جلدی بولنا ہی سمجھے۔ نوے کی دہائی میں ہمارے ملک میں ٹی وی پر نوجوانوں کے لیے جدید موسیقی کا ایک پروگرام شروع ہوا۔ اس پروگرام میں ایک نوجوان گلوکار نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچی جو گھنٹوں پر سے پھٹی ہوئی جینز پہنے، آنکھوں پر سن گلاسز چھائے



موسیقی کے پیکوان

خالد بیگلائی

ترکیب :

قیے کو اچھی طرح دھو کر اس کا پانی خشک کر لیں۔ انار دانہ، دھنیا، زیرہ، ثابت سرخ، مرچ اور بیسن کو توڑے پر ہلکا سا بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں۔ ایک چائے کے چمچے تیل میں چوپ کی ہوئی پیاز، ہری مرچ اور بیسن اور گ پیسٹ ڈال کر فرمائی کریں۔ دونوں آمیزے نمک اور گرم مسالے کے ساتھ قیے میں اچھی طرح ملا کر رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد تھوڑا سا آمیزہ ہاتھ میں لے کر مٹھی کی شکل میں کباب بنائیں اور گمرے تیل میں تلیں۔

مٹن زعفرانی پلاؤ

اجزا :
گوشت
ایک کلو

مٹھیا کباب

اجزا :
قیمہ
اور گ بسن پیسٹ
پیاز
ہری مرچ
انار دانہ
ثابت زیرہ
ثابت دھنیا
ثابت سرخ مرچ
بیسن
ساگر م مسالا
نمک
تیل

ایک کلو
ایک کھانے کا چمچ
ایک عدد
پانچ عدد
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
آٹھ عدد
ایک کھانے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

انڈر کٹ ہف کی تقریباً دو انچ کی بوٹیاں بنوالیں۔
دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ وہی میں کچری پاؤڈر یا
کچا پیتا پس کر ملا دیں۔ ساتھ ہی سرخ مرچ کباب
چٹنی (پس کر) لہسن اور ک پیسٹ نمک اور دو کھانے
کے چمچے تیل ملا کر رکھ دیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کوٹلوں پر
سینک لیں۔ سینکے ہوئے برش یا گھڑے کی مدد سے بولی
کے اوپر تھوڑا تھوڑا تیل لگائی جائیں۔ ایک بڑے
برتن میں ڈھک کر کوئلے کا دم دیں۔ چھ وار پیاز اور
الی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

مسالے دار اسٹیم گوشت

ایک کلو
ایک بڑا ٹکڑا
پانچ جوے
چار چار عدد
ڈیڑھ کھانے کا چمچ
ایک چوتھائی چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

چاول
اورک
لہسن
چھوٹی بڑی الائچی
ثابت گرم مسالا
جائفل جاوتری
زعفران
نمک
تیل
ترکیب :

اجزا :

ایک کلو
ایک کھانے کا چمچ
دو چائے کا چمچ
ایک کھانے کا چمچ
تین کھانے کے چمچے
دو چائے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
پانچ کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
آدھی ٹمھی
پانچ عدد
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

گوشت
کچری پاؤڈر
اورک لہسن پیسٹ
سرکہ
لیموں کا رس
سرخ مرچ
پسا گرم مسالا
براؤن پیاز
سفید زیرہ
ہرا دھنیا
ہری مرچ
نمک
تیل

گوشت میں بڑی الائچی کے ساتھ سارا ثابت گرم
مسالا، لہسن اورک نمک اور پانی ڈال کر چھ دیں۔
گوشت گل جائے تو بخنی الگ کر لیں۔ ایک کپ نکال
کر باقی بخنی میں تھوڑا سا نمک ملا کر ایک کپ چاول ابل
لیں۔ اس طرح کہ چاول بخنی میں گل کر خشک ہو
جائیں۔ الگ پٹیلی میں تیل گرم کر کے چھوٹی الائچی
کڑکڑا میں اور گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ بخنی ہوتی
بخنی ڈال کر بھونتے ہوئے تھوڑا سا خشک کر لیں۔
چاول ڈال دیں۔ چاول کے اوپر ایک کھانے کے چمچے
دودھ میں زعفران گھول کر ڈال دیں۔ جائفل جاوتری
چھڑک دیں اور دم پر لگا دیں۔

باربی کیوبوٹی

اجزا :

ایک کلو
دو کھانے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچے
آدھا کپ
آٹھ دانے
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

گوشت
اورک لہسن پیسٹ
کچری پاؤڈر
سرخ مرچ
وہی
کباب چٹنی
نمک
تیل

گوشت میں تمام مسالے پس کر مکس کریں اور رکھ
دیں۔ دو گھنٹے بعد ایک مٹی کی ہانڈی میں یہ آمیزہ اور
تیل ڈال دیں۔ ڈھکن ڈھک کر کناروں کو گوندھے
ہوئے آٹے سے بند کر دیں۔ تو اگر گرم کر کے ہانڈی رکھ
دیں۔ ہلکی آنچ پر پکے دیں۔ بیس سے پچیس منٹ بعد
کھول کر دیکھیں۔ پانی خشک ہو جائے تو تو اٹھا دیں اور
ہانڈی چولہے پر رکھ کر بھونیں۔ گوشت روغن
چھوڑنے لگے تو اتار لیں۔ ہری مرچ اور ہرے دھنیے
سے سجاوٹ کریں اور چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

حسن تعلیمی اور تعلیمی

کیا آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں؟
سوال یہ ہے کہ آپ کیوں فکر مند رہتے ہیں؟
شاید آپ کا جواب ہو کہ آپ کی پریشانیاں اور ذاتی مسائل کچھ ایسے ہیں جن کی وجہ سے آپ کبھی ان فکروں سے گلو خلاصی ہی نہیں پاسکتے۔
آپ کا یہ جواب نفسیاتی نقطہ نظر سے غلط ہے۔ آپ کی پریشانیاں اور ذاتی مسائل سے دراصل آپ کی فکروں کا بہت کم تعلق ہے۔ درحقیقت اس کا تعلق آپ کے مسائل اور پریشانیاں سے نہیں بلکہ آپ کی عادت سے ہے اگر آپ کے تمام مسائل حل ہو جائیں تو آپ اپنی فکروں کے لیے کوئی اور جواز تلاش کر لیں گے۔
پریشانیاں اور مسائل کی فہرست کبھی ختم نہیں ہو سکتی جو شخص فکر و تشویش کو اپنی عادت بنا لیتا ہے وہ ہمیشہ فکر مند رہا کرتا ہے اسے عموماً اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کے لاشعور میں کوئی ایسا خوف اور اندیشہ چھپا رہتا ہے جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔

فکر و تشویش کی بنا پر ہمارے اندر جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں اس سے ہمارا دماغ اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت سی جسمانی بیماریوں مثلاً "دمہ"، "بلڈ پریشر"، "قلبی امراض"، "گزیمیا" اور "زیائیتس" کا اصل سبب یہی فکر و تشویش ہے۔
اگر آپ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ہمیشہ کسی نہ کسی فکر و تشویش میں مبتلا رہتے ہیں تو آپ اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے اپنے مسائل اور پریشانیاں کا تجزیہ کریں پھر اپنے اندر یہ اعتماد اور یقین پیدا کریں کہ آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ آپ ان پر قابو پاسکتے ہیں بے کار باتیں سوچنا چھوڑ دیں اور ان سوچوں سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھیں اور بطور مشغلہ کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔

ایک بیخ و بخت نمازی ان بے کار سوچوں میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ روزانہ صبح بیدار ہوتے ہی بس چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اپنی تمام پریشانیاں اس کے سپرد کر کے بے فکر ہو جائیں۔

د- ف- لاہور

س : میری دوست کو اپنے گھر میں بے جا پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے والدین حیات نہیں اور سب بہن بھائی شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی اپنے شادی شدہ بھائی کے ساتھ رہتی ہے اس کو فون، انٹرنیٹ وغیرہ کی پابندی ہے دوستوں کے گھر جانے پر پابندی ہے حتیٰ کہ اپنی سگی بہنوں کے گھر بھی اکیلے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گھر گھر اور گھر کے کام بس اس کی ذمہ داری ہے۔ گھر میں رہ رہ کر اس کی شخصیت بدلتی جا رہی ہے۔ انٹر کیا ہوا ہے آگے

پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

سارا دن کام کاج سے فراغت کے بعد وہ چھتے چھپاتے بھائی کے لیپ ٹاپ پر سحرورہ میں مقیم اپنے دوست سے بات کرتی ہے وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ بھی اس کو پسند کرتی ہے۔ وہ تنہائی سے بچنے کو ایسا کرتی ہے ویسے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب انسان کو بے جا پابندیوں کا سامنا ہو اس کے بہترین کردار کے باوجود اس پر اعتبار نہ کیا جاتا ہو اور اس کی تنہائی کا بھی کوئی حل نہ ہو تو ایسے میں ایک شوخ طبیعت بندی کو کیا کرنا چاہیے۔

اچھی بہن! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ آپ کی دوست پر اعتبار نہیں کیا جاتا ہو سکتا ہے کہ موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے آپ کی دوست پر اس کے بھائیوں نے پابندیاں لگائی ہوں۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے آپ کی دوست تنہائی کا شکار ہے اس لیے اس نے یہ حل نکالا کہ نیٹ پر ایک لڑکے سے دوستی کر لی۔ تصور کریں کہ یہ بات اس کے بھائیوں کو پتا چلی تو نتائج کیا نکلیں گے؟ کیا وہ اس پر مزید پابندیاں نہیں لگائیں گے؟ گھر بیٹھنے والی شوخ طبیعت لڑکی کے لیے صرف ایک ہی مشغلہ نہیں ہے کہ وہ لڑکوں سے دوستی کرے اور بھی بہت سے مشغلے اختیار کیے جاسکتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی بہنوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جاسکتا ہے۔ کتابوں میں دل لگایا جاسکتا ہے۔ پاس پڑوس کے بچوں کو ٹیوشن دی جاسکتی ہے۔

بے شمار لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں کیا وہ سب لڑکوں سے دوستی کر کے وقت گزار رہی ہیں؟ اپنی دوست کو سمجھائیں۔ کہ وہ ان پٹروں میں پڑ کر اپنا وقت برباد نہ کرے۔

آپ کی دوست کی عمر صرف بیس سال ہے۔ ایک آدھ سال میں اس کی شادی ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائے اپنی اور ان کی عزت کا خیال رکھے۔

ر- کراچی

س : میرا ذہن کہیں فوکس نہیں ہوتا۔ حالانکہ کوئی ٹینشن کچھ نہیں ہے مصروف بھی رہتی ہوں ۴ اچھی کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ قوت ارادی بھی بہت کمزور ہے کچھ بتائیں کیا کروں؟

مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ اتنی اچھی کتابیں پڑھی ہیں میں نے مگر افسوس ان میں سے بہت ہی کم باتیں یاد ہیں شاید۔ کسی سے اگر گفتگو یا بحث ہو رہی ہو تو اکثر جملے الفاظ اس کے بھی اور اپنے بھی بھول جاتی ہوں میرے الفاظ بھی صحیح ادا نہیں ہو پاتے مثلاً "جملے بولتے بولتے آخر میں الفاظ گنڈل ہو جاتے ہیں

اچھی بہن! توجہ مرکوز نہ ہونے کا سبب یہ ہے۔ بیک وقت آپ کے ذہن میں بہت سے خیالات کا جھوم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی بات یا جملہ ذہن میں اپنی جگہ بنا نہیں پاتا۔ مطالعہ کرنے کا شوق ہے۔ بہت اچھی بات ہے لیکن جب مطالعہ کریں تو یہ سوچ کر نہ کریں کہ آپ کو اسے یاد رکھنا ہے بلکہ خوش گوار اثر کے ساتھ مطالعہ کریں جو کچھ پڑھیں اس کے جملے یاد رکھنے کے بجائے اس کے مفہوم کو سمجھیں جب آپ کو مفہوم یاد ہوگا تو اسے اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں گی۔

گفتگو یا بحث ہو رہی ہو تو اس میں حصہ لینے کی شعوری کوشش نہ کریں۔ اس سے آپ کے ذہن پر دباؤ پڑتا ہے اور الفاظ صحیح طرح ادا نہیں ہو پاتے بہتر یہ ہے کہ خاموشی سے سنیں پھر مختصر الفاظ پر مبنی جملے بولیں جو صحیح طرح ادا ہو سکیں۔ ذہانت علیحدہ چیز ہے اور حافظہ مختلف چیز ہے اگر آپ کو دوسروں کی لکھی باتیں یاد نہیں رہتیں تو اپنے طور پر اپنے ذہن کے مطابق بات کریں۔ آپ کی تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اچھی خاصی ذہن لڑکی ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستان یونہی لکھ ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی غذا پر توجہ دیں۔ آج کل سیب کا موسم ہے روزانہ ایک سیب ضرور کھائیں۔ سیب چھیل کر نہیں چھلکوں سمیت کھائیں۔ گاجر جلد بالوں اور نظر کے لیے انتہائی مفید ہے۔ کچی گاجر کھائیں۔ آئرن کی کمی کی وجہ سے بھی بال جھڑنے لگتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن ٹیبلٹ استعمال کریں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بالوں کے گرنے کی اہم وجہ خشکی بھی ہے۔ اگر آپ کے سر میں خشکی ہے تو اس کے لیے ایک بہت آسان نسخہ ہے۔ سر پر ایلوور کا گودا لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد سردھولیں خشکی ختم ہو جائے گی۔

سر پر تیل اس طرح لگائیں کہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے۔ پہلے سر پر تیل کا مساج کریں پھر تیز گرم پانی میں تولیہ بھگو کر چوڑیں اور اسے اچھی طرح سر پر لپیٹ لیں۔ جب تولیہ ٹھنڈا ہو جائے تو اتار لیں۔ اس کے بعد نیم گرم پانی سے سردھولیں۔

بادام کا ناریل کا یا زیتون کا جو بھی آپ کے بالوں کو موافق ہو وہ تیل استعمال کریں

روزانہ شیمپو نہ کریں۔ ہفتہ میں ایک یا دو بار شیمپو کریں۔ شیمپو کا زیادہ استعمال بھی بالوں میں موجود قدرتی تیل اور نمی کو ختم کر دیتا ہے جس سے بال روکھے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

بال شیمپو کرنے سے پہلے دو چھپو وہی میں ایک چھپو سرسوں کا تیل ملا لیں۔ اسے بالوں میں لگائیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر بال شیمپو کر لیں۔

عائشہ ثناء... چکوال

س۔ میری عمر جو بیس سال ہے، میرا مسئلہ یہ ہے کہ نسوانی حسن کی کمی ہے اس کے ساتھ برسٹ سائز میں بھی فرق ہے۔ جو سخت شرمندگی کا باعث بنتی ہے۔ میری شادی ہونے والی ہے برائے مہربانی میری مدد فرمائیں۔

ج۔ عائشہ! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ شادی کے بعد آپ کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔



امت الصبور

بیونگی مکیس

ارم احمد... لاہور

س۔ میرے بال شروع سے ہی لمبے گھنے اور نرم و ملائم تھے۔ جھڑتے بھی نہیں تھے۔ میری والدہ شروع سے ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ تارا میرا کا تیل ناریل کا تیل اور بادام کا تیل ہمیشہ سے بدل بدل کر یا مکس کر کے میرے بالوں میں لگاتی آئی ہیں۔ ابھی بھی بال اسی طرح لمبے ہیں اور چمکدار بھی مگر اب بال گرنا شروع ہوئے تو رکنے کا نام نہیں لے رہے۔ اس قدر گر گئے کہ سر نظر آنے لگ گیا ہے۔ جس پارلر سے میں بال کٹواتی ہوں انہوں نے مجھے بے بی شیمپو اور زیتون کے تیل کا مشورہ دیا۔ وہ بھی مسلسل کر کے دیکھ لیا ہے مگر کچھ فرق نہ پڑا۔

ج۔ ارم! آپ کا مسئلہ بیونگی نہیں اندرونی ہے۔ آپ